ہمیں جینے دو

(افسانوں کا مجموعہ)

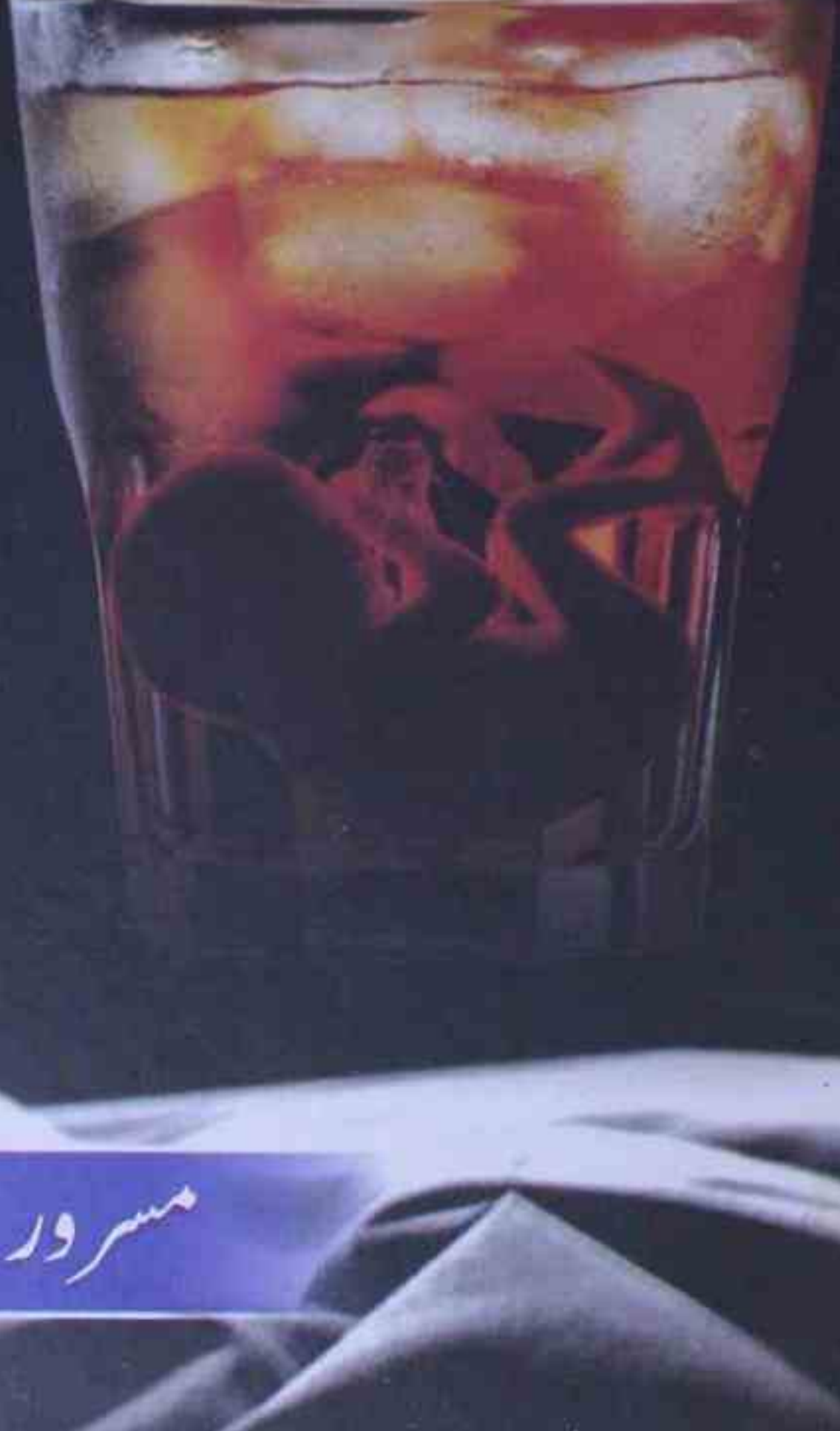

مسرور جہاں

ہمیں جینے دو

(افسانوں کا مجموعہ)

HaSnain Sialvi

مسرور جہاں

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

© جملہ حقوق بحقِ مصنفہ محفوظ

HUME JEENE DO

(Short Stories)

by

Masroor Jahan

Year of Edition 2016
ISBN 978-93-5073-724-8

₹ 300/-

نام کتاب : ہمیں جینے دو (افسانوں کا مجموعہ)
مصنفہ : مسرور جہاں
پتہ : 195/95 کراؤن گیٹ، جگت نرائن روڈ، لکھنؤ-3 (یوپی)
صفحات : ۲۵۲
سنِ اشاعت : ۲۰۱۶ء
قیمت : ۳۰۰ روپے
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی-۶

ملنے کے پتے

☆ امرین بک ایجنسی، 87 بلاک-7 میونسپل کوارٹرس، کانچ کی مسجد کے پاس، جمال پور، احمد آباد-380022
☆ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسیس بلڈنگ، ای-آر-روڈ، ممبئی- 400003 فون نمبر: 022-23774857
☆ ھدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، 22-7-454/455، مسجد ایک خانہ کے سامنے، پرانی حویلی، حیدرآباد-2
☆ حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد (فون نمبر: 040-66806285)
☆ انجمن ترقی اُردو، اردو ہال، حمایت نگر، حیدرآباد ☆ راعی بک ڈپو، 734، پرانا کٹرہ، الٰہ آباد (یوپی)
☆ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-4 ☆ عثمانیہ بک ڈپو، 125 رابندر اسرانی، کلکتہ-700073
☆ دانش محل، امین الدین پارک، لکھنؤ-226018 (یوپی)

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

انتساب

اپنی زندگی کے اوراقِ پارینہ

کے نام

HaSnain Sialvi

فہرست

مسرور جہاں کے افسانے	وقار ناصری	07
ایک شجر ایسا—		23
اَن دیکھا ہاتھ		32
”گیا وقت نہیں—“		38
درد سے دوستی		43
جذبوں کی رہگذر		50
لیلیٰ مجنوں		60
تلاش		68
وراثت		78
حق بہ حق دار—		88
سُکھ سنسار		95
کھوٹا سکّہ		104
پچھلا دروازہ		115
فرصت کے رات دن		125
مول انمول		132
بُرا آدمی		141

HaSnain Sialvi

○ موری کی اینٹ	148
○ پچھتر برس کی ایک لڑکی	160
○ بند گلی کا آخری مکان	174
○ مَصلوب	184
○ ایک آگ کا دریا ہے۔۔۔۔	197
○ سوئیٹ ہوم	205
○ تلاشِ بہاراں	215
○ شناسائی	220
○ ہمیں جینے دو	225
○ فرشتہ	231
○ قَدآور بونے	240
○ بچ	247

☆☆

HaSnain Sialvi

وقار ناصری

مسرور جہاں کے افسانے

ایک ادبی صنف کی حیثیت سے اردو افسانہ مختلف نظریوں اور رجحانات کا حامل رہا ہے۔ عینیت، رومانیت، حقیقت پسندی، جنس اور نفسیاتی میلانات کے بہت سے تجربے اس کا موضوع رہے ہیں۔ پریم چند کی روایت سے علامت اور استعارے تک اردو افسانے نے جو بھی پیرہن اختیار کیا ہو مگر اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ادب زندگی سے منقطع نہیں ہوتا۔ سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ، اسلوب، کردار نگاری اور بیانیہ میں تبدیلی کے باوجود ہر افسانہ زندگی کی روداد ہے۔ ماقبل تاریخ سے تاریخ کے اس عہد انتشار تک زندگی کا یہ افسانہ بار بار دہرایا جاتا رہا ہے۔ کبھی اسے داستانوں اور قصوں کے حوالے سے جانا گیا اور کبھی انگارے کے نام سے اس نے شہرت پائی۔ لیکن ان افسانوں کے لکھنے والے زیادہ تر مرد تھے۔ اور اس پدرسری سماج سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں ان کی بالادستی اور حاکمیت مستحکم تھی۔ لہٰذا ان میں اس عورت کے تجربے اور احساسات بہت کم دکھائی دیتے ہیں جو مادرسری نظام میں، خاندان، کی سربراہی کرتی تھی۔ 'انگارے' کی اشاعت اور ترقی پسند تحریک کے ساتھ اس افسانے کا ظہور ہوا جہاں عورت تانیثی شعور کے ساتھ نمایاں ہوئی۔ عورت کی ذہنی پسماندگی، شکست خوردگی اور بے بسی کے تجربوں کو خواتین افسانہ نگاروں نے اپنے طریقے سے سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ رشید جہاں، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور۔ خدیجہ مستور رضیہ سجاد ظہیر، سرلا دیوی، جمیلہ ہاشمی، صالحہ عابد حسین، بانو قدسیہ، زاہدہ

حنا سے لے کر جیلانی بانو تک خاتون افسانہ نگاروں کا ایک سلسلہ ہے جس نے اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ اس عورت کا احساس دلایا جو معاشرے میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی صورت موجود ہے۔ خاتون افسانہ نگاروں کی فہرست میں مسرور جہاں کا نام بھی شامل ہے۔ مسرور جہاں نے ترقی پسند تحریک کا دور بھی دیکھا اور وہ زمانہ بھی جب جدیدیت مابعد جدیدیت اور دوسرے رجحانات سے ادب کے تعین کا عمل زور و شور سے جاری ہوا۔ مگر مسرور جہاں نے خود کو کسی تحریک یا رجحان سے وابستہ نہیں کیا۔ وہ اپنے طور پر وہی لکھتی رہیں جو ان کے فن کی اساس ہے۔ ان کے افسانوں میں گم شدہ تہذیبی رشتوں سے لے کر عہدِ حاضر کے مسائل تک ایسے بہت سے موضوعات ہیں جو اس معاشرے میں موجود ہیں۔ بیانیہ کی کسی پیچیدگی کے بغیر وہ اپنے افسانوں میں زندگی کے وہ رنگ بھرتی رہیں جن سے ان کے افسانے تخلیقی فکر، افسانویت، حقیقت اور وحدتِ تاثر کا نمونہ بن جاتے ہیں۔ انہوں نے عہدِ زوال کی کہانیاں بھی لکھی ہیں اور اس سماج کی بھی جو تقسیم اور اس کے بعد کی صورت حال کا زائیدہ ہے۔

مسرور جہاں نے اپنے افسانوں میں عورت اور اس کے مسائل کو اہمیت دی ہے۔ ان سے پہلے بھی یہ موضوعات اردو افسانے میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ لیکن انہوں نے ان ان موضوعات کو پیش کرنے میں وہ رویہ اختیار نہیں کیا جو بعض خاتون افسانہ نگاروں سے مخصوص ہے۔ اور نہ ہی وہ بیبا کی اختیار کی جو حقیقت نگاری کے جوش میں تہذیبی قدروں کو پامال کر دے۔ ان کے موضوعات میں چاہے متوسط یا نچلے طبقے کی عورت ہو۔ یا اونچے اونچے محلوں میں پلنے والی انجمن آرائیں، یا نئے سماج کی تعلیم یافتہ عورت۔ انہوں نے ان معاملات و مسائل، جنس و نفسیاتی الجھنوں اور دوسرے رویّوں کی پیش کش میں ایک محتاط انداز ہمیشہ قائم رکھا ہے۔ ان کے افسانوں میں اس حقیقت کا بھی احساس نمایاں ہے کہ جب جاگیرداری اور زمینداری کے زوال کے بعد شمالی ہند کے مسلم گھرانوں کی زندگی اقتصادی اور اخلاقی زوال کی بنا پر بکھرتی چلی گئی۔ اس معاشرے میں سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت عورت کی ہے جو مرد کی جھوٹی آن بان کی 'قربان گاہ' ہے۔ انہوں نے

چھوٹے چھوٹے واقعات اور کرداروں کے ذریعے انہیں عنوان بنا کر اپنے افسانوں کی تشکیل کی ہے جو کسی نہ کسی موضوع کو حقیقت اور اشاریت میں ڈھال دیتے ہیں۔

یوں تو ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں سے لے کر الطاف حسین حالی کی مجالس النساء اور اس کے بعد تک نسائی مسائل کا ایک سلسلہ ہے مگر ان میں زیادہ تر تعلیمِ نسواں — عقدِ بیوگان، رسوم و روایات وغیرہ کی اصلاح کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ ان میں عورت کے خود اپنے باطن میں جھانکنے کا سراغ نہیں ملتا۔ ترقی پسند تحریک کے بعد یہ منظر نامہ بدلا اور پہلی بار وہ عورت دکھائی دی جس کے خود اپنے بھی فیصلے ہیں۔ اس نے چار دیواری کے باہر کی اس دنیا کو بھی دیکھنے اور اپنی طرح سے سمجھنے کی کوشش کی جس کو دیکھنے کی حسرت میں وہ کب سے تڑپ رہی تھی۔ خاتون افسانہ نگاروں نے اس عورت کی تلاش میں بہت سے روپ اختیار کئے۔ کچھ رومان کی پراسرار دنیا میں کھو گئیں۔ کچھ رومان اور حقیقت کے دوراہے پر رک گئیں۔ اور کچھ نے حقیقتوں کی دریافت میں دنیا جہان کی خاک چھان ڈالی۔

مسرور جہاں نے، یہ میرے خواب 'بوڑھا یوکلپٹس'، 'ہمسفر ہمسفر اکیلا ہے' جیسی رومانی کہانیاں بھی لکھی ہیں اور وہ افسانے بھی جن میں ایک مجبور عورت رشتوں کی صلیب پر ٹانگ دی جاتی ہے 'زمین' ایک ایسی ہی عورت کی کہانی ہے۔ جسے آسمان نے جھلسنے کے لئے وقت کی دھوپ میں اکیلا چھوڑ دیا۔

غریب مولوی نور الٰہی کی لڑکی راحت بی بی کی شادی شہر کے ایک اوباش رئیس سیٹھ داؤد سے اس لئے ہو جاتی ہے کہ کوئی شریف اور عزت دار خاندان سیٹھ داؤد سے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ سیٹھ داؤد مجبور ہو کر راحت بی بی سے شادی تو کر لیتے ہیں۔ مگر ان کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بیوی ہوتے ہوئے بھی وہ سیٹھ داؤد کے لئے کھانا پکانے والی ملازمہ سے زیادہ اور کچھ نہیں تھیں۔ بیٹے داراب کی پیدائش کے بعد بھی ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ جوان ہونے پر داراب کی شادی ایک اونچے گھرانے کی لڑکی بلقیس سے کر دی جاتی ہے۔ بہو نے بھی اپنی ساس کو ملازمہ ہی سمجھا۔ وہ اپنی سہیلیوں کے سامنے بھی انہیں گھر کی ملازمہ بتا کر فخر محسوس کرتی ہے۔ راحت بی بی شوہر کی بے التفاتی،

بیٹے کی بے رخی، بہو کے سلوک سے رنجیدہ ہوتے ہوئے بھی کوئی شکوہ نہیں کرسکیں۔ایک غریب مولوی کی لڑکی میں یہ جرأت کہاں تھی؟ بلقیس پانچ لڑکیوں اور ایک لڑکے کی ماں بن گئیں مگر راحت بی بی کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ لڑکیاں جوان ہوگئیں۔اور لڑکا شباب بڑا ہوگیا۔اب وہ سب کی ملازمہ تھیں۔ایک دن بڑی لڑکی شائستہ نے اپنی سہیلیوں کی دعوت کی۔راحت بی بی سارے دن چولہے میں لگی کھانا پکاتی رہیں۔ شام تک ان کی ہمت جواب دے گئی۔انہیں بخار تو ایک ہفتے سے آرہا تھا۔مگر دن بھر کی محنت نے ان کی حالت بدتر کردی۔وہ بستر پر بالکل غافل ہوگئیں۔شائستہ نے آواز دی ''بوا کھانا لگادو۔'' مگر راحت بی بی تو بالکل غافل پڑی تھیں۔کھانا کون لگاتا؟ ایسے میں شباب باہر سے آیا تو دادی کو اس طرح پڑے دیکھ کر ان کے پاس آیا۔جلدی سے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار کا اندازہ کیا۔پھر خوش ہوکر کہنے لگا۔''دادی اماں اٹھئے نا۔بخار تو اتر گیا''۔اس کو کیا معلوم تھا کہ راحت بی بی کا بدن کس لئے ٹھنڈا ہے۔اس نے ان کی گردن کو سہارا دے کر انہیں اٹھانا چاہا۔تو اسے احساس ہوا کہ دادی اماں مرچکی تھیں۔شائستہ جو راحت بی بی کے کھانا نہ لگانے پر غصے میں آگے بڑھی تھی کہ اچانک ٹھٹھک کر رہ گئی۔اور پھر چیخ اٹھی ''ممی۔ ممی۔راحت بوا مرگئیں۔'' بیٹے داراب کو خبر دی گئی۔وہ آئے اور کسی غم کا اظہار کئے بغیر راحت بی بی کا کمزور و ناتواں جسم منوں مٹی کے نیچے چھپادیا گیا۔

اس افسانے کا اختتامیہ! زمین آج زمین سے مل کر اس کا حصہ بن گئی'' اس المیے کی روداد ہے۔جو طبقاتی فرق کی تلخ حقیقت ہے۔راحت بی بی سیٹھ داؤد کی بیوی بننے کے باوجود اس طرح حقیر رہیں جس طرح وہ پہلے تھیں۔شادی نے انہیں سماجی رتبہ تو دیا مگر وہ رتبہ نہیں دیا جو ایک عورت کا حق ہے۔وہ صرف سیٹھ داؤد کے لئے ہی حقیر نہیں تھیں۔ بلکہ اپنے لڑکے اس کی بیوی اور ان کی اولادوں کے لئے بھی زندگی بھر ایک ملازمہ ہی رہیں۔ اس کے لئے ان کا شوہر ذمے دار تھا۔یا وہ خود۔یا وہ معاشرہ جس میں راحت بی بی جیسی عورتیں صدیوں سے تِل تِل کر جی رہی ہیں۔یہی وہ سوال ہے جو اس افسانے میں بار بار ابھرتا ہے۔راحت بی بی کو زمین، اور سیٹھ داؤد کو آسمان بتا کر مسرور جہاں نے اس سفاکی اور

طبقاتی فرق کو نمایاں کیا ہے جو پدرسری سماج میں صدیوں سے جاری وساری ہے۔

ان کے دوسرے افسانوں میں رتبے سے گری ہوئی عورت کے علاوہ عورت کے دوسرے روپ بھی موجود ہیں ''سچ کے سوا'' میں مسرور جہاں نے اس عورت کو موضوع بنایا ہے جو ظلم سہتے سہتے خود منصف بن کر ظلم کے خلاف فیصلہ کرنے کی جرأت رکھتی ہے۔ پونم ملہوترا ایک اسکول ماسٹر کی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ جس کی شادی ایک معمولی ٹھیکے دار راکیش ملہوترا سے ہو جاتی ہے۔ راکیش ٹھیکے حاصل کرنے کے لئے اپنی بیوی کو استعمال کرنے لگتا ہے۔ پونم ملہوترا نہ چاہتے ہوئے بھی دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس نے کئی بار خودکشی کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔ مگر بچّوں کی محبت نے اسے اس اقدام سے روکے رکھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے بچوں کا مستقبل وہ نہ ہو جو اس کا ہے اس کی لڑکی کاجل کے جوان ہونے پر اس کے شوہر نے یہ چاہا کہ کاجل اس کے ساتھ ان پارٹیوں میں شرکت کرے جہاں ٹھیکے اور دولت کے حصول میں آسانی ہو۔ پونم ملہوترا نے اسے سختی سے روکا۔ ایک دن جب وہ گھر پر نہیں تھی۔ تو راکیش کاجل کو لے کر محکمۂ تعمیرات کے ایک افسر کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ پونم ملہوترا کو جب گھر پہنچنے پر یہ معلوم ہوتا ہے تو وہ مسٹر دیال کی کوٹھی پر پہنچتی ہے۔ اور پستول کی ساری گولیاں اپنے شوہر راکیش کے سینے میں اتار دیتی ہے۔ وہ عدالت میں ساری حقیقت بیان کرتی ہے۔ اور اس بات پر زور دیتی ہے کہ اگر وہ راکیش کو قتل نہ کرتی تو ان سزاؤں کا سلسلہ اس کی بیٹی پر ختم نہ ہوتا۔ بلکہ یہ سلسلہ تو پھر خاندان کی ہر بیٹی تک چلتا رہتا۔

'کل کی سیتا آج کی سیتا'' اس عورت کا افسانہ ہے جو معاشرے میں اپنے وجود اور اپنے حقوق کے لئے کوشاں ہے۔ سیتا کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ایک عمر دراز کم پڑھے لکھے دکاندار سے کردی جاتی ہے۔ سہاگ رات اس کا شوہر اس کے پڑھے لکھے ہونے کا طعنہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تمہارا کام میری اور میرے گھر والوں کی سیوا کرنا ہے۔ اس میں کمی نہ ہو۔ سیتا کے لئے یہ دھمکی کسی عذاب سے کم نہیں تھی مگر پھر بھی وہ خاموش رہی۔ وہ بیک وقت گھر کی باورچن دھوبن اور مہری بن گئی۔ لڑکی ہونے پر وہ سسرال والوں کی نظروں سے گر جاتی ہے دوسری بار جب لڑکا ہوا تو سارا خاندان خوش ہو گیا لڑکی ریتو کے

جوان ہونے پر اس کے باپ نے اس کا رشتہ ایک مالدار گھرانے کے بدصورت اور معمولی پڑھے لکھے لڑکے سے کرنا چاہا تو سیتا راضی نہیں ہوئی اور اس نے سختی سے انکار کر دیا۔ ایک روز ریتو نے ماں کے ہاتھ میں چپ چاپ ایک تصویر تھما دی۔ سیتا نے بیٹی سے لڑکے کے بارے میں پوچھا تو اس نے لڑکے اور اس کے گھر والوں کی ساری سچائی بیان کر دی۔ یہ متوسط طبقے کے لوگ تھے۔ لڑکے نے اسی کے ساتھ ایم بی اے کیا تھا۔ سیتا بیٹی کو بھروسہ دلاتی ہے کہ اس کی شادی، وہیں ہوگی جہاں وہ چاہے گی۔ سیتا کے شوہر کو جب یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ تو وہ بہت ناراض ہوتا ہے کہ اس کی لڑکی کسی کنگال کے گھر نہیں جائے گی۔ لیکن سیتا اس بات پر اڑ جاتی ہے کہ لڑکی بالغ ہے۔ دھرم، قانون اس کی پوری اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنی پسند کا جیون ساتھی چُن لے۔ وہ اپنے شوہر سے یہ بھی کہتی ہے کہ میں نے ریتو کو اس لئے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی کہ وہ میری طرح بزدل نہ نکلے اور اپنے جیون کا فیصلہ خود کر سکے۔ میری طرح نہیں کہ ماں باپ نے جہاں جھونک دیا اسے نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔ آخر تھک ہار کر سیتا کے شوہر کو اس کی بات ماننا پڑی۔ اس طرح اس نے اپنی لڑکے کی شادی بھی اس کی مرضی لے کر بغیر دان جہیز کے ایک سوشیل لڑکی سے کر دی۔ اس طرح یہ افسانہ موجودہ معاشرے کی اس عورت کا احساس کراتا ہے۔ جو اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنا جانتی ہے۔

'کتنے جج' کفارہ جیسے دوسرے افسانوں میں عورت کے کئی روپ ملتے ہیں۔ کہیں وہ محبت اور خلوص کا نمونہ ہے۔ کہیں دوسروں کی زندگی میں پریشانیاں پیدا کرنا ہی اس کا دستور ہے معاشرے میں اس طرح کے پیکر وقت وقت پر نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ ایک طرف کتنے جج، کی رحیمن بُوا ہیں جو دوسروں کے گھر میں کام کاج کر کے پیسے اکٹھا کیا کرتی ہیں تا کہ 'جج' کو جا سکیں۔ مگر جب کسی ایسی لڑکی کی شادی نہیں ہوتی جس کے غریب ماں باپ شادی کا انتظام نہیں کر سکتے تو وہ اپنا سارا پیسہ مالکن سے لے کر اس غریب کے حوالے کر دیتی ہے۔ جس کی لڑکی کا بیاہ ہونا تھا۔ دوسری طرف 'کفارہ' میں ایک ایسی عورت ہے جو صرف اس لئے رحمان پر ظلم کرتی رہتی ہے کہ وہ اس کے شوہر کا ناجائز لڑکا ہے رحمان ہر ظلم

برداشت کرنے کے باوجود اس عورت سے کوئی شکوہ نہیں کرتا۔ نہ ہی اس کی زیادتیوں کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ بلکہ اس کی بیماری میں وہ سب سے زیادہ پریشان ہوتا ہے۔ بیماری میں اس عورت کو رحمان کے ساتھ کی گئی زیادتیوں اور اپنے ظلم کا احساس ہوتا ہے۔ وہ مرتے وقت اپنے بیٹے جعفر سے کہتی ہے کہ قانو نا رحمان کا ہماری جائداد میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ مگر وہ بھی تمہارے باپ کی اولاد ہے۔ اس طرح مرتے وقت اس نے اپنی تمام زیادتیوں کا کفارہ ہی نہیں ادا کیا۔ بلکہ یہ بھی مان لیا کہ رحمان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ اس کے بیٹے کا۔

نوابوں اور جاگیرداروں کی عیاشی کو لے کر بہت سے ناول اور افسانے لکھے گئے ہیں۔ ایک خاتون افسانہ نگار نے تو ایک زمانے میں ایسے افسانے لکھنے میں بڑی شہرت پائی تھی۔ مسرور جہاں کے کئی افسانے اس موضوع پر ہیں۔ مگر انہوں نے یہ افسانے محض جنسی چٹخارے کے طور پر نہیں لکھے ہیں۔ انہوں نے جہاں نوابوں کی جنسی بے راہ روی کو موضوع بنایا ہے وہیں ان کے کردار کے مثبت پہلوؤں کو بھی پیش کیا ہے۔ بیگموں کے کردار میں بھی انہوں نے ان کی زندگی کے ہر رخ کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ ایک مخصوص ماحول کی یہ کہانیاں اس تہذیب کی خلوتوں اور جلوتوں سے عبارت ہیں جن کے نقوش اب خود افسانہ بن گئے ہیں۔ 'کنجی' اسی ماحول کی ایک الگ انداز کی کہانی ہے۔ 'کنجی' ایک انتہائی خوبصورت ناچنے والا نوجوان لڑکا تھا۔ لوگ اس کے رقص کے دیوانے تھے۔ جس نوٹنکی میں وہ اپنا رقص پیش کرتا تھا تماشائی اپنا ہوش کھو بیٹھتے۔ بڑے بڑے رئیس اس کے ناچ اس کی اداؤں اور اس کے حُسن پر فدا تھے۔ ہر چند کہ نوٹنکی کا ناچ نوابوں کی شان کے خلاف تھا۔ مگر کُنجی نے ان کی اس شان کو اپنے گھنگھروؤں کی آواز سے باندھ دیا تھا۔ اس کے ناچ اور اس کی قاتل ادائیں دیکھ کر نواب ذیشان اس پر جی جان سے فدا ہو گئے۔ انہوں نے نوٹنکی کے سارے عملے کو اپنی محلسرا کے قریب ٹھہرا دیا۔ اور کُنجی کو اپنی آرام گاہ سے ملحق ایک آراستہ کمرہ دے دیا۔ کُنجی کی محبت میں وہ اپنی بیگم انجمن آراء کا حسن اور اس کی ناز برداریاں بھی بھول گئے۔ انجمن آرا حیران تھیں کہ نواب ذیشان کو کیا ہو گیا ہے۔ انہیں یہ سوچ کر بھی شرم آتی تھی کہ ان کی رقیب کوئی عورت نہیں ایک مرد، ہے۔ وہ تو خود بھی کُنجی کا ناچ پسند کرتی تھیں۔ لیکن

کنجی کا یہ نیا روپ کس قدر گھناؤنا تھا۔ یہ ان کے خواب وخیال میں نہ تھا۔ ایک دن انجمن آرا کو جب نواب ذی شان کے گاؤں جانے کی خبر ملی تو وہ اس کمرہ میں پہنچ گئیں۔ جہاں کنجی فروکش تھا۔ کنجی خلاف توقع اپنے سامنے ایک حُسین عورت کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ انجمن آرا اس کی بوکھلاہٹ دیکھ کر اسے بتاتی ہیں کہ میں نواب ذی شان کی بیگم انجمن آرا ہوں۔ وہ اس کے کمرہ پر طائرانہ، نظر ڈالتی ہیں۔ جس میں ہر طرف زنانہ ملبوسات اور عورتوں کی آرائش کی دوسری چیزیں موجود تھیں۔ لیکن ان کے سامنے جو خوبصورت نوجوان بیٹھا تھا۔ اسے نسوانیت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس کے اصلی کالے اور لمبے بال بھی مصنوعی معلوم ہورہے تھے۔ وہ بڑی تمکنت سے اسے بتاتی ہیں کہ تمہارا ناچ پسند آیا۔ کنجی اس تعریف کے باوجود خود کو ان کے سامنے حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ انجمن آرا اس سے کہتی ہیں کہ تم سچ مچ بہت اچھا ناچتے ہو۔ پہلے پہل تو مجھے بھی یقین نہیں آیا کہ کوئی مرد، بھی اتنا اچھا ناچ سکتا ہے۔ کنجی ان کے منہ سے اپنی تعریف سن کر شرمندہ ہورہا تھا۔ اور اسے ان کی طرف دیکھنے کا حوصلہ بھی نہیں تھا۔ اول تو رُعبِ حُسن۔ پھر اس کی تعریف میں تضحیک کا جو پہلو تھا۔ اسے وہ خوب محسوس کررہا تھا۔ کئی گھنٹے سجنے سنورنے کے باوجود وہ اس حُسن اور نسائیت کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ لوگ اس کی اداؤں کو سراہتے تھے۔ مگر اصلی حُسن تو اپنی ساری حشر سامانیوں کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھا۔ زندگی میں پہلی بار کنجی کا دل ایک نئے انداز سے دھڑکا۔ اس نے پر شوق نظروں سے انجمن آرا کو دیکھا۔ وہ اسی کی سمت دیکھ رہی تھیں — دونوں کی نظریں ملیں اور جھک گئیں۔ انجمن آرا کے حسن اور نسائیت کے سحر نے اس مرد، کو زندہ کردیا تھا۔ جسے دوسروں کی تریف نے تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔ انجمن آرا اس کی آنکھوں کے مچلتے ہوئے پیغام کو پڑھ کر سٹپٹا گئیں۔ اور ایک دم گھبرا کر جانے کے لئے کھڑی ہوگئیں۔ کنجی بھی ہوش میں آگیا۔ اور دھیرے سے بولا۔ ''اتنی جلدی جارہی ہیں آپ''۔ انجمن آرا نے جواب دیا ''ہاں۔ نواب صاحب تو آتے ہی ہوں گے اور پھر تمہیں اپنی جُون بھی تو بدلنا ہوگی۔ ''انجمن آرا جاتے جاتے اس مرد کو جھنجھوڑ گئیں۔ جو چند لمحے پہلے ایک گہری نیند سے بیدار ہوا تھا۔ نواب ذی شان نے واپس آکر جب کمرے میں قدم رکھا تو انہوں نے دیکھا کہ

سجے سنورے کنجی کے بجائے وہاں ایک مرد بیٹھا ہے۔ اور اس کے سامنے بالوں کا ایک ڈھیر لگا ہے۔

مسرور جہاں چاہتیں تو 'کنجی' کو عصمت کے لحاف کی طرح پیش کر سکتی تھیں۔ لحاف کے نواب صاحب بھی بیگم جان کو چھوڑ کر لڑکوں میں زیادہ خوش رہتے تھے۔ لیکن انہوں نے انجمن آرا کو بیگم جان نہیں بننے دیا کہ وہ ہم جنسی کی لعنت میں مبتلا ہوتی۔ بلکہ انہوں نے انجمن آرا کے ذریعے ناچنے والے کنجی میں اس مرد کو بیدار کر دیا جو اس لعنت کا شکار تھا۔ اس طرح انہوں نے ایک طرف تو ہم جنسی کی لعنت سے مرد کو دور رکھنے کی کوشش کی اور دوسری طرف انجمن آرا کے کردار میں اس عورت کو پیش کر دیا جسے اپنے سے زیادہ اس مرد کو بچانے کی فکر رہتی ہے۔ جو غیر فطری عمل کو عورت کا نعم البدل سمجھ لیتا ہے۔ ایک سماجی لعنت کا یہ رخ ممکن ہے کہ حقیقت نگاری کو جنسی نفسیات کے حوالے سے صحیح نہ لگے۔ مسرور جہاں نے اس کے بہانے اس قانونِ فطرت کی تائید کی ہے۔ جو عورت اور مرد دونوں کو کسی بھی غلط جنسی رجحان کے بجائے ایک صحت مند جنسی رجحان کی طرف راغب کرتا ہے۔ تاکہ سماج اس جنسی پراگندگی سے بچ سکے۔ جس کے لئے آج عدالت عظمیٰ جیسے ادارے بھی تشویش میں مبتلا ہیں۔ اس کی افسانویت اس میں پنہاں ہے کہ ازلی برائی انسانی فیصلے سے اچھی نہیں ہو سکتی چاہے اس کے لئے جتنی بھی تاویلیں پیش کی جائیں۔

مسرور جہاں کے افسانوں میں ایک اہم چیز انسان اور اس کے تہذیبی رشتوں کا احساس ہے۔ ان کے افسانوں میں بھرے، بھرے گھر نظر آتے ہیں۔ جن کے مکین کسی نہ کسی رشتے کی ڈور سے بندھے ہیں۔ ان رشتوں میں خارجی حالات اور ماحول کے تغیرات اور اثرات کے ساتھ، ساتھ ان کی محبتوں، نفرتوں کے درمیان ان کی کشمکش کی دریافت وہ نہایت فطری انداز میں کرتی ہیں۔ وہ ان رشتوں کی حقیقت بھی نمایاں کرتی ہیں اور یہ احساس بھی دلاتی ہیں کہ صدیوں سے چلے آ رہے 'خاندان' کے ادارے میں مرد اور عورت کی کیا اہمیت ہے۔ ان کے بعض افسانوں میں وہ حقائق بھی موجود ہیں جہاں رشتے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اور لوگ اپنی اپنی زندگی میں گم ہو جاتے ہیں۔ فسادات اور تقسیم وطن کے پس

منظر کی بعض تلخ حقیقتیں بھی ان کے چند افسانوں میں دکھائی دیتی ہیں۔

کبھی کبھی وہ خود ایک کردار کی حیثیت سے اپنے تخلیق کردہ کرداروں میں گھل مل جاتی ہیں۔ کسی حقیقی کردار کو افسانوی کردار بنانا آسان نہیں مگر انہوں نے بڑے فطری انداز میں یہ جوکھم بھی اٹھایا ہے۔ اور اپنے کئی افسانوں میں بعض حقیقی کرداروں کو پیش کر کے انہیں نئی پہچان دی ہے۔

''دھوپ دھوپ سایہ'' ایک کشمیری شال بیچنے والے علی محمد بٹ کی کہانی ہے۔ جو شالیں بیچتے بیچتے گھر کے افراد سے اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ بچوں کے لئے وہ ان کا ماموں اور گھر کی مالکن کا بھائی بن جاتا ہے۔ وہ انہیں اپنے گھر اور بیوی بچوں کے بارے میں چھوٹی سے چھوٹی بات بتاتا رہتا ہے۔ گھر کی مالکن تو اب اس کی 'آپا' ہیں ان سے کیا چھپانا۔ اس کی آپا بھی اسے گھر کی ہر بات بتاتی رہتی ہیں۔ شوہر کی موت کے بعد گھر کی مالکن کی مالی پریشانیاں بڑھ جاتی ہیں۔ ایسے میں اس کی بیٹی صبا کی شادی طے ہو جاتی ہے۔ صبا ماں کو بتائے بغیر علی محمد بٹ کو خط لکھ دیتی ہے۔ وہ کشمیر سے آتا ہے اور گھر کے بزرگ کی حیثیت سے صبا کی شادی میں صرف شریک ہی نہیں ہوتا بلکہ تحفے میں جامہ دار کی وہ قیمتی شال بھی دیتا ہے۔ جسے اس کی آپا خرید نہیں پائی تھیں۔

مسرور جہاں کی یہ کہانی ''شال فروش'' کے عنوان سے مہاراشٹر کے اردو تعلیمی نصاب میں آج بھی شامل ہے۔ 'تنہائی کا درد' موجودہ معاشرے کی اس تلخ حقیقت کو بیان کرتی ہے جہاں رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ حامد اور زہرہ نے اپنے چاروں بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے اپنی زندگی کا ہر سکھ قربان کر دیا۔ لیکن بڑے عہدوں پر پہنچ کر اور شادیاں کر کے وہ ماں باپ کو بالکل بھلا بیٹھے اور انہیں گھر میں بالکل اکیلا چھوڑ دیا۔ تنہائی کا درد جھیلتے جھیلتے اور بیٹوں کا انتظار کرتے کرتے آخر حامد میاں نے ایک دن دم توڑ دیا۔ لیکن ان کے بیٹوں کو اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ باپ کی میت کو کاندھا دیتے۔ اور اس ماں کو سہارا دینے آجاتے جو اَب اور بھی تنہا ہو گئی۔

''کہاں ہو تم'' عہد حاضر کا المیہ ہے۔ مصلحتوں اور سمجھوتوں کے اس دور میں حق

گوئی اور راست بیانی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ یہ افسانہ کی روداد ہے۔ یہ ایک با صلاحیت دیانتدار اور بے باک صحافی کی کہانی ہے۔ جسے اس کی ماں نے اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ مگر جب وہ ایک کامیاب صحافی بن کر ابھرا تو اس کے ہم پیشہ اس سے حسد کرنے لگے۔ وہ اس کی ذہانت کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن سازشیں کر کے اسے پریشان کرتے رہے۔ وہ ایک اخبار سے دوسرے اخبار تک اسی طرح پریشان ہوتا رہا۔ مگر کبھی اس نے سمجھوتہ نہیں کیا۔ بیرون ملک کے اخبار کی ملازمت ملی تو وہاں کا انگریز ایڈیٹر اس کی قابلیت کا اعتراف کرنے کے بجائے اس کا دشمن بن بیٹھا۔ وہ بھی اس لئے کہ ایک غلام ملک کا صحافی ذہانت میں اس سے آگے کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کی تحریریں اس سے بہتر کیونکر ہو سکتی ہیں۔ اس نے وہاں کی ملازمت بھی چھوڑ دی۔ اور اپنے ملک کی ایک اشتہاری کمپنی میں ملازمت کر لی۔ یہاں بھی اسے وہی لوگ ملے جو اس کے جیسا لکھ تو نہیں سکتے تھے۔ مگر اس کی تحریروں کو غائب کر کے اس کے خلاف سازشیں تو کر سکتے تھے۔ لیکن اس نے ہار نہیں مانی۔ وہ لکھتا رہا۔ بڑے بڑے اخباروں میں اس کی تحریر میں شائع ہوتی رہیں۔ مگر ایک دن سازشی ٹولے نے کچھ ایسا کیا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر چل دیا۔ اسی راستے پر جس پر اس سے پہلے بھی کئی لوگ اپنی بیباکی اور حق گوئی کے نشانات چھوڑ کر بہت دور جا چکے تھے۔

''نئے موسم کی نئی فصل'' پہچان کا سفر، تاریکیوں کے بعد، وغیرہ وہ افسانے ہیں۔ جو فسادات سے متعلق ہیں۔ یہ خوف کے سیلاب اور آگ کے دریاؤں میں ڈوبتے ابھرتے ان انسانوں کے حوالے ہیں جو تاریخ میں بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ 'چوتھی سمت' اور 'جائے اماں' اس خوف کے افسانے ہیں جس کے لئے کامیو نے لکھا ہے ''ہماری اپنی بیسویں صدی خوف کی صدی ہے۔ اور یہ زمانہ جو گزرا ہے ہم میں چھپی ایک چیز کو مار گیا ہے۔ اور یہ چیز انسان میں اپنی ذات کا اعتماد تھا۔ ہم اس سبب سے ڈر اور خوف میں جی رہے ہیں کہ اب دل نشینی ناممکن ہو کر رہ گئی ہے۔

ان کے افسانوں میں جہاں روایت کی پاسداری ہے وہیں کچھ ایسے تجربے بھی ہیں جو بولتے ہوئے منظر ناموں کا احساس دلاتے ہیں۔ جہاں وہ اپنے کرداروں کے

تعارف میں ضروری، غیر ضروری تفصیلات کا کوئی گوشہ خالی نہیں چھوڑتیں۔ وہیں مجرّد غیر مجرّد اشیاء اور عناصر کو بھی اس طرح پیش کرتی ہیں کہ ان کا وجود بھی واقعات کی ترتیب وارتقاء کا حصّہ بن جاتا ہے۔

یہ چند مثالیں دیکھئے۔

''اسٹیج کے بالکل سامنے ہی نواب ذی شان کی نشست ہوتی 'کنجی' ناچتا تو ان کی نظروں کی وارفتگی دیکھ کر انجمن آرا کو سخت کوفت ہوتی۔ پھر ساتھ والیوں کی دبی دبی سرگوشیاں، مسکراہٹیں، اور کلیجے میں چٹکیاں لینے والی ہمدردانہ باتیں ان کی برداشت سے باہر تھیں۔ اس لئے انہوں نے وہاں جانا ہی چھوڑ دیا۔ لیکن رات کے سناٹے میں دور دور تک پہنچنے والی طبلے، ہارمونیم اور نگاڑے کی آوازیں اور گانے والوں کی اونچی اونچی تانیں۔ انجمن آرا کے کانوں تک ہی نہیں پہنچتی تھیں۔ بلکہ دل ودماغ کو مجروح کر جاتی تھیں۔''

(کنجی)

''اس وقت وہ گہری اور پُرسکون نیند میں ڈوبا اس کے سامنے تھا۔ اسے وہ دن یاد آرہا تھا جب اس نے پہلی بار اس کی آغوش میں آنکھ کھولی تھی۔ اور زندگی میں پہلی بار اسے تحفظ کا احساس ہوا تھا۔ حالانکہ اس کا ننھا سا کمزور وجود اس وقت خود ہی سہارے کا محتاج تھا۔ ایک ننھا سا پودا جسے پروان چڑھا کر، پال پوس کر تناور اور چھتنار درخت کی تشکیل کرنا تھی۔ تخلیق کے مرحلے سے گزرنے کے بعد ہر ماں کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ اس سایہ دار پیڑ کی چھاؤں میں سکون کی چند سانسیں لے سکے۔ اسے خود غرضی تو نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ یہ ایک ماں بلکہ ہر ماں کا خواب ہوتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ عورت اپنے شریک سفر سے محبت تو کرتی ہے۔ اس کی سلامتی کی دعائیں بھی مانگتی ہے۔ لیکن اسے اپنے بڑھاپے کا سہارا نہیں سمجھتی اور جس ننھی سی جان کو اپنے ہاتھوں سے پال پوس کر بڑا کرتی ہے۔ اس کو مضبوط سہارا بھی سمجھتی ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ اس کے اپنے وجود کا حصّہ ہوتا ہے، اپنا خون ہوتا ہے۔''

(کہاں ہو تم)

"پانی سے بوجھل بھورے اور کالے بادلوں کے قافلے راستہ بھٹک کر نہ جانے کس دیس نکل گئے تھے۔ موسم کا کارواں بھی ایک جگہ تھم سا گیا تھا۔ اسے نہ ساون کی فکر تھی نہ بھادوں کی۔ اس کے مزاج کی یکسانیت بھی حیرت انگیز تھی۔ سورج کا گولا بھی سرخ بھبھوکا سا دن بھر دہکتا رہتا۔ اس کی روپہلی کرنیں آگ برساتیں اور جب یہ آگ برساتی کرنیں نیزے کی انی بن کر زمین کی چھاتی میں دھنس جاتیں تو زمین لوہے کی مانند تپنے لگتی۔ ہر پتھر انگارہ بن جاتا اور ہر ذرّہ چنگاری۔ ہوا کے گرم جھونکے بھٹی سے نکلی ہوئی آنچ کی مانند لپکتے تو ان کی زد میں آنے والی ہر شے جھلس جاتی۔"

(نئے موسم کی نئی فصل)

"وہ ان کے ساتھ ہولیا۔ ابھی وہ تھوڑی ہی دور آگے بڑھے ہوں گے کہ اس ہجوم پر تڑتڑاہٹ کے بادل گرجے۔ اور آنِ واحد میں امن کے علمبردار سرخ گرم سیال میں ڈوب گئے۔ وہ ایک دیوار کی آڑ میں اپنے ہی سائے سے چمٹا کھڑا تھا۔ سائے کا دھڑ تو سلامت تھا، سر غائب تھا۔ اس نے باری باری دونوں کو ٹٹولا۔ لیکن دونوں جسموں پر ایک بھی سر نہ تھا۔ اور وہ بے سر کا جسم لئے کھڑا تھا۔ یوں تو کئی سر اس کے قدموں میں پڑے تھے۔ لیکن ان میں اس کا سر کون سا تھا وہ کیسے پہچانتا۔ وہ تو اپنی شناخت کھو چکا تھا۔ تن سے جدا ہونے والے سروں کو ان کے اصل تن سے جوڑنا ایک مشکل کام تھا۔ اس لئے وہ بے سر کے آگے بڑھ گیا۔

(چوتھی سمت)

"پھنکار کی آواز سن کر وہ پلٹا۔ اور ٹھٹھک گیا، دو چمکیلی آنکھیں اس پر مرکوز تھیں۔ ان آنکھوں میں بڑا کینہ تھا۔ اور وہ نظریں جو اس پر میخوں کی مانند گڑی تھیں ان میں اس کے لئے تمسخر تھا۔ حقارت اور نفرت تھی۔ اس کا سیاہ جسم خوب چمکدار اور لسلسا تھا۔ چوڑا پھن جس پر دو ننھی ننھی ہیروں کی کنی جیسی آنکھیں چمکی ہوئی تھیں اور لپ لپ کرتی کالی زبان بجلی کی سی۔ تیزی سے اندر باہر جا رہی تھی۔

(جائے اماں)

"اس ویران گھر میں بس وہی دونوں ایک دوسرے کے غمگسار تھے۔ دونوں کا درد

ایک تھا ''تنہائی کا درد''۔ تنہائی کا غم، یہ ان کا مشترکہ درد تھا۔ جسے وہ بانٹنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن جو ہمدردی پا کر کم ہونے کے بجائے کچھ اور بڑھ جاتا تھا۔ اور دونوں اندھیرے کمرے میں، آنکھیں پھاڑے چھت کو گھورتے رہتے تھے۔ اور ایک دوسرے سے اپنا دکھ چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔''

(تنہائی کا درد)

بہت سی غائب اور حاضر حقیقتوں کے یہ افسانے مسرور جہاں کے تخلیقی سفر کا وہ سنگِ میل ہیں۔ جنہیں آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔ ان کے چند افسانوی مجموعے ''دھوپ دھوپ سایہ'' بوڑھا یوکلپٹس، تیرے میرے دکھ، پرندے کا سفر، چراغ پھولوں کے بہت پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ ادھر ان کے افسانوں کے تین مجموعے، کل کی سیتا آج کی سیتا، پُل صراط، اللہ تیری قدرت، ایک ساتھ ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئے۔ ان میں نئے افسانوں کے علاوہ کچھ پرانے افسانے بھی شامل ہیں۔ ان کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ ''کہاں ہو تم!'' ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا ہے۔ اپنے افسانوں کے متعلق ان کی اپنی رائے یہ ہے۔ ''میں یہ دعویٰ نہیں کر رہی ہوں کہ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے میرے افسانے منفرد ہیں۔ لیکن میں نے اپنے موضوعات سے انصاف کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنی بات ایک افسانے میں نہیں کہہ پاتے۔ اور بالکل غیر شعوری طور پر اپنی بات کی تکمیل کے لئے دوسرا افسانہ لکھتے ہیں۔ لیکن یکسانیت سے بچانے کی کوشش شعوری ہوتی ہے۔ سماج کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے مختلف رنگوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کبھی یہ رنگ بہت گہرے ہوتے ہیں۔ اور کبھی بہت ہلکے، ان گہرے اور ہلکے رنگوں کے امتزاج سے جو تصویر مکمل ہوتی ہے۔ اسے قارئین کے سامنے پیش کرنا ہمارا فرض ہے۔ معنی و مطلب اخذ کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ یہ کام قارئین کرام کا ہے۔ لہٰذا کسی دعوے کے بغیر یہ افسانے آپ کی نذر ہیں۔''

اور

''—— دراصل زندگی یک رخی نہیں ہوتی اس کے ہزار پہلو ہیں۔ اور ہر پہلو

اپنے آپ میں مکمل دنیا ہے۔ افسانہ نگار زندگی کا نباص ہوتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو کو اس کے صحیح سیاق وسباق میں قاری کے سامنے پیش کرے۔

نقادوں سے دور۔ اور گروہ بندیوں میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے مسرور جہاں کو وہ پذیرائی نہیں مل سکی جس کی وہ بجا طور پر مستحق تھیں۔ اس کے باوجود ان کے کئی افسانے، پنجابی، تامل، تیلگو، کنڑ اور ملیالم، بریل وغیرہ میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ نگہت سلطانہ عابدی نے ''مسرور جہاں فن اور شخصیت'' پر مقالہ لکھ کر 'ڈی لٹ' کی ڈگری حاصل کی ہے۔ تاجکستان کے جاوید خولوف نے ان کے افسانوں پر پی ایچ ڈی، کی ہے ان کا مقالہ 'تاجک' میں شائع ہو چکا ہے۔ افسانے کے موضوع پر دوسرے تحقیق کرنے والوں نے بھی مسرور جہاں اور ان کے افسانوں کو اپنے مقالے کا حصّہ بنایا ہے۔ افسانوں کے علاوہ مسرور جہاں کے ناولوں کی بھی اچھی خاصی فہرست ہے جن میں 'نئی بستی' جیسا قابلِ توجہ ناول بھی ہے۔

صنعتی نظام اور صارفیت کے اس دور میں کہ جب افسانہ، تنہائی بے بسی، زندگی کی بے معنویت، دہشت، جنگ اور وجدیت، جیسے موضوعات کی طرف متوجہ ہو چکا ہے۔ عورت کے معاملات اور مسائل میں بھی بہت سی تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ اس کے طرز احساس میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ گھر آنگن کا وہ تصور بھی نہیں رہا جو پہلے تھا۔ مسرور جہاں کے افسانوں میں اس کی جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر وہ ایک ایسے روشن خیال معاشرے کی حامی ہیں جہاں عورت کے لئے مساوات کے ساتھ ساتھ وہ رویے بھی ہونا چاہئیے جو عورت کو مرد کے برابر نہ سہی مگر اتنا تو اختیار دے سکیں کہ وہ خود کو بے دست و پا نہ محسوس کر سکے۔ پدرسری نظام اور خاندان کے تصوّر پر کاری ضرب لگنے کے بعد معاشرہ جس تیزی سے اپنا چولا بدلتا جا رہا ہے۔ اس میں عورت اپنی تمام آزادیوں کے باوجود اب بھی اس منزل سے دور ہے جہاں اسے وہی عزت دی جا سکے جو مرد کو حاصل ہے۔ مغرب میں عورت کی آزادی کے نام پر اچھا برا جو کچھ ہو رہا ہے وہ اپنی جگہ —— مشرق، بالخصوص مسلم معاشرے میں عورت کے جو مسائل رہے ہیں مسرور جہاں کے افسانے اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اپنے اردگرد کا مشاہدہ کیا ہے۔ بلکہ اپنے عہد کی حقیقتوں کو دریافت کر کے

مسلم گھرانوں کی زندگی کا وہ خاکہ پیش کردیا جو عورت کی سماجی حیثیت کے اقرار وانکار کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

مسرور جہاں کے افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہ افسانے انسانی معاشرے اور انسانی رشتوں کی تبدیلیوں کو واضح کرنے کے علاوہ اس عورت اور خاندان کی بات کرتے ہیں جن کی تعمیر یا تخریب کا معاملہ خود ایک موضوع ہے۔ عام فہم اور خوبصورت نثر میں لکھے گئے یہ افسانے دراصل زندگی کی تلاش کے افسانے ہیں۔ جن میں ہر کردار کی اپنی اپنی راہیں اور اپنے اپنے سنگ میل ہیں۔ ان راہوں اور 'سنگ میلوں' کی تلاش میں یہ افسانے کتنے کامیاب یا ناکامیاب ہیں یہ تو وہی بتا سکتے ہیں، جنہوں نے ان افسانوں کو پڑھا ہو۔ بہر حال میں اتنا جانتا ہوں کہ ان کے یہ افسانے جس وحدت تاثر سے عبارت ہیں وہ قارئین کو متوجہ ضرور کرتی ہے۔ ایک افسانہ نگار کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔

☆☆

ایک شجر ایسا——

چودھواں سال لگتے ہی لڑکیوں کے بدن میں بجلیاں تڑپنے لگتی ہیں۔ سر سے پاؤں تک ان کے پورے وجود سے شرارے سے لپکنے لگتے ہیں اور ہر عضو سے روشنی کی گرم گرم کرنیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ ان تڑپتی مچلتی بجلیوں کی آنچ ایک میل دور سے بھی محسوس ہوتی ہے۔ اور شراروں کی لپک فاصلوں کے باوجود مقابل کو جلانے —— اور جلا کر خاکستر کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔ روشنی کا انعکاس بند پلکوں کے کواڑ پھلانگ کر دل کی سطح پر ہلچل مچا دیتا ہے۔ نتیجے میں تباہی اور بربادی مقدر ہو جاتی ہے۔ ان تباہ کن ہتھیاروں کی زد سے کون کافر محفوظ رہ سکتا ہے؟

پھول بیگم کو چودھواں سال لگا تو نہ ان کے بدن میں بجلیاں تڑپیں۔ نہ شرارے لپکے۔ نہ ہی قیامت آئی۔ ان کے نازک نازک دودھیا جسم سے مشکِ نافہ کی مانند بھینی بھینی خوشبو پھوٹتی تھی۔ ان کے سراپا سے ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی منعکس ہوتی تھی اور ان کے کلیوں جیسے لبوں سے ادا ہونے والا ہر لفظ شبنم کے قطروں کی طرح پاکیزہ اور مصفّٰے ہوتا تھا۔ ان کے قریب آنے والے کی گستاخ نگاہیں جھک کر ان کے قدموں میں سجدہ ریز ہو جاتی تھیں۔ وہ نہ مغرور تھیں نہ احساسِ حسن نے انہیں ستم گر بنایا تھا بلکہ فطری شرم وحیا نے انہیں سنوارا تھا۔ اور اس طرح سنوارا تھا کہ ان کی طرف اٹھنے والی نظروں میں احترام کے سوا اور کوئی عکس ڈھونڈھے سے نہیں ملتا تھا۔

پھول بیگم کے حُسن کی خوشبو پھیلی تو دور قریب کے رشتے دار بھونروں کی طرح

منڈلانے لگے۔ ہر دل ان کا تمنائی تھا۔ ہر آنکھ ان کی شیدائی تھی۔ لیکن انہیں ان چھچھورے، دل پھینک اور ہرجائی نوجوانوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے کوئی آئیڈیل نہیں بنایا تھا۔ کسی کافر کا بت نہیں تراشا تھا۔ کسی کو دل میں نہیں بسایا تھا۔ لیکن ان کی پسند کا معیار عام لڑکیوں سے الگ ضرور تھا۔ اور یہ شاید ان کی بلند نگاہی تھی کہ انہیں چاند کے اردگرد، آس پاس چکّر لگانے والا چکور نظر نہیں آیا جو بچپن سے اب تک ہر پل ہر لمحہ ان پر اپنا آپ وار نے پر تیار رہتا تھا۔ جو ہر قدم پر ان کا سایہ بنا رہتا تھا۔ وہ اسے جس نام سے پکارتیں۔ جس نام سے مخاطب کرتیں۔ حاضر ہو جاتا۔ شجّن، شجّی، شجّو۔ کئی نام تھے اس کے۔ یہ پیار کے القاب نہیں تھے، نہ ہی وہ کسی کا چہیتا تھا۔ ایک کنیز زادہ کسی کے پیار یا التفات کے لائق ہی کب تھا۔ یہ سارے القاب اور خطاب تو اس کی شخصیت اس کے وجود اور اس کے ہونے کی نفی کرتے تھے۔ وہ ہو کر بھی نہیں تھا۔ ورنہ اس کا اچھا بھلا نام شجاعت کیا برا تھا؟ اس نام پر جاگیریں تو عطا نہیں کی جا رہی تھیں اور نہ وہ کسی کی وراثت کا دعوے دار تھا۔ یہ نام تو اس کی ماں نے رکھا تھا۔ اور ماں نے نام کے سوا اس کو دیا ہی کیا تھا۔؟ لیکن یہ نام بھی کسی کی زبان پر نہ چڑھ سکا۔ ہاں ماں ضرور اس ڈیوڑھی کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھ گئی۔ خدا جانے اس کا جرم کیا تھا۔

ہر بڑے اور امیر گھرانے کی طرح اس ڈیوڑھی پر بھی ملازموں کی ریل پیل تھی۔ خاندان کے ہر فرد کے لئے الگ الگ خدمت گار تھے۔ بچّوں تک کے لئے انائیں اور آیائیں مقرّر تھیں۔ مردوں سے زیادہ عورتیں ملازم تھیں حد ہے کہ سرکاروں اور صاحبزادوں تک کی خدمت پر ہر رنگ اور نسل کی خادمائیں مامور تھیں۔

اللہ بخش میراثی جب تک زندہ رہا ڈیوڑھی کی خدمت کرتا رہا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ نے بھی یہیں پناہ لی۔ ڈیوڑھی والوں کو نام بگاڑنے میں کمال حاصل تھا۔ مجال ہے جو کسی نوکر کو اس کا سیدھا پورا نام لے کر بلائیں۔ گُل بانو بھی گُلبیا بن گئی۔ گل بانو کا نام تو یوں بھی اس پر پھبتی ہی لگتا تھا۔ نہ وہ گلوں کی مانند گل اندام تھی نہ ہی اس کا رنگ گورا گلابی تھا۔ شبِ دیجور کی مانند سیاہ رنگ، اونچا قد، مردوں جیسے مضبوط ہاتھ پاؤں، اور مہین

چھلّوں، جیسے گدّی میں چپکے ہوئے بال۔ مانو سیدھی حَبش سے چلی آرہی ہو۔ شہر میں حبشیوں کے کئی خاندان آباد تھے۔ محرّم کے زمانے میں جب پندرہ بیس حبشنیں حلقہ بنا کر ایک ساتھ بڑے نظم وضبط کے ساتھ نوحے پڑھتیں اور بھاری مضبوط ہاتھوں سے سینہ زنی کرتیں تو اچھے اچھے مردوں کا پتہ پانی ہو جاتا۔ سال کے باقی، مہینوں میں وہ مختلف ڈیوڑھیوں پر نوکری کرتیں۔ جہاں سخت محنت کے کام انہیں سونپے جاتے تھے۔ گلبیا بھی بہت محنتی تھی۔ منجھلے صاحب کی خدمت وہ جی جان سے کرتی تھی۔ ایسی بھیانک بدصورت عورت سے منجھلی بیگم کو بھلا کیا خطرہ محسوس ہوتا سو وہ اس کی فکر نہیں کرتی تھیں خواہ وہ گھنٹوں منجھلے صاحب کی مالش کرے یا ان کے ہاتھ پاؤں دبائے۔

منجھلی بیگم اپنی نواڑی پلنگڑی پر بیٹھی گلوریاں نوش کرتیں۔ یا دن میں چار بار اپنا لباس تبدیل کر کے سج سنور کر آئینہ دیکھتیں اور اپنے حُسن کو سراہتیں۔

گلبیا نے ایک تندرست اور توانا لڑکے کو جنم دیا تو ڈیوڑھی کی بیگمات نے یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کہ اللہ بخش میراثی کو مرے ہوئے برسوں ہو گئے تو یہ لڑکا کہاں سے آ گیا؟۔ درجنوں ملازموں میں سے کوئی بھی اس کا جنم داتا ہو سکتا تھا۔ برسوں کسی کو اس کے نام کا پتہ نہیں چلا۔ وہ تو ایک دن منجھلے صاحب نے گلبیا کو ڈانٹا "کیا بہری ہو گئی ہے گلبیا۔ سنائی نہیں دیتا شجاعت کب سے رو رہا ہے" تب آس پاس والوں نے پہلی بار نام سنا۔ اور فوراً شجاعت کا قافیہ وجاہت سے ملا دیا۔ جو منجھلے صاحب کا نام تھا —— اور اگلے ہی دن منجھلی بیگم نے ماں بیٹے کو نکال باہر کیا۔

بڑے سرکار کے مرتے ہی ایک ڈیوڑھی کی چار ڈیوڑھیاں ہو گئیں۔ سب لوگ الگ الگ اپنے اپنے حصّے کے مطلق العنان حاکم تھے۔ اور چھوٹی بیگم نے گلبیا اور اس کے بیٹے کو ہاتھوں ہاتھ لیا —— وہ تو ہمیشہ اس تاک میں رہتی تھیں کہ منجھلی بیگم کو کیسے جلائیں۔ اب جو یہ موقع ہاتھ آیا تو انہیں لپک لیا۔ گلبیا کے کام سے وہ بھی خوش رہتی تھیں۔ شجاعت کو شجّن بنا کر انہوں نے اس کی اوقات ضرور بتا دی تھی۔ معصوم بچّہ ان تکڑموں کو بھلا کیا سمجھتا —— وہ تو ان کی ایک آواز پر دوڑا آتا۔ پہلے گھٹنوں کے بَل، پھر پاؤں پاؤں۔

جب گلبیا مری تو شجن سات آٹھ سال کا تھا اور قد کاٹھ سے نو دس برس کا لگتا تھا۔ بالکل اپنی ماں پر گیا تھا۔ وہی رنگ اور ویسا ہی مضبوط اور محنتی۔ پھول بیگم کی عمر اس وقت بہ مشکل چھ برس کی ہوگی۔ شجن اس پریوں جیسی حسین اور نازک شہزادی کے ساتھ گھنٹوں کھیلتا تھا۔ چھوٹی بیگم نے بھی اس بے جوڑ دوستی پر اعتراض نہیں کیا۔ پھول بیگم موٹر میں بیٹھ کر اسکول جانے لگیں۔ تو شجن بھی ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر تن کر بیٹھ جاتا۔ وہ اب خود کو بہت بڑا اور ذمّے دار سمجھنے لگا تھا۔ گھر کے ڈھیرے سارے کاموں کے ساتھ پھول بیگم کو اسکول لے جانے اور لانے کا کام بھی اس کے ذمّے تھا۔ اسے یہ کام سب کاموں سے زیادہ پسند تھا۔ ملازموں کی تعداد بھی اب کم ہوگئی تھی۔ اس لئے پھول بیگم کے بیشتر کام وہی انجام دیتا تھا۔ وہ بھی ایک طرح سے اس کی عادی ہوگئی تھیں۔ شجن کا نکلتا ہوا قد، اور مضبوط ہاتھ پاؤں دیکھ کر انہیں کبھی خیال نہیں آیا کہ وہ جوان ہوگیا ہے۔ شاید اس جیسے نوکر کبھی جوان نہیں ہوتے۔ اور ہوتے بھی ہیں تو ان کی جوانی کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔

خاندان کی لڑکیاں بیری کی مانند پھیل کر چھتنار ہوتی جارہی تھیں اور کئی تو بھٹ کیئا کی جھاڑی کی طرح خطرناک حد تک جوان ہوگئی تھیں۔ لیکن ابھی تک کسی کے آنگن میں ڈھیلا تو کیا کنکری تک نہیں آئی تھیں۔ پھول بیگم کے آنگن میں رشتے ٹپکے کے آم کی طرح پٹاپٹ گر رہے تھے۔ چھوٹے صاحب اور چھوٹی بیگم کو رشتے کے انتخاب میں مشکل ہو رہی تھی۔ پھول بیگم کے سرتاج من سلامت، جانے کن کونوں کھدروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ اور یہاں بھول بیگم کو اپنا اسکول چھٹتا نظر آرہا تھا۔

بڑے سرکار کے آغا صاحب سے گہرے مراسم تھے۔ ان کے پوتے آغا خوشنود کا رشتہ آیا تو پھول بیگم کی خوش نصیبی پر گویا مُہر ثبت ہوگئی۔ ایرانی ماں اور مغل باپ کی اولاد آغا خوشنود۔ خاندانی رئیس، تعلیم یافتہ اور مردانہ وجاہت کے مالک تھے۔ ان کا قالینوں کا کاروبار تھا۔ ادھر پھول بیگم میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئیں۔ اُدھر آغا صاحب بارات لے کر آگئے۔ پھول بیگم رخصت ہو کر جانے لگیں تو ماں سے التجا کی۔

''امّی حضور — شجن کو ہمارے ساتھ کر دیجئے۔''

''لاکھوں کا جہیز دے کر بیٹی کو رخصت کرنے والے والدین بیٹی کی اتنی چھوٹی سی خواہش کیسے رد کر دیتے۔ سو شجن بھی جہیز میں دے دیا گیا۔ لڑکیوں کو تو میکے کی طرف سے اڑ کر آنے والا 'کوا' بھی اپنا میت لگتا ہے۔ یہ تو شجن تھا۔ ان کا مزاج دان، وفادار اور خدمت گذار۔

تھوڑے ہی دن میں آغا صاحب بھی شجن کی خدمت اور وفاداری سے خوش ہو گئے۔ وہ پھول بیگم سے بھی زیادہ اس کا خیال کرتے تھے۔

ایک سال پر لگا کر اڑ گیا۔ اور پھول بیگم ننھی منّی پیاری سی بیٹی کی ماں بن گئیں۔ آغا صاحب نے بیوی کے نام کی مناسبت سے اس کا نام مہک رکھا۔

پھول اور مہک یہ دونوں آغا صاحب کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھیں۔ وہ بھول گئے کہ ان کی جان بھی اپنی نہیں کسی اور کی امانت ہے۔ ایران سے واپس آتے ہوئے ان کا پلین کریش ہو گیا۔ مہک اس وقت پانچ سال کی تھی۔ اور باپ سے بہت زیادہ مانوس تھی۔ پھول بیگم اسے کیا سنبھالتیں وہ تو خود اس حال میں تھیں کہ کوئی انہیں سنبھالتا۔ شجن نے ہی حوصلہ کیا۔ اور ماں بیٹی کو اس طرح سنبھالا کہ اپنا آپ ان پر وار دیا۔ اور انہیں ٹوٹ کر بکھرنے سے بچا لیا۔

وقت اتنا تیز گام ہے کہ ایک پل نہیں ٹھہرتا اور ظالم ایسا کہ کسی کے دُکھ سکھ کا بھی خیال نہیں کرتا۔ بس آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ہے۔ خوشیوں کو روندتا، دکھوں کو سمیٹتا، نہ پیچھے چھوٹنے والوں کی فکر، نہ ساتھ چلنے والوں کا لحاظ ایک دن پھول بیگم نے حساب کتاب کیا تو پتہ چلا کہ آغا صاحب کو جدا ہوئے برسوں بیت گئے۔ کاروبار سمٹ کر ایک دوکان تک محدود ہو گیا تھا۔ نقصان کا حساب کون کرتا۔ سب سے بڑا نقصان برداشت کرنے کے بعد روپے پیسے کا نقصان کیا معنی رکھتا تھا۔ پھول بیگم کے ہمدردوں میں اچانک ہی اضافہ ہو گیا تھا۔ ان کے اتنے رشتے آئے کہ کسی کنواری کے بھی نہ آئے ہوں گے۔ مرنے والے کی یادیں اتنی دھندلی نہیں ہوئی تھیں کہ وہ چاہنے والے شوہر کی محبت دل سے کھرچ کر سہاگ کا نیا جوڑا پہن لیتیں۔ وہ اگر زندہ تھیں تو اپنی بیٹی کے لئے۔ نہ ہی اتنی نادان تھیں کہ ان نام نہاد

ہمدردوں کی آنکھوں میں رقصاں حرص اور لالچ کو نہ پہچانتیں۔ اپنے ارادوں میں ناکام ہونے کے بعد انہوں نے پھول بیگم کو بدنام کیا۔ لیکن انہوں نے ان کے سارے ہتھکنڈے ناکام بنادئے۔ اور اب تو مہک نے پندرہویں برس میں قدم رکھ دیا تھا۔ اگر آغا صاحب زندہ ہوتے تو وہ اسے خوب پڑھاتیں۔ ڈاکٹر، انجینئر یا اعلیٰ افسر بناتیں۔ لیکن میاں کے ساتھ سارے ارمان بھی ختم ہوگئے تھے۔ اگر شجن نہ ہوتا تو شاید یہ دونوں ماں بیٹی بھی ختم ہوگئی ہوتیں۔ شجن نے کاروبار بھی سنبھالا اور انہیں بھی۔ وہ اس کی بہت احسان مند تھیں۔ کئی بار انہوں نے اس پر زور دیا کہ وہ شادی کرلے۔ لیکن اس کا انکار اقرار میں نہ بولا۔

''امّی''——— مہک ان کے کاندھے سے لگی لاڈ کر رہی تھی۔

''کیا بات ہے جان؟''۔

''میں میٹرک میں فیل ہوجاؤں گی۔''

مہک نے اطمینان سے پھول بیگم کو اطلاع دی۔

''اچھا—— یہ پیشین گوئی کس لئے کر رہی ہو؟''۔

''میری انگریزی اور میتھس بہت کمزور ہے امّی''۔

''پھر؟'' وہ مسکرائیں اور اس کے جواب کا انتظار کرنے لگیں۔

''ٹیوٹر کے بغیر پاس نہیں ہوسکتی۔''

''ہُوں۔ شجن سے کہو ٹیوٹر لے آئے گا۔''

''امّی۔ میں آپ سے ٹیوٹر کے لئے کہہ رہی ہوں۔ بازار سے سامان نہیں منگوانا ہے۔'' مہک جھنجھلا گئی۔

''پھر کس سے کہوں؟''۔ بے بسی سے پھول بیگم نے سوال کیا۔

''میری دوست کو جو ٹیوٹر پڑھاتا ہے وہی مجھے بھی پڑھادے گا۔ اس نے بات کرلی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ کل سے بلالو۔'' پھول بیگم نے رضامندی دے دی تو مہک نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

شاہد حسین۔ ایم ایس سی تھے۔ اور ملازمت کی تلاش میں تھے۔ فی الحال ٹیوشن کر کے بے کاری کا غم غلط کر رہے تھے۔ دیکھنے میں سنجیدہ اور مہذب تھے۔ پھول کو وہ خاصے معقول لگے۔ مہک بھی ان سے مطمئن تھی۔ وقت کی پابندی سے وہ مہک کو پڑھانے آرہے تھے۔

جب تک مہک پڑھتی، پھول بیگم ذرا فاصلے پر بیٹھی کوئی کتاب دیکھتیں، یا سلائی کڑھائی کا کام کرتی رہتیں۔ جوان لڑکی کے معاملے میں وہ کسی باہر والے پر اعتبار کرنے کی قائل نہیں تھیں۔ سن و سال، رتبہ اور رشتہ کسی برائی کو روکنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ سیٹھ ابراہیم، سرور بھوجانی انور حسین رائے زادہ یہ سب شادی شدہ اور کئی بچوں کے باپ تھے۔ آغا صاحب سے ان کے کاروباری اور دوستانہ مراسم تھے۔ لیکن آغا صاحب کی آنکھ بند ہوتے ہی کسی رشتے اور واسطے کا احترام نہیں کیا۔ اور نکاح کا پیغام دے دیا۔ مہک تو ابھی کم سن اور نادان ہے۔ زمانہ کے سرد و گرم سے ناواقف ہے یہ تو ماں کا فرض ہے کہ اولاد کو دنیا والوں کی میلی نظروں سے بچائے۔

پھول بیگم کئی دن سے سخت پریشان تھیں۔ جب بھی ان کی نگاہ سوئی دھاگے سے اوپر اٹھتی۔ شاہد حسین کی نظروں سے ٹکرا جاتی۔ وہ زیرِ لب مسکرا کر مہک سے مخاطب ہو جاتے۔ اور پھول بیگم مارے غیرت کے پسینے پسینے ہو جاتیں۔ اور کسی بہانے سے اٹھ کر چلی جاتیں۔ سفید کفن جیسے لباس میں زندہ لاش جیسی عورت سے کوئی مرد بھلا کیسے دلچسپی لے سکتا ہے۔

وہ اپنی سونی کلائیوں کو دیکھتیں۔ ہاتھ کی پشت پر ابھری ہوئی نسوں کے جال کو گھورتیں۔ اور اپنے وہمی پن کو دل ہی دل میں کوستیں۔ لیکن یہ ان کا وہم نہیں تھا۔ گرم نظروں کی تپش کا احساس وہم ہو سکتا ہے۔ لیکن کیا وہ مسکراہٹ بھی دھوکہ ہے جو شاہد حسین کے ہونٹوں سے پھسل پھسل جاتی ہے۔ اور جسے روکنے یا چھپانے کی انہیں فکر بھی نہیں ہوتی! اس غریب، تعلیم یافتہ اور خاندانی مگر بے روزگار نوجوان کو دیکھ کر انہیں خیال آیا تھا کہ اگر یہ دو چار برس عمر میں کم ہوتا۔ تو انہیں اپنی مہک کے لئے ایک آئیڈیل شریکِ حیات مل جاتا۔ وہ اسے اپنے پاس رکھتیں اور سارا کاروبار اسے سونپ کر مطمئن ہو جاتیں انہیں مہک کی کسی

بات سے یہ شبہ نہیں ہوا تھا کہ وہ شاہد حسین کے بارے میں کچھ اور سوچتی ہے۔ حالانکہ اکثر دیکھنے میں آیا تھا کہ کم عمر لڑکیاں اپنے سے بڑی عمر کے مردوں میں دلچسپی لیتی ہیں۔ خاص طور پر ایسی لڑکیاں جن کے سر پر باپ کا سایہ نہیں ہوتا۔ عدم تحفظ کا احساس انہیں ان مردوں کے قریب لے جاتا ہے۔ اس پسند کا انجام خواہ کچھ بھی ہو۔ لیکن مہک صرف اپنے کام سے کام رکھتی تھی استاد سمجھ کر ان کا احترام کرتی تھی۔ اور استاد صاحب اپنی شاگرد کے گھر میں بیٹھ کر کسی اور کو نہیں لڑکی کی ماں کو تاکتے رہتے ہیں۔ جو عمر میں ان سے کچھ نہیں تو آٹھ دس برس ضرور بڑی ہوگی۔ کئی بار جی میں آیا کہ انہیں خوب جھاڑ پلائے اور کھڑے کھڑے نکال باہر کرے۔ لیکن بیٹی کا لحاظ اپنی عزت کا خیال۔ اپنا پندار مجروح ہونے کا دکھ انہیں کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے روک لیتا۔ پھر اب تو تھوڑے ہی دن کی بات تھی۔ مہک کا امتحان ہوتے ہی ٹیوٹر کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اور یہ سلسلہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ شادی سے پہلے اور آغا صاحب کے انتقال کے بعد بھی انہوں نے کیسے کیسے جتن کئے، اپنی عزت پر آنچ نہیں آنے دی۔ کتنے رشتے ٹھکرائے۔ کاروبار میں نقصان برداشت کیا۔ اپنے جذبات اور فطری تقاضوں کو کچل کر ہر آندھی کا مقابلہ کیا۔ اور جب کشتی حیات کو طوفانوں کی ذد سے بچا کر نکال لائیں۔ ساحل مراد دو چار گام رہ گیا۔ تب یہ شخص میری پاکیزگی اور تقدس کو اپنی گندی نظروں سے داغ دار کرنا چاہتا ہے؟

اس روز مہک کا آخری پرچہ تھا۔ شاہد حسین وقتِ مقررہ سے کچھ پہلے ہی آ گئے۔ پھول بیگم نے انہیں دیکھا تو ناگواری چھپا نہ سکیں۔ رکھائی سے کہا۔

"مہک ابھی نہیں آئی ہے۔ شاید کچھ دیر سے آئے گی۔ آخری دن ہے۔ سہیلیوں سے ملتے جلتے کچھ وقت لگے گا۔"

"جانتا ہوں۔ آج میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مہک کے سامنے بات نہیں ہو سکے گی۔"

"کہیئے" وہ ان کے منہ سے اعتراف گناہ چاہتی تھیں۔

"میں ——— میں آپ کو پسند کرتا ہوں۔ آپ کے ساتھ شادی ——— ان کا

جملہ ادھورا ہی رہ گیا بس چٹاخ، کی آواز ہوئی، دوسرے لمحے شاہد حسین گھر کے باہر تھے۔ پھول بیگم وہیں زمین پر بیٹھ گئیں۔ پھر بچوں کی طرح لوٹ گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''بیگم صاحب۔ بی بی۔ کیا بات ہے۔ سب خیریت ہے نا؟ اس طرح کیوں رو رہی ہیں؟''

شجن حسب معمول دوپہر میں دوکان بند کر کے گھر آیا تھا پھول بیگم کو اس طرح تڑپ تڑپ کر روتے دیکھا تو بے چین ہو گیا۔

''بی بی۔ آپ کو خدا کا واسطہ کیا بات ہے۔ مجھے بتایئے۔ میں ہوں نا؟

شجن نے ایک بار پھر اپنے ہونے کا احساس دلایا۔ اور اس کے لہجہ کا اعتماد انہیں خوش گوار حیرت سے دوچار کر گیا۔

انہوں نے بڑی آس سے اسے دیکھا۔

''میں ہوں نا؟''۔ جیسے سایہ دار چھتنار درخت۔

''میں ہوں نا'' جیسے مر مٹنے کا خاموش وعدہ۔

''شجن! انہوں جیسے دور سے آواز دی۔

اور پھول بیگم کی پکار نیزہ کی انی بن کر اس کے دل میں چبھ گئی اس نے بے اختیار اپنا سر ان کے پاؤں پر رکھ دیا۔

''یہ کمزور لمحہ آج کہاں سے آ گیا؟''—

''بی بی!— یہ نمک خوار تو آپ کے قدموں کی دھول بھی نہیں ہے۔ اسے اپنے قدموں ہی میں رہنے دیجئے۔''

——اور وہ ان سے زیادہ بلک بلک کر رو دیا۔

☆☆

اَن دیکھا ہاتھ

''آتش زنی، قتل، اغوا، لوٹ مار، ڈاکہ''—— یہ سارے واقعات تو اب روزمرّہ کے معمولات میں شامل ہو چکے تھے۔ سارے اخبارات ایسی ہی خبروں سے بھرے رہتے تھے۔ عوام بھی ان باتوں کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ بس اخبار کی سرخیوں پر سرسری نظر ڈال کر اگلی خبر کی طرف بڑھ جاتے تھے۔

اس کی بے چین آنکھیں ایک ایک لفظ اور ایک ایک سطر ٹٹولتیں کے شاید کوئی خوش کُن خبر، زندگی کا احساس جگاتی کوئی خوبصورت بات، کوئی پُر لطف قصّہ، کوئی انوکھی کہانی مل جائے—— لیکن ہر روز وہ مایوس ہو جاتا اور بے دلی سے اخبار پھینک دیتا۔

کل تک ہر جرم اور سازش کو بے نقاب کرنا بے حد آسان تھا۔ لیکن اب اَن دیکھے ہاتھ جرم کرنے کے بعد بڑی صفائی سے غائب ہو جاتے تھے۔ اور قانون کے رکھوالے ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ جاتے۔ ہر روز وہ بڑے غور سے ایک ایک خبر پڑھتا شاید کہیں ان ہاتھوں کی نشاندہی کی گئی ہو۔ کوئی پہچان، کوئی ثبوت، لیکن ہر بار اسے مایوسی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ اس نے اپنے شناسا اور غیر شناسا لوگوں سے سوال کیا۔ لیکن کوئی بھی اسے تسلّی بخش جواب نہ دے سکا۔ پھر ایک ہمدرد نے اس سے رازداری کا وعدہ لے کر بتایا۔

''وہ کوئی عام ہاتھ نہیں ہے کہ جو چاہے اسے پکڑ لے''——

''—— پھر کوئی مخصوص نشانی۔ کوئی انوکھی پہچان؟''

''وہ اضافی انگلی، جو اس سے جرائم کراتی ہے۔''

''اضافی انگلی ـــــ''یعنی چھ انگلیوں والا ہاتھ؟۔

''ہاں بھئی۔ یہ اضافی انگلی ہی تو اصل مجرم ہے۔ پانچ انگلیاں جرم نہیں کرتیں۔''

اس دن سے وہ راستہ چلتے ہوئے۔ بس میں چڑھتے اترتے ـــ سنیما ہال کے اندر اور باہر ـــ ریلوے اسٹیشن کے جمِ غفیر میں ـــ پارکوں کی چہل پہل میں ـــ بازاروں کی رونق میں ـــ ہر جگہ اس کی متجسّس نظریں ایسے ہاتھوں کی تلاش میں بھٹکنے لگیں۔

غضب کی سردی میں وہ بس اسٹاپ پر کھڑا اپنے رُوٹ کی بَس کا انتظار کر رہا تھا۔ ساتھ ہی قریب اور دور کھڑے ہوئے لوگوں کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ اچانک اس کی نظریں کالے چَسٹر والے بلند قامت آدمی پر مرکوز ہو گئیں۔ مفلر سے چہرہ چھپائے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے وہ مضطرب سا ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کا حلیہ بھی قاتلوں جیسا تھا۔ کیا پتہ وہی قاتل ہو۔ اور اپنے ہاتھ چھپانے کے لئے اس نے دستانے چڑھا رکھے ہوں؟۔ یقیناً یہی بات ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کالے چَسٹر والے نے اپنے ہاتھ جیبوں میں پوشیدہ کر لئے۔ شاید اس کی چھٹی حس نے اسے بھی خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ بے خوف و خطر اس کے قریب گیا اور دوسرے پل ـــــ اس کا ہاتھ دستانے میں ملفوف ہاتھ کو گرفت میں لے چکا تھا۔

''چور ـــــ چور'' چَسٹر والے نے گھبرا کر چیخ ماری۔ آس پاس کے لوگ بھی ان کی طرف متوجّہ ہو گئے۔ لیکن اس کی گرفت اور سخت ہو گئی اور وہ قاتل صورت آدمی اپنے چہرے پر جہان بھر کی مظلومیت سجائے مجمع سے فریاد کرنے لگا۔

''لوگو ـــــ صاحبان ـــــ اس نے میری جیب سے پرس اڑانے کی کوشش کی۔ وہ تو کہئے میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ بڑے تمسخر سے ہنسا۔ ''ہاتھ تو اس نے پکڑا تھا۔ اور یہ چَسٹر والا خود کو معصوم ثابت کر رہا ہے۔ ابھی جب سب کے سامنے اس کی اصلیت بے نقاب ہو گی تب پتہ چلے گا کہ یہ کتنا ظالم ہے۔''

''اسے پولیس میں دے دو'' کسی نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

''نہیں۔ ''پہلے خوب جم کر اس کی پٹائی کرو''۔

''ارے چھوڑو بے چارے کو۔تمہاری جیب سلامت ہے تو خواہ مخواہ ——''
کسی نے ہمدردی جتائی۔

''واہ صاحب۔کیسے چھوڑ دیں۔''ایسے تو اس کی ہمت اور بڑھے گی۔کل یہ آپ کی جیب بھی صاف کرسکتا ہے۔''چسٹر والا بلبلا کر بولا۔

''ابے گُم صُم کیا کھڑا ہے۔بابو جی سے معافی مانگ''۔

وہی ہمدرد کہہ رہا تھا۔

''یہ — یہ آدمی قاتل ہے۔مجرم ہے اسی لئے اس نے اپنے ہاتھ دستانے میں چھپا رکھے ہیں۔''

اس نے بڑے اعتماد سے انکشاف کیا۔پبلک سوچ میں پڑ گئی۔

''کیسے معلوم ہوا کہ یہ قاتل ہے''—

''اس کے ہاتھ کی چھ انگلیاں اس کے قاتل ہونے کا ثبوت ہیں''—چسٹر والے نے دستانے اتار دیئے۔

''پاگل معلوم ہوتا ہے۔''لوگ ہنس رہے تھے۔

''پاگل نہیں شرابی ہے سالا——اس کی آنکھیں دیکھو کیسی لال ہو رہی ہیں۔''

——اور ایک پہلوان نما آدمی نے آگے بڑھ کر اسے زور کا دھکا دیا۔وہ لڑھکتا ہوا کئی گز دور جا گرا۔اس کی کہنیاں چھل گئیں۔کپڑے مٹی اور کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے 'وہ قاتل' بس میں چڑھ گیا۔اور بس ایک زناٹے سے اس کے سامنے سے گزر گئی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر رو پڑا۔اور پھر افسردہ سا ایک سمت بڑھ گیا۔اس کے رُوٹ کی بس آئی بھی اور چلی بھی گئی۔لیکن اب وہ آفس جانا نہیں چاہتا تھا۔ چوٹ کھانے کے بعد اس کا عزم کچھ اور پختہ ہو گیا تھا۔اس نے اپنے دل میں اَن دیکھے ہاتھوں کا راز فاش کرنے کا عہد کیا۔اب اس کا من شانت ہو چکا تھا۔کئی دن کی غیر حاضری کے بعد وہ آفس گیا۔ابھی اسے اپنی سیٹ پر بیٹھے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ چپراسی اس کے

سر پر آ کر مسلط ہو گیا۔ اور بدتمیزی سے بولا "بڑے صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔" فلاں فائل لے کر فوراً آجایئے۔"

اسے غصہ تو بہت آیا۔ لیکن پھر صاحب کا خیال آ گیا۔ اور وہ مطلوبہ فائل تلاش کرنے لگا۔ میز کی دراز الماری، ہر جگہ دیکھا لیکن فائل نہ ملی۔ چپراسی پھر آ کر اس کے سر پر سوار ہو گیا۔ وہ سر جھکائے صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ اور نادم سا ایک طرف کھڑا رہا۔ بڑے صاحب نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"فائل لے کر آئے ہو؟ صاحب تو اس کی صورت دیکھ کر ہی چڑ گیا تھا۔

"جی ——وہ تو ملی نہیں—— شاید گھر——"

"وہاٹ؟—— تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟۔ اتنی اہم فائل تم گھر کیوں لے گئے۔ میں بہت دن سے تمہاری حرکتیں نوٹ کر رہا ہوں۔ کئی بار تمہیں وارننگ بھی دے چکا ہوں۔ لیکن تم—— تم——"

بڑے صاحب نے غصّے میں اپنا ہاتھ اٹھا کر اس کی چھاتی کی طرف اشارہ کیا ——اور وہ اُچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ "یہی ہے۔ یہی ہے" وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔ "گیٹ آؤٹ —— آئی سے گیٹ آؤٹ، صاحب دھاڑا۔ چپراسی نے موقع کی نزاکت کا اندازہ کر کے اسے کمرے سے باہر گھسیٹ لیا۔ اور اس کی سیٹ تک لا کر چھوڑ دیا۔ چپراسی حقارت سے کہہ رہا تھا۔

"بابو آج تم چڑھا کر تو نہیں آ گئے؟"

وہ وہاں رکا نہیں باہر نکل گیا۔ پیچھے سے اس کے کسی ساتھی نے آواز دی۔ اور قریب آ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"دفع کر و یار —— یہ بڑا صاحب ایک نمبر کا سور ہے"

ساتھی نے اس سے ہمدردی جتائی"——

"سؤر نہیں قاتل —— وہ قاتل ہے" اس نے سرگوشی کی۔

"کون —— اپنا بڑا صاحب؟۔ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے ——"

ساتھی زور سے ہنسا۔

''اس کا ہاتھ ——— میں نے اس کا ہاتھ دیکھا ہے۔''

بابو نے ہمدردی کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور بڑبڑاتا ہوا اپنی سیٹ پر چلا گیا۔

اس نے آفس جانا چھوڑ دیا۔ دن بھر اِدھر اُدھر مارا۔ مارا پھرتا۔ رات کو کسی ویران گوشے میں تھکن سے چور ہو کر پڑ رہتا۔

ایک صبح اس کی آنکھ کھلی تو حیرت اور خوف کی زیادتی سے وہ گنگ سا ہو گیا۔ راتوں رات قاتلوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ یا اس کے خلاف سب نے مل کر کوئی سازش کی تھی۔ اب ہر ہاتھ میں اضافی انگلی موجود تھی اور ہزاروں لاکھوں قاتلوں کی بھیڑ میں وہ تنہا تھا ——— کل تک وہ ''اَن دیکھے ہاتھوں'' کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ لیکن اب جب کہ ہر فرد قاتل بن گیا تھا۔ وہ ان سے چھپتا پھر رہا تھا۔ اس نے گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ اور ایک کمرے میں محصور ہو کر رہ گیا۔ گھر والے خود ہی اس سے دور ——— دور رہتے تھے ——— متفکر اور پریشان سے چوری چوری اسے دیکھتے اور سرگوشیوں میں باتیں کرتے۔ وہ بھی کب کسی سے مخاطب ہوتا تھا۔ یا تو چھت کو تکتا رہتا یا پھر آنکھیں موندے چپ چاپ پڑا رہتا۔

کئی دن سے اس کے داہنے ہاتھ میں سخت تکلیف تھی انگوٹھے میں درد کی ٹیسیں سی اٹھتی رہتی تھیں۔ اور وہ خوفزدہ سا اپنے ہاتھ سے نظریں چرائے کراہتا رہتا۔ ایک دن اسے انگوٹھے کی جڑ میں تھوڑا سا ابھار نظر آیا۔ دوسرے دن اس ابھار سے ایک اکھوا پھوٹا، اور دیکھتے ہی دیکھتے۔ وہ ننھا سا اکھوا چھوٹا سا انگوٹھا بن گیا۔ بالکل ویسی ہی دو پوریں اور اوپری پور کے سرے پر کچے زخم جیسے رنگ کا ناخن ——— مارے دہشت کے اس کی چیخ نکل گئی۔ گھر والے دوڑ کر اندر آ گئے۔ وہ داہنا ہاتھ پکڑے بری طرح کراہ رہا تھا۔

''کیا بات ہے بیٹا'' ——— ممتا کی ماری ماں اس کی تکلیف محسوس کر کے تڑپ اٹھی ———

''یہ ——— یہ ——— میرا ہاتھ'' ———

''کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ معمولی سا دانہ ہے۔ کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہوگا۔'' ——— بڑے بھائی نے دلاسہ دیا۔

"یہ میرا ہاتھ نہیں ہے۔ یہ قاتل کا ہاتھ ہے میرے جسم پر کسی قاتل کا ہاتھ نہیں رہ سکتا۔"

وہ ہذیانی انداز میں چیخنا — دوسرے پل اس نے قریبی میز سے پھل کاٹنے والی چھری اٹھائی اور انگوٹھے پر ریت دی۔ ایک آسودہ سی سسکاری اس کے ہونٹوں سے باہر آئی۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ اَن دیکھا ہاتھ خود اس کا تھا۔

☆☆

”گیا وقت نہیں ——“

جب پیار اور اَنا کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو زندگی کے دھارے بدل جاتے ہیں۔ یہی ان دونوں کے ساتھ بھی ہوا۔

ونود کئی ماہ سے اس پہاڑی قصبے کے سرکاری اسپتال میں اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس پُرسکون پہاڑی مقام پر گھومتے پھرتے ہوئے وہ اکثر سوچتا کہ جھرنوں کے ترنّم، پھولوں کی شگفتگی اور ہواؤں کی خنکی میں چھایا کے وجود سے مزید اضافہ ہو جاتا — لیکن — اس نے ان پتھریلی، ناہموار راہوں پر چلنا گوارا نہ کیا اور اپنی منزل کے لئے کناڈا کا انتخاب کیا۔ اس نے اپنے وطن کے پس ماندہ دیہاتوں اور دور افتادہ قصبوں میں رہ کر غریب عوام کی خدمت کرنا زندگی کا نصب العین بنایا۔ اسے علم تھا کہ بیرونی ممالک میں مالدار لوگ مہنگے سے مہنگا۔ علاج کرانے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ جب کہ ہندوستان کے پچھتّر اور اسّی فیصدی عوام کو مناسب علاج کی سہولت تک نصیب نہیں ہے۔ چھایا کو اپنا مستقبل عزیز تھا اور ونود کو خدمتِ خلق میں سکون ملتا تھا۔ وہ غریبی کا مزہ چکھ چکا تھا۔ اس لئے ان کے مسائل اور مجبوریوں سے واقف تھا۔ چھایا دولت کی چھاؤں میں پروان چڑھی تھی۔ وہ ان کے دکھ درد کا احساس بھلا کیسے کر سکتی تھی۔ اور طبیعت کے اس تضاد اور خیالات کے نمایاں فرق نے ان کی راہیں جدا کر دیں۔ ونود کو نہ تو کبھی اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑا۔ اور نہ ہی اس نے چھایا کو الزام دیا۔ البتہ وہ چھایا کو بھول نہ سکا اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے آج تک شادی نہیں کی تھی۔ اور خود کو اتنا مصروف کر لیا تھا کہ شادی کے متعلق سوچنے کا وقت ہی

نہیں ملتا تھا۔

میڈیکل میں ونود کا دوسرا سال تھا جب چھایا اس کے قریب آئی یا شاید وہی اس کے قریب گیا تھا۔ بہر حال قربت کے وہ لمحات ایک محنتی، ایماندار اور ذہین طالب علم کے لئے، امنگوں اور حوصلوں کی سوغات لے کر آئے۔ اور ونود نے امتیازی شان سے کامیابی حاصل کی تب چھایا نے اپنے ماتا پتا سے اسے ملوایا۔ ماتا جی تو سیدھی سادی عورت تھیں۔ انہوں نے ونود کو دل سے پسند کیا۔ لیکن اس کے پتا نے ونود کی غربت کو سخت ناپسند کیا۔ وظیفوں کے سہارے پڑھ کر ایم بی بی ایس کرنے والے لڑکے کا بھلا کیا مستقبل ہوسکتا ہے۔؟

کسی چھوٹے سے سرکاری یا غیر سرکاری اسپتال میں ہزار بارہ سو کی ملازمت بس اس سے زیادہ کیا مل سکے گا؟ —— نہ کوٹھی، نہ کار، اور نہ سوسائٹی میں کوئی مقام —— پھر بھلا وہ ان کی نازوں کی پالی بیٹی کے سنہرے مستقبل کی ضمانت کیسے دے سکتا ہے؟ اور انہوں نے شرط رکھی کہ بیاہ کے بعد وہ اور چھایا۔ دونوں ایم ڈی کرنے بیرون ملک جائیں گے اور وہیں سیٹل ہوکر اپنا مستقبل سنواریں۔ ہندوستان میں غربت کے سوا کیا رکھا ہے۔ چھایا نے ونود سے خوش ہوکر کہا۔

''ڈارلنگ! یہ ایک خوبصورت چانس ہے۔ ہمیں اس کو مس نہیں کرنا چاہئے۔''

''تمہارے پتا جی اگر شادی کے لئے یہ شرط نہ رکھتے تو شاید بیاہ کے بعد میں خود بھی بہتر مستقبل کے لئے ایسا ہی کچھ سوچتا۔ لیکن''

اس سے کیا فرق پڑتا ہے ونود؟ —

''بہت زیادہ۔ اس طرح تو مجھے یہ محسوس ہوگا کہ ہماری زندگی، ہمارا مستقبل۔ سب کچھ تمہارے پتا جی کا دیا ہوا ہے ہمارا اپنا کچھ بھی نہیں ہے۔ ہماری زندگی کے بارے میں۔ دوسرے فیصلہ کریں۔ یہ بات مجھے منظور نہیں ہے چھایا''

تم بے جا ضد کر رہے ہو ونود۔ پتا جی ہمارا بھلا چاہتے ہیں — ہمارے خیر خواہ ہیں'' —

''وہ صرف تمہارا بھلا چاہتے ہیں۔ اور ان شرائط اور سودے بازی کے بیچ وہ

ہمارے پریم کو ایک فضول چیز سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے"——

"میں کیا کروں۔تم دونوں کی ضِد بحث میں میرا کیا حشر ہوگا۔"

"کچھ نہیں۔تم اپنے پتا جی کا کہنا مانو اور فارن جا کر، ایم ڈی، کی ڈگری لو۔اور وہیں سیٹل ہو جاؤ۔ایک شاندار مستقبل تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

"تم——؟تم کیا کرو گے ونود؟"——

"میں یہیں سے ایم ڈی کروں گا۔اور یہیں رہ کر غریبوں کی سیوا کروں گا"——

ونود نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"کیا تم میری خاطر——میرے پیار کی خاطر کوئی قربانی نہیں دے سکتے——؟"

"میری جان مانگ لو چھایا۔لیکن میری اَنا اور میری خودداری کی موت نہ مانگو۔ اس کے بنا میری کوئی پہچان نہیں ہے۔کوئی شخصیت نہیں ہے۔اور یہ بات تو تم بھی جانتی ہو کہ میں نے بڑی محنت اور ریاضت سے اپنی شخصیت کو سنوارا ہے۔"

"ہاں میں جانتی ہوں" چھایا کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔اور پھر چھایا ایم ڈی کرنے امریکہ چلی گئی۔ایم ڈی کرنے کے بعد وہ کناڈا میں سیٹل ہوگئی۔جبکہ ونود نے یہیں سے ایم ڈی کیا۔اور قصبوں اور دیہاتوں کے اسپتالوں میں کام کرتا رہا۔

اس دور افتادہ پہاڑی قصبے میں آئے ہوئے ونود کو کئی ماہ ہو چکے تھے۔پچھلے دنوں ڈاکٹر آشا اگروال چھٹی پر چلی گئیں تو ونود پر کام کا بوجھ مزید بڑھ گیا۔سچ تو یہ تھا کہ لیڈی ڈاکٹر کے بغیر کافی مشکل ہوتی تھی۔یہاں کی غریب اور جاہل عورتوں کو فیملی پلاننگ کے متعلق سمجھانا ایک مشکل کام تھا۔مفلسی کے باوجود ہر گھر میں پانچ سات بچّے ہونا عام سی بات تھی۔اور اس کے بعد بھی لیبر روم۔اور زچہ وارڈ میں چہل پہل کا وہی عالم تھا نئی لیڈی ڈاکٹر کے آنے تک ونود کو کسی طرح اسٹاف نرس اور آیا کے ساتھ مل کر کام چلانا تھا۔چھوٹی جگہوں میں کام بہت زیادہ ہوتا ہے۔سخت محنت اور آرام کی کمی کے سبب رات سے ونود کی طبیعت خراب تھی۔وہ ابھی ابھی اسپتال کا راؤنڈ لے کر آیا تھا۔اور اپنے آفس میں ایک آرام کرسی پر نیم دراز سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔آدھے گھنٹے کے آرام کا وقفہ بھی غنیمت

تھا۔ بہادر نے کافی کی ٹرے اس کے قریب اسٹول پر رکھ دی تو وہ چونک پڑا۔

''بہادر —— کافی بنادو'' اس نے آہستہ سے کہا۔

بہادر نے کافی بنا کر دی۔ اور اجازت لے کر چلا گیا۔ کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے اس نے بے حد سکون محسوس کیا۔ اچانک دروازے کا پردہ ہٹا اور کوئی دروازے کے بیچوں بیچ آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ناگواری سے سر اٹھا کر دیکھا۔

میں اندر آ سکتی ہوں؟ —— ڈاکٹر ونود ناگپال؟ —

''یَس کم اِن —— ڈاکٹر'' —— ونود اس کے استقبال کے لئے چند قدم آگے بڑھا —— اور رک گیا۔ وہ چھایا ہی تھی۔ جب وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی تو ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ آرٹسٹ نے چھایا کا قد آدم پورٹریٹ بنا کر دروازے کے فریم میں جڑ دیا ہو۔ جب وہ متحرک ہوئی تو وہ پورٹریٹ۔ گوشت پوست کے نرم و نازک جاندار وجود میں تبدیل ہو گیا۔ چھایا ویسی ہی سرو قد تھی جسم بھی چھریرہ اور متناسب تھا۔ تراشیدہ بالوں کا رنگ سُرخی مائل براؤن تھا۔ بھنویں بھی مہارت سے بنائی گئی تھیں۔ خمیدہ لبوں پر میزون لپ اسٹک کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ ناک کی جڑ سے لبوں کے گوشوں تک دو گہری قوسیں بنی ہوئی تھیں۔ جنہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ عمر کا کارواں — یہاں کافی عرصے قیام کر چکا ہے۔ پیشانی پر دونوں خمدار بھنوؤں کے درمیان ایک موٹی سی لکیر اُبھری ہوئی تھی۔ جو اس کے تجربوں اور مشاہدوں کی ایک طویل کہانی سنا رہی تھی۔ ونود کے جائزے سے گھبرا کر چھایا بول پڑی۔

کیا بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہیں گے ڈاکٹر ناگپال؟''

''تشریف رکھیئے ڈاکٹر — آپ کب آئیں؟''

''کناڈا سے — یا —؟''

''میرا مطلب تھا کہ آپ اپنے وطن کب واپس آئیں''؟

''پچھلے ماہ ہی آئی ہوں۔''

اس نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔

''پورے دس سال کے بعد—؟''

''ہاں'' جیسے دس صدیاں بیت گئی ہوں''—

''کتنی چھٹی لے کر آئی ہیں؟''—

''میں ہمیشہ کے لئے آ گئی ہوں''—

''اوہ''—ونود کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

''کیا آپ کو میرے آنے سے خوشی نہیں ہوئی؟''—

''میری خوشی—ناخوشی کا کیا سوال ہے ڈاکٹر—؟''

اس نے افسردگی سے کہا۔ چھایا مسکراتی رہی—

''پھر اب کیا ارادہ ہے؟'' ونود نے رسمی سا سوال کیا۔

''وہی—جو پہلے تھا''۔ چھایا کا لہجہ کچھ شوخ ہو گیا—

''میں سمجھا نہیں؟''۔

''ونود میں تمہارے لئے واپس آئی ہوں۔ تمہارے آدرشوں میں شریک ہونے آئی ہوں۔ کیا تم نے بھی اب تک میرا انتظار نہیں کیا؟''—

''شاید کیا ہے''—

''لو یہ رہا میرا اپائنٹمنٹ لیٹر—ڈاکٹر آشا اگروال کی جگہ اب میں یہاں کام کروں گی''—

ونود نے کاغذ سمیت اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور چھایا ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے دو موتی بھی ہنس پڑے۔

☆☆

درد سے دوستی

سنگھ صاحب کا شمار خوش نصیب لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی اپنے سارے فرائض ادا کر چکے تھے اور جس عمر میں لوگ ذمّے داریوں کے بوجھ تلے دب کر صبح سے شام تک کولہو کا بیل بنے رہتے ہیں وہ چین کی نیند سوتے تھے ورنہ ایک اَپر ڈویژن کلرک کے جیون میں سکون کہاں؟ ان کی پتنی شوبھا نے بھی قدم قدم پر ان کا ساتھ دیا تھا۔ وہ بہت سُگھڑ، سمجھ دار اور چلن سے چلنے والی ایک ذمّے دار پتنی اور ماں تھی۔ اور پیسہ وہیں خرچ کرتی تھی۔ جہاں اس کی ضرورت محسوس کرتی تھی۔ ان کا رہن ہمن بھی اوسط درجے کا تھا۔ کیونکہ پتی اور پتنی دونوں ہی زمانے کی ریس میں شامل نہیں تھے۔ نہ کسی کی حرص کرتے تھے۔ نہ کسی کا مقابلہ کرنے میں ہلکان ہوتے تھے۔

ورما صاحب کے یہاں نیا صوفہ سیٹ آیا تو پڑوسیوں میں ہلچل مچ گئی۔ ان کی راتوں کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ جب تک ان کے گھر اس سے بہتر صوفہ سیٹ نہیں آ گیا، انہیں چین نہیں آیا۔ ماتھر صاحب نے ٹی وی لیا تو پڑوسیوں میں حسد کی لہر دوڑ گئی۔ ان دنوں بلیک اینڈ وہائٹ ٹی وی نیا نیا آیا تھا۔ اور ماتھر صاحب پہلے خوش نصیب انسان تھے۔۔ جنہیں یہ فخر حاصل ہوا تھا۔ پہلے بچے مارے شوق کے چترہار اور فلم دیکھنے جاتے تھے۔ بچّوں کو بلانے کے بہانے مائیں بھی پروگرام دیکھنے جانے لگیں۔ مسز ماتھر بڑی خندہ پیشانی سے سب کی خاطر مدارات کرتیں۔ لیکن جب ان کے قیمتی کارپٹ پر چائے اور شربت کے داغ نظر آنے لگے اور صوفوں کے پیچھے مونگ پھلی کے چھلکوں کی ڈھیریاں دکھائی دینے لگیں

ساتھ ہی اچھا بھلا صوفہ سیٹ زندگی ہارنے لگا تو ان کا سارا غرور اور خوش مزاجی رخصت ہوگئی۔ بہت سوچنے کے بعد انہیں ایک ترکیب سوجھی۔ وہ پروگرام شروع ہونے سے پہلے اپنا گھر بند کر کے بھائی کے ہاں چلی جاتی تھیں۔ ان کی یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور پڑوسیوں سے جان چھوٹی —— لیکن بچّوں نے ماں باپ کا ناک میں دم کر دیا۔ اور دھیرے دھیرے ہر گھر میں نیا یا پرانا ٹی وی آ گیا۔ صرف سنگھ صاحب کا گھر ایسا تھا۔ جہاں اب تک ٹی وی نہیں آیا تھا۔ اور نہ ہی ان کو اس کی فکر تھی۔ اوّل تو یہ خیال تھا کہ بملا اور گوتم کی پڑھائی کا حرج ہوگا۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ لوگ اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کے قائل تھے۔ اس کا نتیجہ بھی بے حد خوش گوار نکلا۔ بملا کے بی اے کرتے ہی اس کا بیاہ کر دیا۔ گوتم بھی ایم کام کر کے بینک میں ملازم ہو گیا۔ اور اس کا گھر بھی بسا دیا۔ بیٹا اپنی بیوی کو لے کر ملازمت پر سدھارا تو ان دونوں نے بھگوان کا شکر ادا کیا۔ اب نہ کوئی چنتا تھی اور نہ ہی کوئی ذمّے داری۔ جب کہ سنگھ صاحب کے ریٹائرمنٹ میں ابھی دو سال باقی تھے۔ یعنی راوی چین لکھ رہا تھا۔

وہ سویرے حسبِ معمول سیر کرنے جاتے تھے۔ واپس آ کر ناشتہ کرتے اور لنچ باکس لے کر آفس چلے جاتے۔ شوبھا گھر کے کام کاج میں مصروف ہو جاتی۔ وہ دُبلی پتلی لیکن پھرتیلی عورت تھی۔ سنگھ صاحب کا بدن البتہ ذرا بھاری ہو گیا تھا—— لیکن صحت اچھی تھی۔ ان کے بالوں میں بھورا پن ضرور آ گیا تھا۔ اور لکھتے پڑھتے وقت وہ نظر کا چشمہ بھی لگانے لگے تھے۔ یہ سب تو بڑھتی عمر کا تقاضہ تھا جب کہ ان کے ساتھ کام کرے والے ذمّے داریوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ بچوں کی پڑھائی۔ اور شادی بیاہ کی فکر کے ساتھ خریدے گئے گھر کی قسطیں ادا کرتے کرتے وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہو چلے تھے۔ سنگھ صاحب کا گھر پرانا ضرور تھا۔ لیکن اپنا تھا۔ ہر سال دو چار ہزار روپے اس کی دیکھ بھال پر خرچ ہو جاتے تھے۔ تو کیا ہوا مکان کی زندگی بھی کچھ اور بڑھ جاتی تھی۔ اور یہ سودا برا نہیں تھا۔

ایک صبح —— وہ سو کر اٹھے تو داہنے کاندھے میں کچھ تکلیف محسوس ہوئی۔ شاید دہنی کروٹ سونے کی وجہ سے ہاتھ دب گیا تھا۔ انہوں نے کوئی خاص فکر نہیں کی اور آفس چلے

گئے۔لیکن سارا دن رہ رہ کر کاندھے میں ٹیسیں سی اٹھتی رہیں۔سوچا تھا کہ معمولی سا درد ہے خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔مگر ایسا نہیں ہوا۔اور کئی دن تک درد سے آرام نہیں ملا۔تب انہوں نے گھر میں رکھی دھری دوائیں آزمانے کا فیصلہ کیا۔شوبھا نے انہیں دوا کی شیشیاں ادھر ادھر کرتے دیکھا تو پوچھا۔

''آپ کیا ڈھونڈھ رہے ہیں۔؟''

اسے بے ترتیبی پسند نہیں تھی۔

''کوئی بام وغیرہ ہوگا؟''شرما کر پوچھا۔

''بام کیا کریں گے؟''

''کئی دن سے ہاتھ میں درد ہو رہا ہے''۔بتایا—

''کہاں؟''—

''داہنے کاندھے میں''—

''آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا۔خواہ مخواہ درد کو بڑھاتے رہے۔اس نے شکوہ کیا اور الماری سے بام کا ٹیوب نکال کر کہا۔

''آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔اور شرٹ اتار دیں۔میں بام لگائے دیتی ہوں۔ ذرا دیر میں آرام آجائے گا۔''—

سنگھ صاحب نے شرٹ اتار دی۔شوبھا نے انگلیوں پر بام لے کر کاندھے پر ملنا شروع کیا۔اور ان سے درد کی جگہ پوچھ کر اوپر نیچے—داہنے بائیں بام ملتی رہی۔پہلے تو انہیں ایسا لگا جیسے کسی نے مرچیں تھوپ دی ہوں—عجیب سی جلن اور سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ رفتہ رفتہ ٹھنڈک سی پڑنے لگی۔اور درد میں بھی آرام ملا—بام نے جادوئی اثر کیا تھا۔۔۔۔ لیکن یہ آرام بس وقتی تھی۔جب تک بام کا اثر رہتا،درد میں بھی کمی رہتی۔جب بام کا اثر ختم ہو جاتا تو تکلیف بڑھ جاتی۔چند روز میں یہ حال ہو گیا کہ درد کاندھے سے لے کر پشت کے ایک بڑے حصے تک پھیل گیا۔مجبوراً انہوں نے ڈاکٹر کو دکھایا۔ڈاکٹر نے کھانے کے لئے دوائیں دیں۔ایک ٹیوب لگانے کے واسطے دیا۔اور لاہوری نمک سے سینکنے کی ہدایت دی۔

ایک ہفتے کے بعد دوبارہ دکھانے کے لئے کہا۔

سنگھ صاحب کو ذرا اطمینان ہوا کہ باقاعدگی سے علاج ہوگا تو ہفتہ عشرہ میں درد سے نجات مل جائے گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ڈاکٹر کو دوبارہ دکھایا تو اس نے بھی — اطمینان ظاہر کیا۔ اور مزید ایک ہفتے دوائیں استعمال کرنے کو کہا۔ دو ہفتے کے علاج کے بعد سنگھ صاحب نے دوا کھانا بند کردی اور معمول کے مطابق فرائض انجام دینے لگے۔ کئی سو روپئے خرچ ہو گئے تھے۔ لیکن تکلیف ختم ہوگئی تھی شوبھا نے بھگوان کا شکر ادا کیا۔ وہ ان کی طرف سے بہت فکرمند رہنے لگی تھی۔ لیکن شاید درد کو بھی سنگھ صاحب کی لاپرواہی کا انتظار تھا۔ پہلے ہلکا، ہلکا درد شروع ہوا، دھیرے دھیرے بڑھنے لگا۔ شوبھا پریشان ہوگئی۔ ''کیا درد ہو رہا ہے؟۔ دریافت کیا۔

''ہاں۔ بہت زیادہ۔ لگتا ہے کاندھے کی ہڈی چٹخی جارہی ہے۔ اس بار تکلیف برداشت سے باہر ہوگئی ہے۔''

سنگھ صاحب نے ضبط کرنے کی کوشش کی، لیکن پھر بھی سِکاری نکل گئی۔ شوبھا نے کہا۔

''میری مانئے تو اسپتال میں دکھا دیجئے۔ یہ ڈاکٹر تو بس لُوٹتے ہیں۔ مریض مرے یا جیئے ان کی بلا سے''۔

''ہاسپٹل میں وقت بہت خراب ہوتا ہے۔ لاپرواہی الگ ہوتی ہے۔ مہینوں میں جاکر آرام ملے گا۔ یا وہ بھی نہیں۔''

سنگھ صاحب اسپتال سے بہت گھبراتے تھے۔

''آپ لمب سنٹر میں دکھا دیجئے۔'' مشورہ دیا۔

''وہیں جہاں مصنوعی ہاتھ پاؤں لگائے جاتے ہیں؟''

''علاج بھی کیا جاتا ہے۔ مسز پوار کا درد وہیں کے علاج سے ٹھیک ہوا تھا —'' شوبھا نے بتایا۔

''تم کہتی ہو تو وہیں دکھا لیتے ہیں۔''

"آپ ذرا نہ گھبرائیں۔ میں خود آپ کے ساتھ چلوں گی"

شوبھا نے تسلّی دی۔ سنگھ صاحب بہ مجبوری رضامند ہو گئے۔ دوسرے دن دونوں لمب سنٹر گئے۔ پہلے پرچہ بنوایا۔ پھر ڈاکٹر کے کمرے کے سامنے بنے ہوئے بڑے سے ہال میں دوسرے مریضوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ مریضوں کی تعداد دیکھ کر ان کا منہ بن گیا۔ سوچا کہ دو گھنٹے سے پہلے ان کا نمبر نہیں آئے گا۔ وارڈ بوائے نے سارے مریضوں سے پرچے لے کر ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھ دیئے۔ سنگھ صاحب کا نمبر آیا تو وہ ڈاکٹر کے کمرے میں گئے۔ بڑے ڈاکٹر نے ان کا حال سنا پھر جونیئر ڈاکٹر سے انگریزی میں کچھ کہا۔ جوان کے پلّے نہیں پڑا —— جونیئر ڈاکٹر نے ان کا ہاتھ اوپر نیچے کیا۔ پھر داہنے بائیں حرکت دی۔ لیکن جب اس نے ان کا ہاتھ پشت کی طرف موڑا تو ان کی چیخ نکل گئی۔ پھر بڑے ڈاکٹر نے کاندھا دبا کر دیکھا۔ اور نسخہ لکھ کر ان کے حوالے کر دیا۔ کہا

"یہ دوائیں آپ بازار سے خرید لیں۔ یہاں روز آ کر آپ کو سِنکائی کرانا ہوگی۔ اور کچھ ضروری ورزشیں بھی کرنا ہوں گی۔ یہ ٹریٹ منٹ آج ہی سے شروع کر دیں"۔

سنگھ صاحب وارڈ بوائے کی رہنمائی میں ایک کشادہ کمرے میں گئے۔ یہاں اور لوگ بھی موجود تھے۔ اور مختلف طریقوں سے ان کی سنکائی کی جا رہی تھی۔ کوئی پشت کے بل بیڈ پر لیٹا تھا۔ کوئی کرسی پر نیم دراز تھا۔ آیا نے انہیں بھی ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ قریب ایک حوض نما برتن میں پانی بھرا تھا۔ جو بجلی کے ذریعے کھول رہا تھا۔ اور اس چھوٹے سے جستے کے حوض میں موٹے موٹے پیڈ پڑے تھے۔ آیا نے پلائر کی مدد سے ایک پیڈ نکالا۔ اور اسے ایک صاف موٹے کپڑے کی کئی تہوں میں لپیٹ دیا۔ پھر اس کو ان کے کاندھے پر رکھ دیا شوبھا پاس ہی کھڑی تھی اس سے کہا۔ "آپ اس پیڈ کو درد کی جگہ رکھ کر ذرا سا دبایئے۔ پھر اسے اوپر نیچے کرتی جایئے۔ جب یہ پیڈ ٹھنڈا ہو تو کپڑے کی ایک تہہ کھول دیجئے گا۔ تاکہ اندر سے گرم پیڈ نکل آئے۔ اور سینک پہنچتی رہے۔"

آیا دوسرے مریض کی طرف متوجہ ہو گئی۔ شوبھا اس کی ہدایت کے مطابق سنگھ صاحب کے کاندھے اور پشت کی سنکائی کرتی رہی۔ انہیں بہت آرام مل رہا تھا۔ تقریباً آدھا

گھنٹہ سِنکائی کرنے کے بعد وہ ساتھ والے دوسرے کمرے میں گئے۔ یہاں ورزش کے آلات رکھے تھے۔ ڈیوٹی پر موجود فزیوتھر پیسٹ نے نسخے کے مطابق ان سے مختلف ورزشیں کرائیں۔ انہیں یہ دیکھ کر بڑی ہنسی آئی کہ ایک سوٹیڈ بوٹیڈ ادھیڑ عمر کے صاحب سائیکل چلا رہے ہیں۔ سائیکل ایک جگہ فرش میں نصب تھی۔ اور وہ صاحب بڑے انہماک سے سائیکل کے پیڈل پر پاؤں مار رہے تھے ایک نوجوان دیوار میں نصب پہیّہ گھما رہا تھا۔ ایک اور صاحب لکڑی کے پلر پر بیلن جیسی ایک چیز اوپر سے نیچے لے جا رہے تھے۔ ان سے بھی وہی متھنے جیسا عمل کرایا گیا۔ اور موٹی سی رسّی کو پکڑ کر دونوں ہاتھوں سے کھینچنا پڑا۔ پھر پہیّہ چلوایا گیا۔ پچیس تیس منٹ کی ورزش کے بعد انہیں چھٹّی دے دی گئی۔ اب وہ دوائیں استعمال کرنے کے ساتھ روزانہ لمب سنٹر جانے لگے۔ سنکائی اور ورزش کا عمل جاری رہا۔

انہوں نے آفس سے چار دن کی چھٹّی لی تھی۔ چھٹّی ختم ہوگئی تو انہوں نے آفس جانا شروع کر دیا۔ اب تک روز شوبھا ان کے ساتھ جاتی تھی۔ لیکن جب وہ وہیں سے آفس جانے لگے تو شوبھا کو منع کر دیا۔ اور تنہا ہی لمب سنٹر جانے لگے۔ تین ہفتے کے علاج کے بعد ان کی تکلیف بالکل ختم ہوگئی اور درد سے نجات ملی۔ اب وہ پہلے کی طرح سویرے ٹہلنے جاتے پھر ناشتہ کر کے آفس چلے جاتے۔ سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ لیکن شاید ایسا نہیں تھا۔ انہیں اپنی زندگی میں ایک 'کمی' کا احساس ہونے لگا تھا۔ جیسے کچھ گُم ہو گیا ہو۔ کھو گیا ہو۔ کیا کھو گیا تھا۔ کیا گُم ہو گیا تھا۔ یہ ان کی خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ شوبھا نے بھی ان کی اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ پوچھا—

''کیا بات ہے۔ کوئی پریشانی ہے، درد، ورد تو نہیں ہو رہا ہے؟''—

اس کے لہجے میں تشویش پائی جاتی تھی۔ انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''پھر کیا بات ہے۔ آپ چپ چپ کیوں رہتے ہیں؟''—

سنگھ صاحب نے بیوی کی تسلّی کے لئے اپنا ہاتھ اوپر نیچے کیا۔ پھر اسے پشت کی طرف لے گئے۔ لیکن درد کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اَب وہ اسے کیسے سمجھاتے کہ اُنہیں اپنی ذات کچھ ادھوری سی لگتی ہے۔ ہر وقت ایک خلاء سا محسوس ہوتا ہے۔ بظاہر زندگی کے

معمولات وہی تھے۔ پھر بھی بہت کچھ نہیں تھا۔

ایک صبح وہ سو کر اٹھے تو داہنا کاندھا درد کر رہا تھا۔ انہوں نے بائیں ہاتھ سے اپنا کاندھا دبایا — اور سکون کی سانس لے کر بستر سے نیچے اترے۔

یہی تو تھا جو گم ہو گیا تھا — یہ درد جو مہینوں ان کا رفیق رہا تھا۔ اور وہ اس درد کے ساتھ زندگی جینے کے عادی ہو گئے تھے۔ درد ختم ہوا تو کچھ کھونے کا احساس بڑھ گیا۔ ہر پل، ہر لمحہ انہیں اسی کا خیال رہا تھا۔ ''کم ہو گیا ہے — بڑھ گیا ہے۔ اس کروٹ لیٹنے سے آرام ملتا ہے۔ اس کروٹ لیٹیں تو تکلیف بڑھ جاتی ہے —— ہے — نہیں ہے —— درد کی رفاقت کا اپنا ایک مزہ تھا۔

انہوں نے بہت لہک کر شوبھا کو پکارا۔ وہ ساڑی کے پلّو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کچن سے باہر آئی۔ پوچھا — ''کیا بات ہے؟'' —

''آج پھر درد ہو رہا ہے'' بتایا۔ جیسے کوئی خوشخبری سنا رہے ہوں''

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے دن کے بعد دوبارہ کیسے ——؟''

''آپ آج ہی لمب سینٹر چلے جایئے'' —— مشورہ دیا۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے؟۔ کسی دن چلے جائیں گے'' —

لاپرواہی سے کہہ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئے۔ ان کے دل میں ڈھیروں سکون اُتر آیا تھا —— اور ہونٹوں سے لذّت میں ڈوبی کراہیں نکل رہی تھیں۔ درد بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن پرانی دوستی کے 'ناطے' بھی تو اتنے کمزور نہیں تھے کہ وہ اسے فوراً بھگانے کے بارے میں سوچتے کچھ دن اس کے ساتھ جی لینے میں کیا حرج تھا''۔

ڈھلتی عمر میں بعض رفاقتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اگر نہ ہوں تو زندگی میں کوئی کشش نہ رہے۔ اور وہ اس درد کے ساتھ جینے کے لئے دل و جان سے تیار تھے۔ دوستی جو ٹھہری!

☆☆

جذبوں کی رہ گذر

پھول پور کے چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو وہ اپنا سوٹ کیس اٹھائے ڈبے سے اترا۔ پلیٹ فارم پہلے جیسا ہی تھا۔ لوہے کی دونوں بنچیں زنگ آلود ہو چکی تھیں اور اسٹیشن ماسٹر کا اکلوتا کمرہ اور زیادہ بدرنگ اور پرانا ہو گیا تھا۔ یعنی اس کے گاؤں کے لئے ترقی کے نام پر سرکاری نظرِ عنایت کا شبہ کرنے کے لئے کچھ نہیں کیا گیا تھا۔ راستے میں جو بجلی کے کھمبے کھڑے نظر آتے تھے ان پر تار تک نہیں کھنچے تھے۔ یعنی اس کا گاؤں اب تک بجلی سے محروم تھا۔ شاید سال دو سال میں یہاں بجلی۔ پہنچ جائے اور اس کا گاؤں جگمگا اُٹھے۔۔۔

وہ اسٹیشن سے باہر آیا تو مریل گھوڑے والا ایک یکہ کھڑا تھا۔ یکہ بان لپک کر اس کے قریب آیا اور اس کا سوٹ کیس تھام لیا۔

''بھیّا۔۔۔ کہاں جانا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''سیّدوں کی حویلی'' جواب دیا۔

''یکہ بان نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا، اور ایک دم چیخ پڑا''

''بھیّا آپ۔ جمّی میاں؟''

اب اس نے بھی یکہ بان کو غور سے دیکھا۔

''ارے رمضان بھائی؟''۔

رمضان نے سوٹ کیس ہاتھ سے رکھا اور اسے لپٹا لیا۔

''میاں بہت دن کے بعد گھر کی یاد آئی؟''۔۔۔

رمضان نے شکوہ کیا۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔

''بس کیا کریں بھائی۔ پردیس کی مجبوریاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ کئی بار ارادہ کیا لیکن آ نہیں سکے۔'' آہستہ سے کہا۔ ''اچھا— آؤ میاں گھر چلو۔''

رمضان نے سوٹ کیس یکے پر رکھ لیا۔ وہ بھی بیٹھ گیا یکہ آگے روانہ ہو گیا۔

گاؤں میں سب خیریت ہے؟''۔

''کیسی خیریت میاں؟ کبھی سیلاب کبھی سوکھا۔ یہاں تو سب یہی چلتا ہے۔ اللہ جس حال میں رکھے۔''

رمضان نے ٹھنڈی سانس لی۔ جمال نے سوچا ''گاؤں میں ترقی بھلے نہ ہوئی ہو — مادّی آسائشوں نے شہروں کو جن برائیوں میں ملوث کر لیا ہے — وہ ابھی یہاں نہیں پہنچیں۔ خلوص، محبت، اپنائیت اور قناعت جیسی قیمتی دولت سے اس کا گاؤں اب بھی مالا مال ہے۔ راستے میں ہرے بھرے کھیت، آم اور امرود کے باغ، کنویں، زہٹ اور پرانی نہر ایک ایک کر کے گزرتے رہے۔ حتّٰی کہ حویلی آ گئی۔ اس نے ایک نظر احاطے کے بڑے پھاٹک پر ڈالی۔ یکہ اندر جا کر برآمدے کے سامنے رک گیا۔ رمضان نے سوٹ کیس برآمدے میں رکھ دیا۔ جمال نے اتر کر جیب سے پرس نکالا۔ اور دس کا نوٹ رمضان کی طرف بڑھایا تو وہ چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔

''یہ کیا جمی میاں؟ اب تم اس عمر میں ہمیں شرمندہ کرو گے؟'' اس نے شکوہ کیا۔

''—— لیکن رمضان بھائی ——''

''کچھ نہیں۔ اب خیر سے اندر جاؤ۔ پھر ملیں گے'' —

رمضان نے گھوڑے کی راس پکڑی اور باہر نکل گیا۔

جمال سوٹ کیس اٹھا کر اندر بڑھ گئے۔

آج کوئی ملازم ان کا سوٹ کیس اٹھانے کے لئے موجود نہیں تھا۔ البتہ حویلی کی ظاہری حالت پہلے سے بہتر نظر آ رہی تھی۔ صحن پار کر کے وہ دالان کی طرف بڑھا۔ آواز دی۔ ''بھائی جان؟۔ کوئی ہے؟''

ایک کمرے سے جو خاتون باہر آئیں انہیں دیکھ کر وہ جذباتی ہو گیا۔ سوٹ کیس رکھ کر ان کی طرف لپکا۔

''بھابھی جان۔ بھابھی جان۔ میں جمال''— گلے میں آنسوؤں کا پھندہ سا لگ گیا۔ اور وہ ان سے لپٹ گیا۔

''ارے جمال میاں— اچانک— نہ کوئی اطلاع نہ خبر''۔

انہوں نے اسے ننھے بچے کی مانند بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اور چھکوں پھکوں رونے لگیں۔ ان کے رونے کی آواز سن کر کمرے سے اٹھارہ انیس برس کی ایک لڑکی باہر آ گئی اور حیرت سے یہ منظر دیکھنے لگی۔ جذبات کا چڑھا ہوا دریا اترا تو جمال نے لڑکی کو دیکھا۔ بھابھی جان نے مسکرا کر کہا۔

''یہ سجیلہ ہے۔ سجیلہ چچا جان کو سلام کرو''—

سجیلہ نے سلام کیا تو جمال نے اسے سینے سے لگا لیا۔

''یہ ماشاء اللہ اتنی بڑی ہو گئی؟ حیرت سے کہا۔ تو سجیلہ شرما گئی۔ بھابھی جان کو ہنسی آ گئی۔

''جب تم گئے ہو تو یہ چار سال کی تھی۔ اب بارسال کے بعد آئے ہو۔ حساب لگا لو کتنے موسم بیت گئے۔

''واقعی بھابھی جان! سچ کہا آپ نے بہت وقت بیت گیا۔ چھوٹے اور ننھے کہاں ہیں؟'' سوال کیا۔

''نبیل لندن میں ڈاکٹری پڑھ رہا ہے۔ اور سہیل علی گڑھ میں انجینئرنگ کا کورس کر رہا ہے۔ کبھی شمیل سے بھی ملاقات ہوتی ہے؟''۔

بھابھی جان نے بڑے بیٹے کے بارے میں پوچھا۔ تو جمال نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''بڑے ملکوں کی بڑی باتیں۔ بھیّا کون کس کی خبر لے۔ سب اپنے میں مست ہیں۔'' دکھ سے کہا۔

''بھائی جان کہاں ہیں؟''۔

''وہ تو کچہری گئے ہیں۔ آج پیشی تھی۔ آتے ہوں گے۔ تم ہاتھ منہ دھولو۔ دل چاہے نہاڈالو''۔ مشورہ دیا۔

سجیلہ شربت کا گلاس لے آئی۔ بولی۔

''چچا جان۔ آپ پہلے شربت پی لیں۔ پھر میں کھانا لگادوں گی۔ تب تک ابو بھی آجائیں گے۔''

جمال نے گلاس تھام لیا۔ محبت سے پوچھا۔

''تم کیا کر رہی ہو۔ کس کلاس میں ہو؟''۔

''ہائی اسکول کا امتحان دیا ہے۔ رزلٹ آجائے تو آگے کا سوچوں گی''۔ سجیلہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''شاباش۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم سب تعلیم میں دلچسپی رکھتے ہو۔ خوب پڑھو''۔

جمال نے گلاس اسے تھمادیا۔ اور سوٹ کیس سے کپڑے نکالنے لگا۔

دسترخوان پر کمال میاں بھی موجود تھے۔ اور جمال سے اس کے بارے میں پوچھ رہے تھے — وہ مناسب جواب دے رہا تھا۔ کمال میاں نے کہا۔

''اپنا بیٹا تو سخت نالائق نکلا۔ سنا ہے امریکہ میں اچھے پیسے کمارہا ہے۔ شادی بھی کرلی ہے۔ لیکن گھر کا اسے بھول کر بھی خیال نہیں آتا۔ اگر تم نے ہمارا ساتھ نہ دیا ہوتا تو سب بچے جاہل رہ جاتے۔ فصل کا کچھ ٹھیک نہیں رہتا مقدمے الگ گلے پڑے ہیں۔ پٹواری نے خاں صاحب سے پیسہ کھا کر ہماری کافی زمین ان کے نام کردی ہے۔ وہی جو ان کے کھیت سے ملی ہوئی تھی۔''

''زمین کے بھی عجیب معاملات رہتے ہیں۔ آپ نے جب خاں صاحب کے ہاتھ زمین بیچنے سے انکار کردیا تو انہوں نے یہ چال چلی۔ خیر اللہ مالک ہے۔'' جمال نے تسلی دی۔

''ہاں میاں — اللہ ہی مالک ہے''—

کمال میاں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ پہلے ہی اپنی پلیٹ کھسکا چکا تھا۔

سیّدوں کی حویلی پھول پور کی شان تھی — میلوں تک پھیلے ہوئے کھیت۔ آم،

امرود اور کٹھل کے باغات جن کے کنارے شیشم کے درخت لگے تھے — جو زیادہ پرانے ہو جاتے تھے — کٹوا کر لکڑی فروخت کر دی جاتی تھی — گھر کا فرنیچر اور ضروری سامان بھی شیشم کی لکڑی سے ہی بنایا جاتا تھا — باغوں کی فصل اچھے داموں فروخت ہوتی تھی۔ لیکن خاتمہ زمین داری نے بڑے بڑے زمینداروں کی کمر توڑ دی۔ سیّد صاحب اس صدمے سے بتاشے کی طرح بیٹھ گئے۔ کمال اور جمال — دونوں کمسن تھے — سیدانی نے پرانے منشی اور ملازموں کی مدد سے کسی طرح معاملات سنبھالے — تھوڑے کھیت اور باغ بچ گئے تھے۔ کئی باغ مقدمے بازی کی نذر ہو گئے۔ سیّدوں کی حویلی کی رونق بھی ختم ہو گئی۔ سیدانی کا انتقال ہوا تو کمال سولہ برس کے تھے۔ اور جمال دس سال کا تھا۔ کمال میاں کی پڑھائی چھوٹ گئی۔ وہ زمین اور باغات کے معاملات دیکھنے لگے۔ جمال گاؤں کے اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ انہیں دنوں اس کی دوستی سراج سے ہو گئی۔ وہ اکثر اس کے ساتھ اس کے گھر چلا جاتا تھا۔ سراج کی امّی اور آپا اس کا بہت خیال کرتی تھیں۔ چھوٹی بہن شمائلہ بہت نٹ کھٹ تھی۔ جمال سے تو اس کو خدا واسطے کا بیر تھا۔ لیکن اس لڑائی میں بھی بڑا مزہ آتا تھا۔ امّی اور آپا ہمیشہ جمال کی طرف سے اس کو ڈانٹتی تھیں۔ دراصل وہ لوگ سیّدوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ خود وہ لوگ شیخ تھے۔ بچے یہ سب کہاں مانتے تھے۔ نہ جمال کو اپنے سیّد ہونے کا غرور تھا — نہ شمائلہ اس کا رعب مانتی تھی — شمائلہ اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کی شرارتوں کا برا نہیں مانتا تھا۔ دوپہر میں جب گاؤں کے سب لوگ گھروں میں دبکے ہوتے تھے۔ وہ سراج اور شمائلہ کھیتوں اور باغوں میں گھومتے رہتے تھے — آم کی فصل ہوتی تو ان کے مزے آجاتے تھے۔ اپنا باغ چھوڑ کر وہ سب ہمیشہ خان صاحب کے باغ پر دھاوا مارتے تھے — کچے پکے آم توڑ کر بلکہ جھوڑ کر انہیں بہت مزہ آتا تھا۔ باغ کا رکھوالا بھی دوپہر میں اپنی جھونپڑی میں پڑا خراٹے لیتا رہتا تھا۔ اور ان کی بن آتی تھی۔ ایک دن خان صاحب کا لڑکا مراد خان ادھر آنکلا۔ اور وہ لوگ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ مراد خان ایک نمبر کا اکھڑ۔ تند خُو۔ اور غصّے ور تھا۔ وہ ان تینوں کو اپنے باپ کے پاس لے گیا۔ خان صاحب ٹھہرے اصل نسل کے پٹھان اب جو انہوں نے اپنے باغ کے آموں کا حشر

دیکھا تو ان کے پٹھانی خون میں ابال آ گیا انہوں نے جمال اور سراج کو مُرغا بنا دیا۔ شائلہ سے البتہ رعایت کی۔ بس اسے کان پکڑ کر کونے میں کھڑا کر دیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کسی نے ان کی بیوی کو خبر کر دی۔ اور وہ فوراً ان کی مدد کو آ گئیں۔ شوہر اور بیٹے کو خوب ملامت کی۔ بچوں کی جان سزا سے چھوٹی تو بکٹٹ گھر کی طرف بھاگے۔ دوسرے دن وہ تینوں پھر خان صاحب کے باغ میں موجود تھے۔ اور انتقاماً روز سے زیادہ آم توڑنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ لیکن مراد خان بھی کم نہیں تھا۔ ان کے انتظار میں رکھوالے کی جھونپڑی میں چھپا بیٹھا تھا۔ ابھی ان لوگوں نے کسی پیڑ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا کہ مراد خان سامنے آ گیا۔ آج اس کے ہاتھ میں لاٹھی بھی تھی جو وہ رکھوالے سے لایا تھا۔ اسے دیکھ کر شائلہ نے بے خوفی سے کہا۔

''مراد خان۔ تمہارے باغ کے آم ہمیں بہت اچھے لگتے ہیں''

''اسی لئے چوری کرتی ہو؟''— مراد خان نے تپ کر کہا—

''کیا کریں اگر چوری نہ کریں تم تو دیتے نہیں ہو''—

——اور مراد خان کو اس کے بھولے پن پر ہنسی آ گئی—

اس نے اپنے ہاتھ سے آم توڑ کر سب کو دئے لیکن تاکید کی کہ آئندہ چوری نہ کرنا۔ مراد خان ان سے بڑا تھا۔ پھر بھی ان کی دوستی ہو گئی۔ کیونکہ انہیں تو اس کے باغ کے آم کھانے سے مطلب تھا۔

وقت کچھ اور آگے بڑھا۔ کمال میاں کی شادی ہو گئی۔ اور بھابھی جان بیاہ کر سیّدوں کی حویلی میں آ گئیں۔ ان سے دور کی رشتے داری بھی تھی۔ اور یہ نسبت سیدانی نے اپنی زندگی میں ہی طے کر دی تھی۔ جمال، بھائی کی شادی سے بہت خوش تھا۔ ہر دم بھابھی کے آگے پیچھے گھومتا رہتا تھا۔ چند دن تو نئی بھابھی نے اس کے لاڈ کئے۔ پھر انہیں اس سے الجھن ہونے لگی۔ اور وہ بہانے بہانے اس سے دور ہونے لگیں۔ جمال نے بھی محسوس کیا کہ وہ اسے منہ نہیں لگانا چاہتیں۔ اسے دکھ تو ہوا۔ لیکن وہ خود بھی ان سے دور ہوتا گیا۔

اس روز وہ کافی عرصے کے بعد سراج کے گھر گیا تھا۔ اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر آپا نے بہت دلجوئی کی تو وہ بھی کھُل گیا اور بھابھی کی شکایت کر دی۔ شائلہ نے ہنس کر کہا۔

"بدھو میاں — اگر بھابھی جان تمہیں نہ بھگاتیں تو ہمارے گھر نہ آتے۔ سچی — میں تو بہت خوش ہوں"۔

جمال شرمندہ ہوگیا — اور ایک بار پھر سب دوست اکٹھا ہوگئے۔ وہ روز اسکول سے آکر سراج کے گھر چلا جاتا تھا۔ گھر میں کم ہی ٹکتا تھا۔ لیکن بھابھی کو یہ بھی پسند نہیں تھا۔ انہوں نے کئی بار کمال میاں سے اس کی شکایت کی اور انہوں نے اس کی سرزنش بھی کی۔ جس کا اسے بہت دکھ ہوا۔ بھابھی کو اس کے اخراجات بہت کھلتے تھے۔ وہ ہر وقت اسے مفت کی روٹیاں توڑنے کے طعنے دیتی تھیں۔ اوپر تلے ان کے تین بیٹے پھر ایک بیٹی ہوگئی۔ اب انہیں جمال کا وجود اور زیادہ کھٹکنے لگا۔ حالانکہ جمال بچّوں کو بہت چاہتا تھا۔ لیکن اس کی چاہت کا بھابھی پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو بھی اس سے دور رکھتی تھیں۔ جمال میں کوئی بری عادت نہیں تھی۔ پڑھنے میں بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ بس اس کی میتھس ذرا کمزور تھی۔ اس نے بھائی سے ٹیوشن لگوانے کے لئے کہا تو ان سے پہلے بھابھی بول پڑیں۔

"ابھی تمہارا خرچہ کیا کم ہے۔ جو ٹیوشن کا خرچ بڑھایا جائے۔ ہمارے اپنے بہت سے خرچ پورے نہیں ہو رہیں" —

کمال چپ رہے۔ جمال ان کی صورت دیکھ رہا تھا کہ شاید بھائی کچھ بولے۔ لیکن وہ بیوی سے الجھنے کی ہمت نہ کر سکے۔ اور جمال چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔ جیسے تیسے گاؤں کے اسکول سے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد اس نے شہر جا کر پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور یہ بات ایسی تھی کہ بھابھی نے آفت مچادی۔ اسی دن اس نے چپ چاپ گھر چھوڑ دیا۔ کہاں کہاں بھٹکا کیسے پڑھائی مکمّل کی۔ اور اب وہ کئی برس سے امریکہ میں جاب کر رہا تھا۔ بھائی کی کمزوری اور بھابھی کی زیادتیوں کو بھول کر وہ ہر ماہ انہیں اچھی خاصی رقم بھیجتا رہا۔ سراج سے اس کی خط و کتابت تھی۔ جس سے سارے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ ہر چند وہ شائلہ کو براہِ راست خط نہیں لکھتا تھا لیکن وہ اس سے غافل بھی نہیں تھا۔ ایک بار سراج نے رواروی میں لکھ دیا کہ شائلہ آنے والے ہر رشتے سے انکار کر دیتی ہے وہ شہر میں رہ کر پڑھ رہی ہے۔ بس کسی لمبی تعطیل میں ہی گھر آتی ہے —

رات کے کھانے کے بعد سب کے پلنگ وسیع صحن میں بچھائے گئے۔ جمال سونے پر لیٹا تو دیر تک نیند نہیں آئی۔ اس نے اگلے روز سراج سے ملنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ذرا فاصلے پر کمال میاں اور بھابھی جان کے پلنگ بچھے تھے۔ باتوں کی آواز نے اس کی توجہ مبذول کرلی۔ بھائی کہہ رہے تھے—

"جمال اتنے عرصے کے بعد گھر آیا ہے۔ اس نے آج تک اپنے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کے مستقبل کے متعلق جلد کوئی فیصلہ کریں۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"۔

اس کی شادی کے بارے میں ہمیں ہی سوچنا ہے۔ اب کا گیا خدا جانے کب آئے" بھائی جان نے کہا۔

"کیا آپ کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے جارہے ہیں؟"—

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"—

اگر آپ نے اس کی شادی کردی تو کیا وہ ہمیں کبھی کوئی رقم بھیجے گا— ہرگز نہیں۔ ہمارے بچوں کی تعلیم۔ اور سب سے بڑھ کر جمیلہ کی شادی کا کیا ہوگا؟۔

"اس نے آج تک جو کیا ہے وہی بہت ہے۔ جو فرض تمہارے بیٹے کا تھا۔ وہ اس نے پورا کیا ہے۔ ہم نے اس کے لئے کیا۔ کیا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ حد یہ ہے کہ اس کی تعلیم کا خرچ تک ہم نے نہیں اٹھایا۔ حالانکہ ابو کی جائداد، کھیت اور باغات میں اس کا برابر کا حصہ ہے۔ اور اب تم اس کی شادی کرنے سے بھی کترا رہی ہو— یہ نہیں ہوسکتا۔"—

کمال میاں نے غصے سے دوٹوک کہہ دیا—

"آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے لڑکی دیکھ رکھی ہے"—

"ہاں۔ مولوی چراغ علی کی بیٹی شمائلہ مجھے پسند ہے"—

"وہ شیخ زادے؟— ہم ان کی لڑکی لائیں گے؟— ناممکن"—

بھابھی نے تڑخ کر کہا—

''میں یہ سب نہیں مانتا— نہ ہمارے آقا نے مسلمانوں کے درمیان ذات پات کی تفریق رکھی ہے۔ میں کل جا کر بات پکّی کر دوں گا۔''

کمال میاں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''میں کل ہی اپنے میکے چلی جاؤں گی۔ آپ شوق سے بھائی کی شادی کریں'' —دھمکی دی—

''کل چلی ضرور جانا۔ ایسا نہ ہو کہ صبح اپنا فیصلہ بدل دو کیونکہ میں بھی تم جیسی خودغرض اور مطلب پرست عورت سے عاجز آچکا ہوں۔''—

جمال کا دل چاہا کہ وہ دونوں کو بتادے کہ اس کا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اور سراج اور شائلہ سے ملے بغیر ہی واپس چلا جائے گا۔ لیکن اس کی ہمت نہیں پڑی اور ذرا دیر کروٹیں بدلتے بدلتے سو گیا۔

اگلے دن وہ دیر میں سو کر اٹھا۔ جمیلہ سے بھائی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ کچھ دیر پہلے کہیں گئے ہیں— اور امّی کی طبیعت خراب ہے۔ وہ سو رہی ہیں—

کمال واپس آئے تو بہت خوش تھے۔ مٹھائی کا ڈبہ جمیلہ کے حوالے کر کے بولے—

''بیٹی— سب کا منہ میٹھا کراؤ— تمہارے چچا جان کی شادی پکّی کر کے آرہا ہوں—''—

''سچ ابّو؟''— جمیلہ خوش ہوگئی۔

''بالکل سچ''— انہوں نے سامنے بیٹھے جمال کو اپنے سینے سے لگالیا۔ دلگرفتہ، لہجے میں کہنے لگے۔

''معاف کرنا بیٹا— ہم آج تک تمہارے فرائض سے غافل رہے جبکہ تم نے اولاد سے بڑھ کر ہمارا خیال کیا''—

''بھائی جان! ایسا نہ کہیں''—

جمال شرمندہ ہوگیا۔

''یہ نہیں پوچھو گے کہ تمہارا رشتہ کہاں طے کیا ہے؟''—

''بھائی جان— آپ جہاں بہتر سمجھیں گے رشتہ کریں گے۔ میں آپ کے حکم سے باہر نہیں ہوں۔''

سعادت مندی سے کہہ کر سر جھکا لیا۔ اگر کہتے کہ وہ رات کی ساری باتیں سن چکا ہے تو بھائی اور بھاوج شرمندہ ہو جاتے۔ اور وہ ایسا نہیں چاہتا تھا— آخر وہ اس کے بڑے تھے۔ اور ان کی عزت کرنا اس کا فرض تھا۔

شمائلہ کا گھونگھٹ اٹھا کر جمال نے پہلے سلام داغا پھر شرارت سے کہا—

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اب تک ہر رشتے سے انکار کیوں کرتی رہیں؟''—

''جی نہیں۔ آپ کو یہ سوال پوچھنے کا حق نہیں ہے''۔

شمائلہ نے آہستہ سے کہا۔

''اچھا یہی بتا دو کہ کیا تمہیں میرا انتظار تھا؟''—

''کیا آپ کو اس میں شک ہے؟ الٹا سوال کر دیا—

''نہیں— اور اسی لئے میں واپس آیا تھا— اگر تمہاری کہیں شادی ہو جاتی— تو میں ساری عمر واپسی کے بارے میں نہ سوچتا۔''

سنجیدگی سے کہا—

''— اور میں نے عہد کیا تھا کہ ساری زندگی آپ کا انتظار کروں گی''—

''اس سے اچھا تھا کہ مجھے اپنے عہد سے مطلع کر دیتیں''—

''لڑکی اپنے منہ سے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتی''

''اور اب جو اظہار کر رہی ہو؟''— شرارت سے کہا—

''اب تو آپ— خیر ہٹایئے'' کہہ کر شرما گئی۔ اور جمال نے ہنس کر اسے خود سے قریب کر لیا—

☆☆

لیلیٰ مجنوں

اُن دنوں نواب صاحب کی بیٹھک میں خاصی چہل پہل دیکھنے میں آرہی تھی۔ جا بجا کھونٹیوں پر رنگ برنگی جِھل مِل کرتے زنانہ اور مردانہ ملبوسات لٹکتے نظر آتے تھے۔ ٹین کی بنی ہوئی چمک دار تلواریں اور خنجر دیواروں پر سجے تھے۔ دو تین آدمی مصنوعی ڈاڑھیاں، مونچھیں اور بال از سر نو درست کرنے میں مصروف تھے۔ نقلی موتیوں کے زیورات، بادشاہ اور ملکہ کے تاج، شاہی دربار میں کام آنے والا ساز و سامان بنایا، سنوارا جارہا تھا۔ کبھی کے رکھے دھرے پردوں پر حسب ضرورت پینٹ کر کے مختلف منظروں کو اجاگر کیا جارہا تھا۔ کسی پردے پر ریگستان کا منظر تھا۔ کھجور کے درختوں کے پیچھے اونٹوں کا قافلہ کسی انجان منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک پردے پر اونٹ کی پشت پر محمل میں لیلیٰ کو جلوہ افروز دکھایا گی تھا۔ اور ایک پردے پر نخلستان کا منظر پیش کیا گیا تھا۔ یہ سارے پردے تھیٹر میں کام آتے تھے۔

رات کو سارا تام جھام سمیٹ کر ایک کنارے رکھ دیا جاتا تھا۔ اور نواب صاحب اپنی پیٹی (ہارمونیم) لے کر بیٹھ جاتے تھے۔ نقی حسین سارنگی سنبھالتے۔ اور استاد اللہ بخش طبلے پر سنگت کرتے تھے۔ پھر شروع ہو جاتی لیلیٰ مجنوں کی رہرسل۔ اوّل اوّل حمدِ باری گائی جاتی۔ منظوم مکالمے گائے جاتے۔ اداکار اپنے اپنے پارٹ ادا کرتے اور اداکاری کی رہرسل کرتے۔ منوّر عرف قیس۔ عرف مجنوں دن رات اداس غمگین اور پھٹے حالوں رہ کر گویا اپنے کردار کو زندہ جاوید بنانے کے سارے گُر آزمارہے تھے۔ ان کی آواز میں ایسی رقت

پیدا ہوگئی تھی کہ مخاطب بغیر بتائے ہی سمجھ جاتا تھا کہ یہ ضرور مجنوں کا پارٹ کرنے والے ہیں۔ لیلیٰ کے باپ عرف کمسن مرزا کی حرکات وسکنات سے ایک متکبر اور جابر باپ کے سارے تیور عیاں تھے۔ اور وہ ان دنوں اپنے گھر میں بھی بیوی، بچّوں پر خاصا رعب گانٹھتے تھے۔ غرض ہر کردار گویا چلتے پھرتے۔ اٹھتے بیٹھتے لیلیٰ مجنوں کا تماشا دکھا رہا تھا۔

یہ ساری تیاریاں ایک طرف تھیں اور لیلیٰ کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ سابق لیلیٰ عرف دلارے۔ دو برس میں ڈنڈ بیٹھک پیل کر اور سیروں کے حساب سے دودھ پی کے پہلوان نظر آنے لگا تھا۔ نئی لیلیٰ کی تلاش میں تھیٹر کے مالک نواب صاحب اور دسرے کارکن سخت پریشان تھے۔ بظاہر لیلیٰ کا ملنا آسان نہیں تھا۔ شرفائے محلّہ اور شرفائے شہر تھیٹر دیکھنے آتے تو گویا نواب صاحب کی سات پشتوں پر احسان کرتے۔ لیکن تھیٹر کے باہر مجال نہیں تھی کہ ان کے صاحبزادے کہیں 'لیلیٰ مجنوں' کے اشعار یا مکالمے دوہرا لیتے — ملازموں تک کو سخت تاکید اور تنبیہہ کی جاتی تھی کہ نوعمر صاحبزادوں کے روبرو اس منحوس اور جتاتی عشق کا چرچا نہ کریں غریبوں میں تو ویسے بھی فنونِ لطیفہ سے دلچسپی کم ہی ہوتی ہے۔ ان سے پردہ گروایا جاسکتا ہے۔ سامان ڈھونے اور بانس بلّی گاڑنے کا کام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن اداکاری ان کے بَس کی بات کہاں؟ اب رہا متوسّط طبقہ — تو پورے سماج کی ناک کی حفاظت کا ٹھیکہ تو اسی کے سر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس طبقے میں بھی کسی لیلیٰ کا ملنا محال تھا۔ اُمراء اور رؤسا خود بھی ناچ رنگ کی محفلیں جماتے تھے اور کھیل تماشوں کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ تھیٹر دیکھنے آتے تو اگلی قطاروں میں بڑے کرّ وفر سے براجمان ہوتے۔ اور نواب صاحب ان سے ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں لیتے تھے۔ وہ تو بَس ان کی سرپرستی اور تشریف آوری سے ہی نہال ہو جاتے تھے۔ اب چاہے ان کے نازک اندام اور حسین صاحبزادے مَسیں بھیگنے سے پہلے چوک کے کوٹھوں پر ادب آداب سیکھنے چڑھیں اور 'بالغ' ہو کر اتریں۔ چوسر پچیسی کھیلیں یا ہر قسم کی 'بازیوں' پر طبع آزمائی کریں۔ لیکن تین چار گھنٹے کی یہ بے ضرر تفریح ان کے لئے ممنوع قرار دی جا چکی تھی۔ اندیشہ تھا کہ 'لیلیٰ مجنوں'۔ یا 'شیریں فرہاد' ''جیسے کھیل دیکھ کر یہ صاحبزادے کسی لیلیٰ یا شیریں کے عشق میں گرفتار ہو کر گریبان چاک کر کے

دشت و بیابانوں کی خاک چھاننے نہ نکل کھڑے ہوں۔ یا تیشہ سنبھالنے کی مشق نہ کرنے لگیں۔ (یہ کوئی نہ سوچتا کہ بھلا ان نازک کلائیوں سے تیشہ اٹھتا بھی کیسے) جب بہت تلاش کے باوجود موزوں اور مناسب لیلیٰ کا کہیں سُراغ نہ ملا تو مجبوراً نواب صاحب نے نوٹنکی اور رام لیلا میں کام کرنے والے لڑکوں کو بلا کر دیکھا پرکھا کہ شاید ان میں اپنے مطلب کی کوئی صورت مل جائے۔ لیکن ان بے ڈھنگے، بے ڈول اور کرخت چہرے والے لڑکوں میں وہ بات، کہاں جو انہیں اصلی لیلیٰ سے ملتا جلتا بنا سکتی۔ کہاں وہ نازک اندام، سرو قد، سانولی سلونی اور شاہانہ وقار کی مالک لیلیٰ۔ اور کہاں یہ چوراہوں اور گلیوں میں اُچک پھاند کرنے والے چھچھورے لڑکے جو لیلیٰ کے ساربان بننے کے لائق بھی نہ تھے۔

کسی زمانے میں تماشائی دلارے پر بری طرح عاشق تھے۔ لیکن اس گدی بچے نے کوئی ٹھیکہ تو لے نہیں رکھا تھا کہ وہ ساری عُمر اسٹیج پر لیلیٰ اور شیریں کا پارٹ کرتا رہے گا۔ بہر حال لیلیٰ کا سوال اب بھی اپنی جگہ موجود تھا اور کھیل کی ریہرسل دھڑا دھڑ ہو رہی تھی۔ کچھ ہمدردوں نے تو یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ لیلیٰ مجنوں کے بجائے ''رستم و سہراب، کھیلا جائے۔ کم از کم دلارے رُستم۔ یا سہراب کا پارٹ تو کر سکے گا لیکن نواب صاحب نے یہ احمقانہ مشورہ ٹھکرا دیا۔ اب یہ محض کھیل نہیں رہا تھا بلکہ ان کی عزّت کا سوال بن چکا تھا۔ اس رومانی داستان میں خدا جانے کیا تاثیر تھی کہ ہزاروں بار اسٹیج پر پیش ہونے کے باوجود اس میں وہی کشش تھی جیسی آغا حشر کشمیری کے زمانے میں تھی — اس رومانی داستان کی مقبولیت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ اضافہ ہی ہوتا رہا۔

نواب صاحب نے جب ہوش سنبھالا تو آغا حشر کشمیری کی تھیٹر کمپنی، کی شہرت عروج پر تھی۔ نواب صاحب اس کمپنی کے کھیل دیکھ کر اتنے متاثر ہوئے کہ خود بھی ایک تھیٹر کمپنی بنا ڈالی۔ اپنے محدود وسائل کے باعث وہ کمپنی کو کوئی نمایاں کامیابی تو نہ دلا سکے۔ البتہ اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر سال چھ مہینے میں ایک بار ہفتہ دس دن تک اپنا کھیل ضرور دکھاتے تھے اور داد بھی پائے تھے۔ کم از کم شہر میں ان کے پیش کیے ہوئے ڈرامے بہت پسند کیے جاتے تھے — لیکن اس بار لیلیٰ نے گویا ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا —

HaSnain Sialvi

ایک دن استاد اللہ بخش نے 'لیلیٰ' کو نواب صاحب کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا۔ اور اپنے مخصوص لہجے میں نہایت قرأت کے ساتھ بدلے۔

''حضور — یہ رہی آپ کی لیلیٰ'' —

نواب صاحب نے بے یقینی سے پہلے انہیں۔ پھر لیلیٰ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اور اگلے ہی پل مارے خوشی کے اُچھل پڑے۔

''اماں اس چھوکرے کو اب تک کہاں چھپا رکھا تھا؟''

اللہ بخش نے زیرِ لب تبسم فرمایا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں بھی وہ کم گو انسان تھے۔ البتہ ان کے مشاق ہاتھ سنگیت کی زبان میں خوب باتیں کرتے تھے۔ نواب صاحب نے بھی ان کے جواب کی چنداں پرواہ نہیں کی۔ اور سامنے کھڑے لڑکے کا جائزہ لینے لگے۔ ابھی اس کی مَسیں نہیں بھیگی تھیں۔ چھریرا جسم — سُبک سُبک ناک نقشہ — گندمی رنگ — جھکی جھکی آنکھیں اور پتلے پتلے ہونٹوں پر سو فیصدی، لَیلوی، مسکراہٹ — گویا بنی بنائی لیلیٰ ان کے سامنے موجود تھی۔

نواب صاحب نے اسی وقت ایک لڑکے کو بازار دوڑا کر امرتیاں منگوائیں — اور مسولا مشکل کشا علیؑ کی نذر دی۔ پھر بسم اللہ کہہ کر ریاض کو مکالمے یاد کرانے لگے۔ لیکن وہ حیرت زدہ رہ گئے جب اس نے نہایت خوبی اور مہارت سے فَر فَر سارے مکالمے ادا کئے۔ یہی نہیں اس نے لیلیٰ کے پارٹ کے منظوم مکالمے اور اشعار بھی بڑی خوبصورتی سے گا کر سنائے۔ اچانک اتنی مکمّل لیلیٰ کا مل جانا کسی کرشمے سے کم نہ تھا۔ نواب صاحب نے بے حد شفقت سے ریاض سے پوچھا۔ ''میاں تمہیں تو سارے مکالمے اور اشعار تک یاد ہیں یہ سب کیسے سیکھے۔'' —؟

''جی —— وہ پچھلی بار میں نے آپ کا کھیل دیکھا تھا''

ریاض نے شرماتے ہوئے بتایا۔

''ماشاء اللہ غضب کا حافظہ پایا ہے۔ تم نے تو کمال کر دیا۔ اس بار ہمارا کھیل ہمیشہ سے زیادہ پسند کیا جائے گا۔ دلارے کی آواز تو ڈوب میں آنے کے بعد بالکل پھٹا

بانس ہوگئی تھی۔ مجبوراً ہم نے اس کے اشعار دوسرے لڑکے سے گوائے تھے۔ تمہاری آواز بالکل منجھی ہوئی ہے۔ اور ایسا درد ہے گلے میں کہ سننے والے سچ مچ کی لیلیٰ کا دھوکہ نہ کھا جائیں تو ہمارا نام بدل دینا"—

اپنی تعریف سن کر ریاض کا چہرہ کِھل اُٹھا۔ اس نے کنکھیوں سے منوّر— عرف قیس— عرف مجنوں کی طرف دیکھا اور منوّر اسی پل اِس لیلیٰ پر ہزار جان سے عاشق ہوگیا۔ (اس سے پہلے وہ دلارے پر بھی اسی زور وشور سے عاشق ہوا تھا)—— اس کا ہاتھ تھام کر لگاوٹ سے بولا—

"میں تو استاد سے کہوں گا کہ تمہیں ہماری کمپنی میں داخل کرادیں۔ آخر اس سے پہلے تم کہاں تھے یار؟"—— استاد بھی ایک ہی گھُنّے ہیں۔ کبھی تمہارا ذکر ہی نہیں کیا۔

"—— میں اپنی خالہ کے پاس محمود آباد میں رہتا تھا— میرے خالو سرکار میں ملازم ہیں"——

ریاض—— منوّر کے ہاتھ پکڑنے سے ایسا گھبرایا کہ پسینے پسینے ہوگیا۔ اور منوّر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

جب سارا انتظام مکمّل ہوگیا تو نواب صاحب نے اللہ کا نام لے کر کھیل کی تاریخ کا اعلان کردیا۔ اور زور وشور سے 'لیلیٰ مجنوں' کی پبلسٹی ہونے لگی۔ ایک آدمی دن بھر یکّے پر محلّے محلّے گھومتا۔ اور بھونپو میں چلّا چلّا کر کھیل کی تاریخ کا اعلان کرتا۔ کئی لڑکے پوسٹر چپکانے اور اشتہار بانٹنے میں مصروف تھے۔ چند روز میں سارے شہر کو معلوم ہوگیا کہ ان کا پسندیدہ ڈراما اسٹیج پر پیش ہونے والا ہے۔ نواب صاحب کے گھر کے سامنے میدان میں بانس اور بلّیاں گاڑ کر سرخ اور سبز رنگ کا شامیانہ تانا گیا۔ اُودی گوٹ کی زعفرانی قناتیں گھیر کر وسیع ہال بنایا گیا۔ اونچے سے اسٹیج پر سامنے کے رخ گراری پر چلنے والے پردے لگائے گئے۔ جن کو حسبِ ضرورت کھولا اور بند کیا جاتا تھا۔ اسٹیج کی پُشت پر سیزی والے پردے لگائے گئے۔ اسٹیج کے ایک پہلو میں سازندوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ اور دوسرے پہلو میں اداکاروں کے آنے جانے کا بندوبست تھا۔ یہ حصّہ نواب صاحب کی بیٹھک سے ملا ہوا

تھا— جہاں سے اداکار تیار ہو کر اپنی باری پر آسانی سے اسٹیج پر آسکتے تھے— اسٹیج کے نیچے ایک لمبا چوڑا گڑھا کھود کر روشنی دکھانے والوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا— یہ لوگ موقع کی مناسبت سے اسٹیج پر ہری لال— اور زرد روشنی فوکس سے پھینکتے تھے۔ تماشائیوں کے بیٹھنے کے لئے بھی حسبِ مراتب نشستوں کا خاص دھیان رکھا گیا تھا۔ اگلی قطار میں آرام دہ کرسیاں ترتیب سے لگی تھیں۔ ان کے پیچھے معمولی بنچیں تھیں۔ اور سب سے پیچھے۔ چلمنیں اور پردے ڈال کر مستورات کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ جہاں بیگمات اپنے نقشیں پاندان خاصدان اور اگالدان سمیت خوبصورت اور زرق ترق ملبوسات زیب تن کئے۔ قیمتی زیورات سے سجی۔ گاؤ تکیوں کے سہارے تختوں کے چوکے پر اس سج دھج سے فروکش ہوتی تھیں جیسے کسی تقریب میں شرکت کرنے آئی ہوں۔ کھیل کے دوران باندیاں بڑی مستعدی سے کشمیری چائے اور میووں سے ان کی مُدارات میں ہمہ تن مصروف رہتی تھیں۔ اور وہ چاندی کے ورق لگی گلوریاں نوش کرتے ہوئے—— کھیل میں کم اور خاندانی قفیوں میں زیادہ دلچسپی لیتی تھیں— تھیٹر کے باہر ٹکٹ گھر بنا تھا۔ اور داخلی گیٹوں پر باقاعدہ ٹکٹ چیک کرنے والے کھڑے تھے۔ جو اپنی جان پہچان والوں کو بڑی خندہ پیشانی سے بے ٹکٹ اندر بھیج دیتے تھے۔ شہر بھر کے خوانچے والے اور دوکاندار اپنی دوکانیں سجا کر تماشائیوں کو کام و دہن کی فکر سے نجات دلانے میں جوش و خروش سے مصروف تھے۔ غرض ہر طرف خوب ہی رونق تھی۔

پہلے روز ہی سیکڑوں تماشائی ٹکٹ گھر کی۔ کھڑکی پر ٹوٹ پڑے۔ اس بار کھیل میں لوگوں کی دلچسپی کا خاص سبب نئی لیلیٰ تھی— (یا تھا)— جس کی خوب زوردار پبلسٹی کی گئی تھی۔ پرانی لیلیٰ تو ٹھاٹ سے ہر طرف گھومتی پھرتی تھی۔ لیکن نئی لیلیٰ کی جھلک تک کسی محلّے والے نے بھی نہیں دیکھی تھی۔ البتہ ساتھ کام کرنے والوں نے اس کی خوبصورتی اور آواز کی خوب خوب تعریفیں کی تھیں۔ جس نے شوقین مزاجوں کی آتشِ شوق کو اور ہوا دی تھی۔

کھیل شروع ہوا۔ سب سے پہلے چند چھوٹے چھوٹے۔ خوش شکل بچّوں نے حمدِ باری گائی اس کے بعد اصل کھیل کی ابتدا ہوئی۔ ننھی لیلیٰ اور کم عُمر قیس کے مکتب میں پڑھنے کا

سین تھا۔ مولوی صاحب کی چھڑی شپ سے قیس کی پُشت اور ہاتھوں پر پڑتی ہے۔ اور لیلیٰ تڑپ اٹھتی ہے۔ اس کی بھی پُشت اور ہاتھوں پر چھڑی کی ضربوں سے لال۔ لال برتیں اُچھل آتی ہیں۔ اور خون چھلک اٹھتا ہے۔ (ہائے کیسی زوردار محبت ہوا کرتی تھی اس زمانے میں)۔

عمر کے ساتھ ان کے عشق کا جنون بڑھتا رہتا ہے۔ اور بے چارہ قیس۔ مجنوں بن کر پتھر کھاتا ہے تو لیلیٰ تڑپ کر کہہ اٹھتی ہے—

"کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو"—

تماشائیوں کی نظریں لیلیٰ پر مرکوز تھیں۔ وہ اس کی نزاکت اور خوبصورتی پر فدا ہوئے جا رہے تھے۔ کھیل ختم ہونے کے بعد جب وہ تھیٹر سے باہر نکلتے۔ تو ان کی زبان پر بس لیلیٰ کا ہی ذکر ہوتا۔ اس کے گائے ہوئے اشعار گلی کوچوں میں۔ خلوت اور جلوت میں گاتے۔ اور مکالمے مزے لے لے کر دوہراتے۔ اگر کسی وقت میاں مجنوں نظر آ جاتے تو ان کا جذبۂ رقابت اُمڈ پڑتا۔ وہ اس پر خوب جُملے کستے اور اس کا خوب ہی مذاق اڑاتے۔ منور ان کی طنزیہ باتوں کو ہنس کر ٹال دیتا۔ اور اکثر ریاض سے بھی ان نوجوانوں کے طوفانی عشق کا ذکر کر کے لطف لیتا۔ ریاض شرما جاتا۔

ایک ہفتے متواتر لیلیٰ مجنوں کا کھیل بڑی کامیابی سے دکھایا گیا۔ آخری شو کے بعد پروگرام کے خاتمے کا اعلان کیا گیا تو تماشائی بہت مایوس ہوئے۔

اگلے دن سویرے سے مزدور شامیانہ اور قناتیں اتارنے میں لگے ہوئے تھے۔ نقی حسین— قیصر مرزا— اور دلارے اپنی نگرانی میں سارا کام کرا رہے تھے— اور قیمتی سامان گودام میں رکھوایا جا رہا تھا— مستقبل قریب میں پھر یہ ساز و سامان کام آنا تھا۔

باہر تو یہ سب ہو رہا تھا۔ اور بیٹھک میں استاد اللہ بخش ایک گوشے میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ان کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ ان سے زیادہ برا حال نواب صاحب کا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے ایسے بیٹھے تھے۔ جیسے کسی جنازے کے سرہانے بیٹھے ہوں۔ سامنے کھونٹی پر لیلیٰ اور مجنوں کے لباس ٹنگے تھے۔ اور ایک خاندانی میراثی کی عزت کا مذاق اڑا رہے تھے۔ جس کی اکلوتی بیٹی رضیہ— عرف ریاض— عرف لیلیٰ— اپنے عاشق

منوّر۔ عرف قیس۔ عرف مجنوں کے ساتھ رات میں فرار ہوگئی تھی۔ اور اب خدا جانے کس نجد کے صحرا میں اپنی محبت کا ثبوت دینے میں مصروف تھی۔ یا پھر وہ دونوں دنیا کے اسٹیج پر لیلیٰ مجنوں کی داستان کو حقیقت کا رنگ دینے میں کھو گئے تھے۔ بیٹھک میں چاروں طرف نقلی موتیوں کے زیورات۔ تاج اور ملبوسات اس طرح' الجھے پڑے تھے— جیسے یہاں گھمسان کا زن پڑا ہو۔

گھمسان کا ایک زن تو استاد اللہ بخش اور نواب صاحب کے دلوں میں بھی پڑ رہا تھا— باہر کوئی شریر لڑکا بھونپو میں چلّا رہا تھا—

''آپ کے شہر میں آ گئے— دھوم مچانے کے لئے لیلیٰ مجنوں— لیلیٰ مجنوں— مہربان— قدردان— اپنی نئی لیلیٰ کو دیکھئے۔ لیلیٰ مجنوں میں۔ لیلیٰ مجنوں۔

☆☆

تلاش

بے حد خوبصورت۔ بے حد ماڈرن اور بے حد تعلیم یافتہ مہک نایاب — چاندی کا نہیں۔ سونے کا چمچ مُنہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی۔ اور چاندی کے چمچ والا محاورہ غلط ثابت ہوگیا تھا — اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لئے ایک گورنس اور اس کی ذاتی خدمت کے لئے آیا ملازم تھی۔

— پہلے کانونٹ اسکول — پھر کالج — اور پھر جو اڑان بھری تو سیدھی آکسفورڈ میں پہنچ کر دم لیا۔ وہاں رہ کر کئی ڈگریاں لیں۔ جب وہ اپنے خداداد حسن اور علم سے لدی پھندی وطن واپس آئی تو آس پاس نظر آنے والے دولت مند، خوبرو۔ اسمارٹ اور خاندانی رئیس زادے اس کی نظر میں حقیر کیڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اس نے تو اپنے آکسفورڈ کے ساتھیوں کو بھی گھاس نہیں ڈالی تھی۔ اعلیٰ خاندان کے شاہی خطاب یافتہ نوجوان جن کو خود بھی اپنے باپ دادا کی دولت کا اندازہ نہیں تھا۔ جن کی رہائش کسی 'پیلس' یا 'وِلا' میں تھی — جن کی ہر رات نائٹ کلب میں گزرتی تھی — اور وہ ہر سال اپنی کار کا ماڈل بدل دیتے تھے۔ کوششِ بسیار کے باوجود وہ اسے تسخیر نہیں کر سکے تھے۔ وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی جو مغرب کے مغرور، دولت مند، اور گوری چمڑی والے رئیس زادوں سے متاثر ہو جاتی۔ اور ان کے ساتھ عام لڑکیوں کی طرح سیر و سیاحت کرتی۔

اس کے ڈیڈی خاندانی رئیس تھے۔ جن کے آباء و اجداد کو انگریز سرکار نے ان کی وفاداری کے صلے میں 'سَر' کا خطاب دیا تھا اور بطور انعام کئی تعلقے بخشے تھے — اس کے گھر

کا ماحول سراسر مغربی تھا۔ کھانے کی میز پر چھری کانٹے۔ نیپکن اور تازہ پھولوں کے گلدستوں کو دیکھ کر کسی لارڈ گورنر کا ڈائینگ روم یاد آجاتا تھا— قیمتی کٹلری اور چاندی کے ظروف روزمرہ کے استعمال میں رہتے تھے۔ ان کے کچن میں انگریزی بولنے والا خانساماں تھا۔ جو انگلش، فرنچ، چینی — اور مغلئی ڈشیں بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ باوردی بیرے خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ وہ عام ہندوستانیوں کی طرح ناشتہ اور کھانا نہیں کھاتے تھے۔ بلکہ ''چھوٹا حاضری۔ اور بڑا حاضری، کا کلچر سختی سے عائد تھا۔ ان کی زندگی کے کچھ اصول تھے۔ اور ان کے شب و روز ایک مخصوص ضابطے کے تحت گزرتے تھے سونے جاگنے۔ اور کھانے پینے کے آداب پر سختی سے عمل ہوتا تھا۔ ان کا میل جول بھی ہر کس وناکس سے نہیں تھا۔ چند خاص خاص۔ خاندان اور لوگ تھے جہاں ان کا آنا جانا تھا۔ اور اس میں بھی مراتب کا لحاظ وخیال رکھنا ضروری تھا۔ ایسے ماحول کی پروردہ مہک نایاب کی نظر میں بھلا کسی کی کیا اہمیت ہوسکتی تھی؟۔

مغربی تہذیب کی پروردہ ہونے کے باوجود اسے گوری چمڑی والے نوجوان ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ اس نے مائیکل۔ ایڈورڈ۔ یمسن اور ان جیسے لوگوں کو ہمیشہ اپنی سینڈل کی نوک پر مارا۔ اسے تو ان لڑکیوں پر ترس آتا تھا جو ایسے نوجوانوں کے ساتھ ایک راؤنڈ ڈانس کرنے کے لئے مری جاتی تھیں۔ اور خوشی خوشی ان کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے جانے کو کسی اعزاز سے کم نہیں سمجھتی تھیں— لیکن مہک نایاب ان سے کوسوں کے فاصلے پر رہتی تھی۔ اس کی فطرت کا یہ تضاد بظاہر ناقابلِ یقین لگتا تھا۔ لیکن وہ یہ حقیقت فراموش کرنے کے لئے تیار نہیں تھی کہ ماڈرن اور آزاد خیال ہونے کے باوجود اس کی جڑیں مشرق کی مٹی میں پیوست ہیں۔ لہٰذا جب وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے وطن واپس آئی تو پورے اعتماد اور وقار کے ساتھ آئی۔ یہاں اس کے اپنے خاندان میں۔ اور خاندان کے باہر بھی کئی رشتے اس کے منتظر تھے۔ جن کا معیارِ زندگی اور رہن سہن کسی طرح اس سے کم نہیں تھا۔ اور والدین کا خیال تھا کہ اس کی مرضی کے مطابق فوراً اس کا رشتہ پکا کر دیں گے۔ اور جلد سے جلد اس کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ اگر ان کی پسند پوچھی جاتی

تو انہیں نواب ہادی کے دونوں صاحبزادے بہت پسند تھے۔ جو ہاورڈ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ رائیڈنگ، سوئمنگ اور شوٹنگ کے چیمپین تھے۔ ان کے گھر کی تہذیب اور طرزِ زندگی ان کے مزاج کے عین مطابق تھی — اور دولت کی ریل پیل تھی۔ ان کے علاوہ مشہور صنعت کار سیٹھ ہارون کا اکلوتا بیٹا بھی انہیں پسند تھا۔ جس نے جرمنی سے انجینیر ی کی ڈگری لی تھی۔ اور واپس آنے کے بعد اپنے باپ کی فیکٹریوں کے لئے نئے آسمان تلاش کئے تھے۔ اب یہ فیکٹریاں سونا اگل رہی تھیں۔ ایک قریبی دوست جو مرکزی حکومت میں وزیر تھے۔ اب اپنے لڑکے کو صوبائی الکشن لڑانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ انہوں نے تو دوستی کا واسطہ دے کر مہک پر اپنا پہلا حق جتاتے ہوئے اپنی دانست میں رشتہ بھی پکّا کر دیا تھا۔ لیکن — والدین نے بڑی دیانتداری سے فیصلہ مہک پر چھوڑ دیا تھا۔

مہک نے تو سب کی امیدں پر پانی ہی پھیر دیا۔ اور سارے رشتوں کو رَد کر دیا۔ وہ یونیورسٹی میں انگلش لٹریچر پڑھانے لگی۔ خالی وقت میں وہ معیاری اخباروں اور میگزین میں آرٹیکل لکھتی تھی۔ اس کا ارادہ ایک میگزین نکالنے کا بھی تھا۔ جس کا خاکہ اس کے ذہن میں برسوں سے تشکیل اور تکمیل کے مراحل طئے کر رہا تھا۔ وہ اپنا میگزین یورپ کے معیاری اور مقبول میگزینوں کے خطوط پر نکالنا چاہتی تھی اراسے نئی بلندیاں عطا کرنا چاہتی تھی — یہ صرف اس کا شوق نہیں — بلکہ مشن تھا — اور اس معاملے میں وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ جن کی زندگی کا مقصد دولت عیش و آرام۔ شوہر اور بچے ہوتے ہیں۔ اس کی سوچ بالکل منفرد تھی۔ اور اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لئے کسی حد تک بھی جا سکتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ ماں باپ کی ناراضگی مول لینے کے لئے بھی تیار تھی۔

مہک عام طور سے جینز اور ٹاپ پہننا پسند کرتی تھی۔ لیکن یونیورسٹی میں ساڑی۔ شلوار سوٹ اور چوڑی دار پاجامہ وغیرہ پہنتی تھی۔ میک اپ سے اسے اِلرجی تھی۔ زیور کے نام پر کانوں میں ننھی ننھی بالیاں پڑی رہتی تھیں۔ جو کان کی لو سے چپکی رہتی تھیں۔ داہنی کلائی میں نازک سا بریسلٹ۔ اور بائیں کلائی میں رسٹ واچ رہتی تھی — اس کے تراشیدہ بالوں کی قدرتی لہریں اکثر ہیر بینڈ میں قید رہتی تھیں — وہ ہر لباس میں اچھی لگتی تھی۔ اور نہ صرف

ساتھی مردوں سے بلکہ خواتین سے بھی ایک فاصلہ برقرار رکھتی تھیں۔ بس زینب سے اس کی گہری دوستی تھی۔ جو اردو ادب پڑھاتی تھی۔ بظاہر مغرب اور مشرق کا ملن ناممکن نظر آتا تھا۔ لیکن زینب اور مہک نے اسے ممکن کر دکھایا تھا۔ خالی وقت میں وہ دونوں سب سے الگ تھلگ بیٹھ کر کافی پیتی تھیں۔ اور گپ شپ کرتی تھیں۔ مہک کو زینب کی یہ بات بہت پسند تھی کہ وہ ذاتیات پر گفتگو کرنے سے گریز کرتی تھی۔ ان کی دوستی نبھنے کی یہ بھی ایک وجہ تھی۔

اس روز بھی وہ دونوں الگ تھلگ کمرے میں بیٹھی کافی پی رہی تھیں۔ کہ ان کی گفتگو کا رخ شادی کی طرف مڑ گیا۔ زینب نے کہا۔

''ان دنوں گھر میں میری شادی کو لے کر سب لوگ بہت سنجیدہ ہیں۔ اور کئی رشتے زیرِ غور ہیں۔''

''تمہاری اپنی کیا رائے ہے؟''—

مہک نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ اور کافی کا کپ کنارے رکھ دیا۔

''میری کیا رائے ہو سکتی ہے۔ جو گھر والے چاہیں گے وہی ہوگا۔''

یعنی تم ان کی پسند سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو؟''—

'اوّل تو یہ جان لو کہ میری اپنی کوئی پسند نہیں ہے۔ جو انتخاب کا سوال پیدا ہو۔ اور اگر میری پسند اور انتخاب والدین کو پسند نہ آتا— تو مزید الجھن پیدا ہوتیں— اس لئے بہتر یہی ہے کہ فیصلہ ان پر چھوڑ دوں''—

''کیا تم کسی ناپسندیدہ انسان کیساتھ زندگی گزار سکو گی؟''—

''گزارنا تو پڑے گی''— زینب نے سادگی سے کہا—

''تم خود کوئی فیصلہ کیوں نہیں کرتیں۔ آخر تمہیں کیا مجبوری ہے؟'' مہک نے سختی سے پوچھا—

''سچ کہوں؟— مجھے خود پر اعتماد نہیں ہے اسی یونیورسٹی میں بہت سے تماشے دیکھ چکی ہوں۔ اس لئے ڈر لگتا ہے۔''

''مثلاً— کیسے تماشے؟''— سوال کیا—

''تم پروفیسر بھٹاچاریہ اور نلنی اہلوالیہ کو جانتی ہو؟''

''ہاں— جانتی ہوں''—

''دو سال پہلے ان کا طوفانی عشق شروع ہوا تھا۔ گھر والوں کی مرضی کے خلاف انہوں نے سول میرج کر لی۔ اور صرف ایک برس کے بعد ان کی طلاق ہوگئی۔ دونوں آج بھی اسی یونیورسٹی میں جاب کر رہے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے یکسر اجنبی بن کر رہتے ہیں۔ خاندان والے بھی ناراض ہوئے اور یونیورسٹی میں بھی ان کی سبکی ہوئی۔ بلکہ مذاق اڑایا گیا۔ بتاؤ ایسی شادی سے کیا فائدہ؟''—

''ایسی چند مثالیں ہوں گی۔ لیکن ارینج میرج بھی تو طلاق پر ختم ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس کا امکان کچھ زیادہ ہی ہے''

مہک نے سنجیدگی سے اپنا خیال ظاہر کیا—

''گھر والوں کے ٹھہرائے ہوئے رشتے میں۔ طرفین کو خاندان کا لحاظ اور خیال رکھنا پڑتا ہے— اور کسی نہ کسی طرح دونوں نبھانے کی کوشش کرتے ہیں''—

''یعنی سمجھوتہ؟— مہک نے طنزیہ کہا۔

''کیا حرج ہے؟ کم از کم طلاق کی نوبت تو نہیں آتی''

زینب کی خالص مشرقی ذہنیت نے مہک کو سُلگا دیا— ''تمہاری جیسی بزدل لڑکیاں ساری عمر کڑھ کر اور رو کر گزارتی ہیں۔ کم از کم میں ایسی ناکام زندگی کے خلاف ہوں''—

''مہک— ہم لوگ ابھی اتنے ماڈرن نہیں ہوئے ہیں''—

''بات ماڈرن یا دقیانوسی ہونے کی نہیں ہے زینب۔ بلکہ قوّت فیصلہ کی کمی کی ہے''—

''ایک بات کہوں— برا تو نہیں مانو گی''—

زینبت نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''۔۔۔

''ماشاء اللہ تم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو۔ ماڈرن اور دولت مند بھی ہو۔ تمہارے جیسے اسٹیٹس والے لڑکوں کی کمی بھی نہیں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ کوئی تمہیں اب تک پسند نہیں آیا؟''۔۔۔

''ضروری نہیں ہے کہ ایسا کوئی انسان پسند کرنے کے لائق بھی ہو۔ پسند بالکل الگ چیز ہے'' مہک نے متانت سے کہا لیکن زینب قائل نہیں ہوئی سوال کیا۔

''مان لو پسند کے چکّر میں تمہاری شادی کی عمر نکل گئی تب تم کیا کروگی؟''۔۔۔

''سمجھوتے کی زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ میں شادی نہ کروں اور شادی کرنا اتنا ضروری بھی نہیں ہے''۔۔۔

زینب کے سوال کی گہرائی اور تلخی نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا۔۔۔ اور نہ ہی اس نے برا مانا۔۔۔ ہنس کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔۔۔

''میں اپنی انفرادیت کو قتل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں''

''تم ایک مشکل لڑکی ہو۔ بے وقوف:۔

زینب کی بے چارگی قابلِ دید تھی۔ مہک قہقہہ مار کر ہنس دی۔

زینب کی شادی ہوگئی۔ وہ بیاہ کر دوسرے شہر چلی گئی۔ مہک تنہا رہ گئی۔ اس نے کسی کی دوستی قبول نہیں کی۔ 'قلم' سے اس کی دوستی کچھ اور پکّی ہوگئی۔ وہ اپنے میگزین کی اشاعت کے سلسلے میں مصروف ہوگئی۔ صرف دو گھنٹے کے لئے یونیورسٹی جاتی۔ باقی سارا وقت میگزین کے خدوخال سنوارنے میں مصروف رہتی۔

'ٹائم' کا پہلا شمارہ بڑی آب وتاب سے نکلا۔ اس کی پذیرائی بھی خوب ہوئی۔ مہک کے حوصلے کچھ اور بلند ہو گئے۔۔۔ وقت کا کارواں اپنے پیچھے بہت سی گرد چھوڑ گیا۔ اس گرد میں پہلے اس کے ڈیڈی چھپے۔ پھر ممّی بھی چھپ گئیں۔ اب وہ اپنی محل نما کوٹھی میں تنہا رہ گئی۔ لیکن تنہا بھی کیوں؟۔۔۔ اس نے میگزین کا آفس گیسٹ ہاؤس میں منتقل کر دیا۔۔۔ ملازم سب وہی تھے۔ اس نے کسی کو الگ نہیں کیا تھا۔۔۔ کوٹھی کی نگراں مس مارتھا البتہ

ریٹائر ہوگئی تھیں۔ اور اپنے لڑکے کے پاس گوا واپس جا چکی تھیں۔ اس کے جتنے خواستگار تھے۔ سب کئی کئی بچّوں کے باپ بن چکے تھے۔ اور خوش گوار زندگی گزار رہے تھے۔ گاہے گاہے ان سے کسی تقریب میں ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ جینے اور جیئے جانے کا عمل جاری تھا۔ وہ بھی جی رہی تھی۔ اسے زندگی سے کوئی شکایت بھی نہیں تھی۔ اور ہوتی بھی کیوں؟— یہ زندگی اس نے خود پسند کی تھی— کسی نے اس پر تھوپی نہیں تھی—

'ٹائم' میگزین کے معاون ایڈیٹر طارق سیّد نے مہک کے سامنے ایک نئی تجویز پیش کی۔

''اگر ہم اپنے میگزین میں صوفیوں کی زندگی پر ایک فیچر شائع کریں تو یقیناً ہمارے قارئین کو یہ سلسلہ پسند آئے گا۔

''خیال تو بُرا نہیں ہے۔ لیکن اس میں بھی کچھ انفرادیت ہونا چاہئے۔ کوئی بھی موضوع ہو۔ اپنی تازگی اور نئے پن کی وجہ سے توجّہ کا مرکز بنتا ہے۔'' مہک نے خیال ظاہر کیا۔ ''آپ کچھ وضاحت کریں گی؟'' طارق سیّد متوجہ ہوگئے۔ ''میں چاہتی ہوں کہ اس فیچر میں پرانی کتابوں۔ تصویروں اور مضامین سے مدد لینے کے بجائے ہم خود ان صوفی حضرات سے ملیں اور ان کے خیالات اور نظریات سے آگاہی حاصل کریں۔ ان کے افکار قلم بند کریں۔ اور ان کے بزرگوں کے بارے میں معلومات حاصل کریں— اس سے ہمیں پرانی اور نئی نسل کو جاننے میں آسانی ہوگی۔ اور بدلتے ہوئے وقت کے تناظر میں اگر ان صوفیوں میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ تو وہ بھی ہمارے علم میں آئے گی۔'' — ''بہت اچھا خیال ہے۔'' طارق سیّد نے تائید کی۔

''مشہور و معروف درگاہوں اور مزاروں کے علاوہ ہم چھوٹے قصبات اور گاؤں میں فروکش صوفی حضرات اور سجّادہ نشینوں سے بھی ملیں گے'' — کچھ سوچ کر اس نے کہا ''کیوں نہ ہم اپنے کام کی ابتدا انہیں قصبات سے کریں؟ طارق سیّد نے مہک کی تجویز سے اتفاق کیا—

''ٹھیک ہے— آپ ان کے بارے میں معلومات حاصل کریں تا کہ ہم اپنے

پروگرام کو عملی جامہ پہنا سکیں"۔۔۔

مہک بہت پر جوش تھی۔ فلموں میں پیش کئے جانے والے مزاروں کے سیٹ۔ اور قوّالیوں کا انداز کبھی کبھی بہت مضحکہ خیز لگتا تھا۔ اب اصلی مزارات۔ خاندانی صوفیوں اور سجّادہ نشینوں سے قربت اور آگاہی سے ایک نیا تجربہ حاصل ہوگا۔

ان کے سفر کا آغاز طارق سیّد کی رہنمائی میں ہوا۔

ان کے مختصر سے قافلے میں ان دونوں کے علاوہ فوٹو گرافر جونی۔ ملازم سُنیل اور انور خاں ڈرائیور شامل تھے۔ ایک دن میں کم از کم دو قصبوں کو "کور" کرنے کا پروگرام تھا۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک دن میں صرف ایک ہی جگہ کام ہو سکا۔

اس بار وہ جس جگہ جا رہے تھے اس کا فاصلہ ان کے اندازے سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ شام کے قریب وہ لوگ قصبے میں داخل ہوئے۔ کھیتوں اور باغوں کا سلسلہ ہلکے دھندلکے میں بھلا لگ رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ لوگ آبادی سے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔ دور پرٹمٹماتے۔ چراغ انہیں راہ دکھا رہے تھے۔ فضا میں آم کے بور کی خوشبو رچی بسی تھی۔۔۔ چھوٹی سی سفید مسجد سے ملحق مزار روشنی سے جگمگا رہا تھا اور سامنے کی کشادہ بیٹھک میں خاصی رونق تھی۔

انور خاں نے گاڑی کنارے روک دی۔ دو خادم بڑھ کر ان کے پاس آئے اور ہاتھوں ہاتھ انہیں مہمان خانے میں پہنچا دیا۔ مہمان خانہ بیٹھک سے الگ تھلگ تھا۔ ایک خادم نے مہک کی رہنمائی زنان خانے کے داخلی دروازے تک کی اور اسے ملازمہ کے حوالے کر دیا۔ بن بلائے مہمانوں کی خاطر مدارات اس طرح ہو رہی تھی۔ جیسے وہ خاص طور پر مدعو کئے گئے ہوں۔

زنان خانے میں خواتین مہک کی میزبانی میں خندہ پیشانی سے مصروف تھیں۔ کچا پکا وسیع گھر بے حد صاف ستھرا تھا۔ بان کی چارپائیوں پر سفید چادروں والے بستر اور گاؤ تکیئے لگے تھے۔ دالان میں تختوں کا چوکا لگا تھا۔ میز کرسی کا اہتمام کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہیں تختوں کے چوکے پر دسترخوان بچھایا گیا۔ سادہ کھانا۔ لیکن خلوص کی لذّت من وسلویٰ کو

شرمندہ کررہی تھی نئی جگہ تھی لیکن مہک کو بڑی اچھی نیند آئی۔

صبح ناشتے کے بعد وہ سب 'میاں' کی خدمت میں حاضر ہوئے۔اپنی آمد کی غرض وغایت طارق سیّد نے انہیں رات ہی میں بتادی تھی۔ بیٹھک میں فرشی نشست تھی۔میاں گاؤ تکیئے کے سہارے بیٹھے تھے۔ اور طارق سیّد نے ٹیپ ریکارڈ آن کردیا تھا۔ جونی تصویریں لے رہا تھا۔قریب ہی مہک سفید ردا میں لپٹی بالوں کو اسکارف میں چھپائے متوّدب بیٹھی تھی وہ ماحول سے مرعوب ومتاثر نظر آرہی تھی—

طارق سیّد نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔میاں بڑی روانی سے انگریزی میں ان کے سوالوں کا جواب دے رہے تھے— ان کا لہجہ۔ سنجیدہ مسکراہٹ۔ گفتگو کا رُکا تھما دلنشیں انداز نپے تلے جملوں کا اتار چڑھاؤ بے حد متاثر کن تھا الفاظ آبشار کی صورت ان کے ہونٹوں سے نکل رہے تھے۔علم اور معلومات کا خزانہ جب تقریر کی صورت اختیار کرتا تو سننے والا مسحور ہو جاتا۔وہ ہر موضوع پر بے تکان بول رہے تھے۔کمال یہ تھا کہ انہوں نے مذہب پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ایک سجّادہ نشین کے اتنے ترقی پسند خیالات تھے کہ سننے والوں کو ''یقین نہیں آرہا تھا۔ان کی روشن خیالی نے مہک کو بے حد متاثر کیا۔اس نے ان سے کوئی سوال کیا۔پہلی بار میاں نے نظریں اٹھائیں۔ان کی آنکھوں کی گہرائی میں وہ ڈوب سی گئی۔ گلابی ڈوروں والی غلافی آنکھیں اس سے گفتگو کررہی تھیں۔ان سے خارج ہونے والی برقی رَو اس کے دل ودماغ اور جسم میں سرائیت کرتی جارہی تھی۔اس کی روح میں زندگی بن کر دوڑ رہی تھی۔گردوپیش کا سارا منظر کہیں کھو گیا تھا۔بس وہ تھی۔اور دو آنکھیں تھیں۔آج اس کی تلاش ختم ہوگئی تھی۔

قریب ہی زینب کی سرگوشی سنائی دی۔

''پسند کے چکّر میں تمہاری شادی کی عُمر نکل گئی۔تب تم کیا کروگی؟''

وقت بھُر بھُری ریت کی مانند اس کی مٹھی سے پھسل گیا تھا۔اسکارف میں چھپے بالوں میں ان گنت چاندی کے تار چمک رہے تھے۔اس نے اپنی آنکھیں جھکالیں سحر کا جال اگر نہ ٹوٹتا۔تو وہ ٹوٹ جاتی۔ٹوٹ کر بکھر جاتی۔ چالیس بیالیس برس کی عمر میں ٹوٹنا اور

بکھرنا پاگل پن ہی تو تھا۔

مہک نے پرس سے گاگلز نکالے اور آنکھوں پر لگا لئے۔ اُن آنکھوں کے سحر سے بچنے کے لئے وہ اس کے سوا کرتی بھی کیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے گاگلز دھندلے ہو گئے تھے۔ خدا جانے یہ اتنی نمی کہاں سے آ گئی تھی۔

☆☆

وراثت

ایک بار پھر میرے میاں کا تبادلہ نئے شہر میں ہوگیا۔ اور میں ایک بار پھر نئی نئی پریشانیوں سے دو چار ہوگئی۔ حالانکہ سرکاری ملازمت کرنے والے مردوں کی بیویاں تو ہر وقت پابہ رکاب رہتی ہیں لیکن جب بھی تبادلے کے آڈر ملتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا قیامت ٹوٹ پڑی ہو — چند روز — چند ہفتے میں زندگی معمول پر آجاتی ہے۔ نئی جگہ نئے ماحول میں گھل مل بھی جاتے ہیں۔ اور جب پوری طرح مطمئن ہو چکے ہوتے ہیں تو پھر ایک دن شوہر صاحب منہ لٹکائے گھر آتے ہیں اور تبادلے کے احکام سنا کر ہمارا خون خشک کردیتے ہیں۔

اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ کئی دن تو گھر کا سامان سیٹ کرنے میں لگ گئے۔ سرکاری بنگلے میں یہ بھی ایک مصیبت ہوتی ہے کہ ہم اپنی مرضی سے سامان کی ترتیب نہیں بدل سکتے بلکہ بنگلے کی تعمیر کے حساب سے ہمیں اپنا سامان جمانا پڑتا ہے۔ جیسے تیسے کرکے ڈرائنگ روم اور بیڈ روم سیٹ کیا روزمرہ استعمال کا سامان تو اکثر ٹوٹ پھوٹ کر برباد ہی ہوجاتا ہے۔ لیکن قیمتی سامان کی بھی شامت آجاتی ہے۔ جب ہم نے بڑی احتیاط سے پیک کئے ہوئے کراکری کے بکس کھولے۔ تو Glass with Care (شیشہ احتیاط کے ساتھ) کے لیبل منہ چڑاتے نظر آئے۔ میرے قیمتی ڈنر سیٹ کی ایک ڈش اور پلیٹیں درجۂ شہادت پر فائز ہوچکی تھیں۔ چونکہ ڈنر سیٹ میرے جہیز کا تھا اس لئے مجھے بے حد دکھ ہوا۔ اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شوہر صاحب نے میرے اس نقصانِ عظیم اور جذباتی ٹوٹ پھوٹ پر

ایک بے معنی لفظ ''ارے، کہہ کر گویا اپنا فرض ادا کر دیا۔ تب تو جی چاہا کہ اس بے حس انسان کے سر پر یوار ڈنر سیٹ پٹک کر توڑ ڈالوں — میری بیٹی گڑیا نے جو مجھے اس طرح بے قراری سے روتے دیکھا تو اپنی ننھی ننھی بانہیں۔ میری گردن میں حمائل کر کے خود بھی رونے لگی۔ اس نے اپنا ننھا منا سا ڈنر سیٹ بڑی فراخدلی سے مجھے دینے کی پیش کش بھی کر ڈالی۔ گڑیا کے لئے یہ چھوٹا سا خوبصورت ڈنر سیٹ میرے بھائی نے ٹوکیو سے بھیجا تھا۔ اور یہ گڑیا کو، بہت عزیز تھا۔ گڑیا کی دلجوئی نے میرا غم کچھ ہلکا کر دیا۔ اور میں اسے پیار کر کے دوبارہ سامان رکھنے اٹھانے میں مصروف ہو گئی۔

ایک ہفتہ تو کسی طرح روگا کر کاٹا۔ پھر میں نے شارب کو الٹی میٹم دے دیا کہ اب ملازمہ کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ کہنے کو تو سرکار کی طرف سے ڈرائیور۔ چپراسی مالی وغیرہ ملے ہوئے تھے۔ لیکن مردوں کی بنائی ہوئی سرکار نے کبھی عورتوں کی پریشانی کے متعلق سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی کے ڈھیر سارے بیکار کے ملازموں کے ساتھ ایک کام کا نوکر بھی دے دیا کرے۔ یعنی کھانا پکانے کے لئے کوئی خانساماں وغیرہ۔ کہ گھر والی کو روپیٹ کر چولہا نہ پھونکنا پڑے۔ اس سے تو انگریزوں کا زمانہ اچھا تھا جب خانساماں بیرے اور آیائیں سرکاری افسروں کے آگے پیچھے رہتے تھے۔ خیر یہ تو سنی سنائی باتیں تھیں۔ لیکن مجھے کچن سنبھالنے کے لئے ایک قاعدے کی عورت کی واقعی سخت ضرورت تھی۔

ہمارے ڈرائیور نے جلد ہی ایک عورت کا انتظام کر دیا۔ اور ناظمہ کو ہمارے سامنے پیش کر کے اپنی وفاداری کا سکّہ جما دیا۔ ناظمہ پینتیس چالیس برس کی دبلی پتلی زرد رو عورت تھی۔ شاید اس کی عمر میرے اندازے سے کچھ کم ہی ہو۔ لیکن مفلسی اور پریشانی نے اسے اضافی عمر کا تحفہ دینے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا — میں نے ناظمہ سے گھسا پٹا سوال کر ڈالا۔

''تم نے پہلے کبھی کھانا پکانے کا کام کیا ہے؟''

''جی ہاں۔ کئی جگہ کام کر چکی ہوں۔''

''تمہارا آدمی کیا کرتا ہے؟'' —

''جی وہ تو سدا کا نکمّا اور کام چور تھا۔ پر اب تو کئی، برس سے کھٹیا پر پڑا کھانستا رہتا ہے''— پھر کام نہ کریں تو کھائیں کیا؟—

''تب تو بڑی مشکل ہوتی ہوگی خرچ وغیرہ کی''؟

''ایک پریشانی ہو تو کہیں میم صاحب روٹی تو صبح شام چاہئے ہے۔ اوپر سے اس کی دوا— پھر دارو کا خرچ''۔

''یعنی سچ مچ کی دارو۔ شراب؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

''جی میم صاحب اسے روز ایک پوّا دارو ملنا چاہئے''—

''یہ تو اچھی بات نہیں ہے ناظمہ — تم کیوں دیتی ہو دارو؟''

''نہ دیں تو مار گالی کھائیں— سو اپنی عزّت کے لئے یہ بھی کرتے ہیں جی''—

''بچّے کتنے ہیں؟

''پہلے تو چار تھے۔ پھر ایک ایک کر کے مرتے گئے۔ اب ایک لڑکا ہے سارے کے سارے زندہ ہوتے تو میری بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا جاتے۔''

''ایسا نہیں سوچتے ناظمہ — اولاد تو اوپر والے کی دین ہے۔ اس کی رحمت ہے۔''

میں نے قریب کھیلتی گڑیا کو پیار سے دیکھ کر کہا۔ پھر میں نے ناظمہ کو کچن کا کام سمجھایا— اور جب وہ کام ختم کر کے جانے لگی تو میں نے اسے اپنے چند کپڑے دیئے اور صابن کے لئے پیسے بھی تا کہ وہ صاف ستھری رہا کرے۔ شارب کو گندے نوکر سخت ناپسند تھے۔ خاص طور سے کھانا پکانے والی ملازمہ کی گندگی تو وہ برداشت ہی نہیں کر پاتے۔ اور نہ مجھے گندگی پسند ہے۔

ایک روز ناظمہ کام کرنے آئی تو اس کے ساتھ سانولے رنگ کا دبلا پتلا اور گندا سا ایک لڑکا بھی تھا۔ عمر یہی کوئی آٹھ نو برس ہوگی صورت پر ایسی یتیمی برستی نظر آتی تھی کہ دیکھ کر آپ ہی آپ ترس آجائے۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا۔ تو وہ پہلے تو ذرا جھجکا— پھر بسکٹ کے لالچ میں قریب چلا آیا۔

''تمہارا کیا نام ہے بیٹا۔''؟ میں نے اسے بسکٹ دیتے ہوئے پیار سے کہا۔۔۔ اس نے جلدی سے بسکٹ لے لیے پھر بولا ''وارث''۔۔۔ بسکٹ کھاتے کھاتے اس نے اپنی بہتی ہوئی ناک بڑی صفائی سے آستین سے پونچھ لی تو مجھے بہت گھن آئی۔ اور اس سے زیادہ دلار جتانے کا ارادہ ترک کر کے میں وہاں سے ہٹ گئی ناظمہ جب تک کام کرتی رہی وہ کچن کے دروازے سے لگا کھڑا رہا۔ اور گڑیا کو کھیلتے ہوئے دیکھتا رہا۔۔۔ ناظمہ جانے لگی تو میں نے ذرا سختی سے کہا۔

''ناظمہ تمہارا ایک ہی بچہ ہے لیکن تم اسے صاف ستھرا نہیں رکھ سکتیں۔؟''

''کیا کریں میم صاحب ایک تو یہ اتنا شریر ہے کہ ہر دم کھیلتا رہتا ہے۔ صاف رہنے سے تو اسے بیر ہے بیر۔۔۔ پھر نہ ہمیں اتنا ٹیم ہے کہ روز اسے نہلائیں۔ دھلائیں۔۔۔ اور نہ دس جوڑے دھرے ہیں اس کے لئے۔ ایک تن پر ہو تو ایک گندا ہووے ہے۔''

میں نے شارب کے چند نا قابلِ استعمال کپڑے الگ کئے اور وارث کے لئے کئی قمیضیں اور نیکریں تیار کر دیں۔ کپڑے ناظمہ کے حوالہ کر کے میں نے اسے وارث کو صاف ستھرا رکھنے کی تاکید کی۔ ناظمہ کپڑے لے کر بہت خوش ہوئی۔

مجھے بھی خوشی تھی کہ اب اس کا اکلوتا بچہ کپڑوں کی کمی کے باعث گندا میلا نہیں رہے گا۔ وارث کے لئے نئے کپڑے خریدنے کا پروگرام میں نے مہینہ شروع ہونے پر اٹھا رکھا۔

اس روز چپراسی چھٹی پر تھا۔ اور گڑیا کو اسکول پہنچانے اور لانے کی ذمّے داری میرے اوپر تھی۔ شارب ایسے کاموں سے دور بھاگتے تھے۔ ان کے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا۔ میں نے جلدی جلدی گڑیا کو تیار کرایا اور بیگ اس کے کاندھے پر لٹکا کر اسکول چل دی۔ یہ تو اچھا تھا کہ گڑیا کا اسکول نزدیک ہی تھا۔ ورنہ زیادہ زحمت ہوتی راستے میں کچرے کے ڈھیرے سے بچ کر نکلتے ہوئے میری نظر ایک بچے پر مرکوز ہو گئی۔ بچے کی پشت ہماری طرف تھی اور وہ گٹھوں گٹھوں کچرے میں دھنسا ہوا چیتھڑے پلاسٹک کی تھیلیاں اور کاغذ وغیرہ بین بین کر ایک بوری میں بھر رہا تھا۔ مجھے اس پر وارث کا شبہ ہوا۔ لیکن اس وقت مجھے اسکول جانے کی جلدی تھی۔ اس لئے رکے بغیر آگے بڑھ گئی۔۔۔ پھر بھی دل میں ایک خلش

سی رہی — اور میں اپنے شبہے کی تصدیق کے لئے بے چین تھی۔ گڑیا کو اسکول پہنچا کر واپس ہوئی تو کچرے کے ڈھیر پر وہ لڑکا نظر نہیں آیا۔ دو کتے البتہ آرام کر رہے تھے۔ دوسرے دن ناظمہ آئی تو مجھے اس لڑکے کا ایک بار پھر دھیان آ گیا — اور میں نے گھما پھرا کر اس سے پوچھا —

''بہت دن سے تم وارث کو ساتھ نہیں لائیں؟''

''ارے میم صاحب اسے ساتھ لا کر اور پریشانی میں پڑ جاتی ہوں کبھی یہ چھو۔ کبھی وہ دیکھ۔ بڑا تنگ کرتا ہے۔''

''پھر تمہارے پیچھے کیا کرتا ہوگا۔ کسی کام وام پر کیوں نہیں بٹھا دیتیں اس کو؟''۔

''کام تو کرتا ہے جی۔ پر مجھے اچھا نہیں لگتا۔ مجبوری جو نہ کرائے کم ہے جی'' —

''کیا کام کرتا ہے وہ؟'' —

''میم صاحب۔ سارا دن گھوم پھر کر وہی کچرا چنتا ہے شام کو دو ڈھائی روپے مل جاتے ہیں۔ وہ باپ لے لیتا ہے۔''

''دارو کے لئے نا؟ — میں نے بوجھل آواز میں کہا —

'' —— اور کیا کرے گا وہ ناس پیٹا —؟ ناظمہ کچن میں چلی گئی۔

میرے شبہے کی تصدیق ہوگئی۔ وہ بچہ وارث ہی تھا۔ اس عمر میں وہ بے چارہ باپ کی دارو کے لئے غلاظت کے ڈھیر میں گھس کر ردّی چنتا ہے۔ آخر اس کا مستقبل کیا ہوگا؟۔ آگے چل کر وہ کیا کرے گا؟۔ زیادہ سے زیادہ ٹھیلا لے کر پھیری میں در۔ در بھٹک کر ردّی سامان خریدے اور بیچے گا۔ اور اس کے بچے ہوں گے تو شاید وہ بھی یہی کام کریں۔ یہ ایسی وراثت تو نہیں ہے جس پر فخر کیا جائے۔ اور میں نے ناظمہ سے بھی یہی بات کہی۔

''میم صاحب آدمی نکما نہ ہوتا تو وارث کے لئے بھی کچھ کرتا۔ لیکن اس نے تو اپنی زندگی بھی گندگی میں لوٹ پوٹ کر گزاری — آخر کھاٹ پر پڑ گیا۔ اب بچے کو بھی اسی کام پر لگا دیا ہے۔ کچھ کہتی ہوں تو لڑتا ہے۔''

ناظمہ۔ تم وارث کا نام اسکول میں لکھوا دو۔ اس کی پڑھائی کا خرچ میں دوں گی۔

اور تمہارے آدمی کو دارو کے پیسے الگ دوں گی۔ کل تم وارث کو نہلا دھلا کر اور صاف کپڑے پہنا کر لے آنا۔ میں جا کر اس کا داخلہ کرا دوں گی۔ اور ہاں ایسے نکمّے خود غرض اور بے حس آدمی کی بک بک پر دھیان دینے کے بجائے تم اپنے بچّے کے بارے میں سوچو آخر تمہارا ایک ہی تو بیٹا ہے"۔

ناظمہ آنکھوں میں آنسو بھرے چپ چاپ میری باتیں سنتی رہی۔ پھر مجھے دعائیں دیتی چلی گئی۔

میں نے وارث کا داخلہ ایک اچھے اسکول میں کرا دیا۔ اس کی کتابیں، سلیٹ، بیگ اور جوتے موزے وغیرہ بھی خرید دیئے۔ اب ناظمہ بڑی پابندی سے وارث کو اسکول پہنچانے اور لانے جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ ناظمہ کے ساتھ ہمارے گھر بھی آجاتا تھا۔ میں نے گڑیا کے کھلونوں سے اسے کھیلنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ شارب کو میں نے بڑے فخریہ انداز میں اپنے کارنامے کے بارے میں بتایا تو وہ مسکرا کر رہ گئے۔ اس وقت مجھے ان کی یہ مسکراہٹ بہت بری لگی۔ لیکن دل میں طے کر لیا کہ میں بھی جلد ہی ان کی اس طنزیہ مسکراہٹ کا جواب دوں گی۔ آخر انہوں نے میری حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے میرا مذاق اڑانے کی جسارت کیسے کی۔ لیکن افسوس اس کا موقع ہی نہیں آیا۔ اور شارب نے ایک دن آفس سے واپس آکر بڑے ٹھنڈے لہجے میں بتایا۔

"بیگم صاحبہ! وہ آپ کا خدمتِ خلق کا کارنامہ بُری طرح فیل ہو گیا۔"

"کیوں کیا ہوا؟"۔

"آج وارث صاحب پھر کچرے کے ڈھیر سے ہیرے جواہرات منتخب کر کے اپنی ذنبیل میں بھر رہے تھے۔"

"ناممکن — وہ وارث نہیں ہو سکتا۔" —

"تم ناظمہ سے پوچھ لینا۔"

"ضرور پوچھوں گی"۔ میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا اور ناظمہ کا انتظار کرنے لگی۔ جب وہ آئی تو میں جو غصّے میں بھری بیٹھی تھی۔ پھٹ پڑی۔

''ناظمہ — مجھے دھوکہ دیتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی؟''

''جی میم صاحب! میں نے کیا کیا؟''۔ناظمہ بوکھلا گئی۔

''وارث پھر وہی کام کرنے لگا۔ میں بے وقوف تھی جو سیکڑوں روپے خرچ کر کے اسے اسکول میں داخل کرایا — جواب دو — چُپ کیوں ہو؟''۔

''میم صاحب! اللہ کی قسم مجھے کچھ نہیں پتہ — میرے پیچھے وہ ناس پیٹا اسے بھیجتا ہوگا۔ میں آج ہی جا کر ان دونوں کی خبر لوں گی''۔

اگر اسکول کے لڑکوں نے یا ماسٹر نے اسے دیکھ لیا تو ایک منٹ بھی اسے اسکول میں نہیں رکھیں گے۔''

''اس لڑکے کا مقدر ہی خراب ہے میم صاحب۔''

ناظمہ روہانسی ہوگئی۔

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو ناظمہ۔ تم جان بوجھ کر اس کی زندگی برباد کرنے پر تلی ہو۔ اس میں مقدر کا رونا فضول ہے۔ اپنے آدمی کو سمجھاؤ کہ آئندہ وارث کو نہ بھیجے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''وہ میری مانے تب نا۔''

''ٹھیک ہے۔ نہ مانے میری بلا سے۔ میں تم سے بھی کوئی واسطہ نہیں رکھوں گی۔''

میں نے اوپری دل سے اسے دھمکی دی — تو وہ رونے لگی مجھے ترس آ گیا اور میں دیر تک اسے ساری اونچ نیچ سمجھاتی رہی۔

کئی دن سے ناظمہ کام پر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے فکر ہوئی تو پوچھتی پاچھتی اس کے گھر گئی۔ گھر کیا تھا کچی چونا جھڑی دیواروں کی ایک جھونپڑی تھی۔ دروازے کی جگہ ٹاٹ کا پردہ جھول رہا تھا۔ ناظمہ مجھے باہر ہی مل گئی۔ مجھے دیکھ کر رونے لگی۔ اور رو۔ رو کر بتایا کہ اس کا آدمی گزر گیا۔ میں نے دل میں کہا 'خس کم جہاں پاک'' مگر اوپری دل سے اسے تسلی دلاسہ دیا۔ اور کچھ پیسے دے کر لوٹ آئی۔ پھر ناظمہ آئی تو میں نے اس سے اپنے ہاں رہنے کے لئے اصرار کیا۔ ہمارا سرونٹ کوارٹر خالی پڑا تھا۔ ناظمہ بھی راضی ہوگئی۔ ویسے بھی اپنے گھر

میں اس کے لئے کیا دلچسپی تھی۔ ایک نام چار کا آدمی تھا۔ سو اب وہ بھی نہیں رہا تھا۔

وارث بڑی پابندی سے اسکول جانے لگا۔ اس کے اسکول کا سارا کام میں خود اپنے سامنے بٹھا کر کرواتی تھی ساتھ ہی اس کی تربیت کا بھی پورا خیال رکھتی تھی۔ یوں وہ روز بروز سنورتا گیا۔ ذہین تو تھا ہی میری توجہ نے اسے بہت جلد انسان بنا دیا۔ اچھی غذا سے اس کی صحت بھی خاصی ہوگئی تھی۔ کپڑے لتے سے بھی ہر وقت درست رہتا تھا۔ اس کی پوری شخصیت ایسی بدلی کہ خود شارب بھی اس پر توجہ دینے لگے۔ اس کے شائستہ اطوار۔ مہذّب اندازِ گفتگو اور شریفانہ رہن سہن دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ چند ماہ پہلے یہی لڑکا کچرے میں رہتا تھا۔

چند سال کے بعد ہمارا تبادلہ اپنے ہی شہر میں ہوگیا — تب کہیں جا کر ہمیں ذرا سکون نصیب ہوا۔ ایک تو اپنا گھر پھر عزیز اور رشتے دار بھی سب قریب ہوگئے۔ ناظمہ اور وارث بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اب تو وہ ہمارے گھر ہی کے فرد ہوگئے تھے۔ اس لئے انہیں چھوڑنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وارث کا تعلیمی سلسلہ بدستور جاری تھا۔ اور وہ ہر کلاس میں اچھی پوزیشن لے کر کامیاب ہوتا تھا۔ شارب بھی قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرتے تھے۔ اور صلاح مشورہ دینے کے علاوہ اس کی تعلیم پر بھی پوری توجہ دیتے تھے۔ سب سے زیادہ ہمیں اس کی یہ بات پسند تھی کہ اس نے کبھی اپنی حیثیت کو فراموش نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہماری نوازشوں کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ ہم اسے اپنے برابر کا سمجھتے تھے — اور کبھی کوئی بات ایسی نہیں کرتے تھے جس سے وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو یا خود کو ہم سے کم تر سمجھے۔ لیکن اس کی فطری شرافت نے شاید اسے ایک فاصلہ رکھنے پر مجبور کیا تھا۔

وقت کتنی جلدی گزرتا ہے اس کا احساس ہمیں اس دن ہوا جب گڑیا دلہن بنی اور بیاہ کر اپنی سسرال گئی ابھی کل کی بات ہے جب وہ خود گڑیوں کا بیاہ رچاتی تھی۔ اور جھنڈو لے بال لئے تتلیوں کے پیچھے بھاگتی پھرتی تھی۔ اپنی متاعِ حیات کو ہنسی خوشی دوسروں کے حوالے کر کے میں تہی داماں اور تہی دست رہ گئی۔ یہ بھی خدا کی مصلحت تھی کہ گڑیا کے بعد میرے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوا۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد اس لق ودق کوٹھی میں ویرانی کا بسیرا ہوتا۔ اگر وارث ہمارے پاس نہ ہوتا۔

میں نے ایک پیار بھری نظر وارث پر ڈالی۔ وہ سارا بکھرا ہوا سامان ملازموں کی مدد سے سمیٹ رہا تھا۔ اور سب کا حساب کتاب بیباق کر رہا تھا۔ اس کے بشرے سے تھکن ظاہر تھی۔ ہفتوں سے کام کرتے کرتے وہ کتنا ہلکان ہو گیا تھا۔ اگر وہ اتنی ذمے داری سے سارے اُمور انجام نہ دیتا تو تنہا شارب کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اسی وقت شارب بھی میرے قریب آ کر بیٹھ گئے۔ اور وارث کی مصروفیت کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے رہے۔

''بھئی اب وارث کو بھی آرام کرنے دیں۔ دیکھیں نا غریب کس قدر تھک گیا ہے۔''

میں نے کسی قدر ناراضگی سے کہا تو شارب مسکرانے لگے۔

''بیگم — آخر بیٹا ہوتا کس لئے ہے؟۔ اول تو وہ مجھے کوئی کام کرنے ہی نہیں دیتا — اگر کسی وقت کچھ کرنا بھی چاہوں تو وہ باتیں بنا کر مجھے صاف ٹرخا دیتا ہے۔''

''وارث — وارث بیٹے'' — شارب نے وہیں سے اسے آواز دے لی —

وارث قریب آ گیا۔ تو وہ ہنس کر کہنے لگے۔

''دیکھو تمہاری ممی ناراض ہو رہی ہیں۔ اب تم بالکل کام نہ کرو اور نہا دھو کر آرام کرو۔''

''پاپا — دو ایک کام نپٹا لیں پھر تو آرام ہی کرنا ہے۔''

''نہیں بھئی — اب باقی کام ہم کریں گے۔'' —

شارب اتنا کہہ کر اور پھیل کر اطمینان سے بیٹھ گئے۔

''ہاں وہ تو مجھے بھی پتہ ہے کہ اب سارا کام آپ کریں گے۔ اسی طرح لیٹے لیٹے۔'' میں نے ہنس کر کہا — اور وارث مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔

''بیگم گڑیا کے جانے کے بعد کیسا سناٹا محسوس ہونے لگا ہے اس کی وجہ سے گھر میں کتنی رونق رہتی تھی۔''

شارب اداس ہو گئے۔

''شارب آپ تو مرد ہیں۔ گھر سے باہر آپ کا وقت تو پھر بھی گزر جائے گا۔ میں گڑیا کے بغیر کیسے رہوں گی؟۔''

''اس کا انتظام بھی ہو جائے گا—''

''وہ کیا؟—''

''ہم جلد ہی وارث کی شادی کر دیں گے۔ اس کی دلہن بیاہ کر آئے گی۔ گھر میں ڈھیر سارے ننھے منے بچے کھیلیں گے اور ہمارا گھر ان کے معصوم قہقہوں سے کھلکھلا اٹھے گا۔''

''آپ نے وارث سے بھی پوچھا ہے؟''—

''پوچھنا کیا ہے۔ بس صاحبزادے کے کان میں بات ڈال دیں گے—'' شارب نے بے پروائی سے کہا۔

''کوئی لڑکی بھی دیکھی ہے یا یوں ہی شادی کا پروگرام بنا رہے ہیں؟

''ہمارا بیٹا منصف مجسٹریٹ ہے۔ اس کے لئے لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔ ہمارے آفس سپرنٹنڈنٹ نے تو اپنی بیٹی کے لئے خود ہی کہلوایا ہے۔''—

''ناظمہ زندہ ہوتی تو کتنا خوش ہوتی؟''—

میں ناظمہ کو یاد کر کے افسردہ ہو گئی—

''ناظمہ نے وارث کی تمام ذمّے داری ہمیں سونپ کر ہمارے اوپر سچ مچ بڑا احسان کیا۔ بیگم آج وہ ہمارا وارث ہے۔ اور اس نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جوہرِ ذاتی اصل چیز ہے۔

وارث نپے تلے قدم رکھتا ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس کا بلند و بالا سراپا۔ اور مردانہ وجاہت دیکھ کر مجھے ٹوٹ کر پیار آیا۔ اور میں نے اسے اپنے قریب بلا کر اس کی روشن پیشانی چوم لی۔

☆☆

حق بہ حق دار ——

زندگی کی گوناگوں مصروفیات میں انسان کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے کہ رومانس اور محبت جیسی دلکش اور لطیف باتوں کے بارے میں سوچ کر دل خوش کرے۔ شادی شدہ انسان کو تو مرنے کی بھی فرصت نصیب نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے باوجود مرد بد سے بدتر حالات میں بھی زندگی کی رنگینیوں سے لاتعلق رہنا نہیں چاہتا۔ خصوصاً شادی شدہ مرد رومانس کرنے کے لئے ہر وقت ہر حال میں تیار رہتا ہے۔ شاید اس کی یہی فطرت اس کو ہر عمر میں جوان اور زندہ دل بنائے رکھتی ہے۔ اور بڑھاپا دیر میں اس پر چھاپہ مارتا ہے۔ اس کے برخلاف صنفِ نازک ذمّے داریوں کے بوجھ تلے دب کر اپنے سارے لطیف جذبات اور نازک احساسات کو تھپک کر سلا دیتی ہے۔ اور قبل از وقت خود پر بڑھاپا طاری کر لیتی ہے۔

میں اپنی دونوں بیٹیوں کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ بیٹا موہت ابھی زیرِ تعلیم تھا۔ میڈیکل میں یہ اس کا آخری سال تھا۔ ذاتی گھر معقول آمدنی، فراغت اور سکون نے میری صحت پر خوش گوار اثر ڈالا تھا۔ کنپٹیوں پر چمکتے سفید بال عمر کی چغلی ضرور کھاتے تھے۔ لیکن نِشا کو دیکھنے کے بعد میں انہیں رنگنے لگا تھا۔ اب براؤن بال میری مردانہ وجاہت اور کشش میں اضافہ کرنے لگے تھے۔ نِشا میری اسٹینو تھی۔ اس نے حال میں یہ سروس جوائن کی تھی۔ سرو قد، خوبصورت غزالی آنکھیں۔ متبسّم ہونٹ۔ سنہری گندم جیسا رنگ۔ چمکیلے سیاہ بالوں کی ایک چوٹی۔ اور اس پر اس کی نرم گفتاری اور دھیمے مزاج نے اسے ایک پسندیدہ شخصیت بنا دیا تھا۔ دفتری امور میں بھی وہ خاصی ذمے دار تھی۔ میں اسے اکثر

لنچ ٹائم میں کافی کی دعوت دیتا تھا۔ جسے وہ خندہ پیشانی سے قبول کر لیتی تھی۔ اس دوران اِدھر اُدھر کی گفتگو بھی ہو جاتی تھی لیکن ابھی تک ذاتی معاملات زیرِ بحث نہیں آئے تھے۔ اوّل تو وہ خود ہی بے حد ریزرو رہتی تھی۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ میں دفتری اوقات میں اپنی افسرانہ شان برقرار رکھنے کی پوری کوشش کرتا تھا اور دفتر سے باہر رسم و راہ بڑھانے میں احتیاط برتتا تھا—یہی وجہ تھی کہ آج تک میرے متعلق کوئی اسکینڈل کھڑا نہیں ہوا تھا۔

ایک دن میں نے نشا کو اپنی کار میں لفٹ کی پیش کش کی جسے اس نے مسکراتے ہوئے قبول کر لیا۔ اس سے میرا حوصلہ بڑھا۔ اور میں اسے ایک کیفے میں لے گیا اس روز پہلی بار اس نے مجھے اپنے گھریلو حالات بتائے۔ اس کے پتا جی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ماں کے علاوہ دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ نشا ان میں سب سے بڑی تھی۔ چند مکانوں کا کرایہ آتا تھا—زندگی کی گاڑی اوسط رفتار سے چل رہی تھی۔ اس کے حالات نہ بہت اچھے تھے اور نہ اتنے خراب کہ ہمدردی کی آڑ لے کر میں اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا—لہٰذا میں نے تعلقات بڑھانے میں عجلت سے کام نہیں لیا۔ میں کبھی کبھی اسے لنچ پر کسی مہنگے ریسٹورنٹ میں مدعو کر لیتا تھا۔ کبھی کار سے اسے اس کے گھر چھوڑ آتا۔ اس طرح نشا پر میرے اچھے اخلاق کا سکّہ جم گیا۔ پھر نشا نے اپنی سالگرہ پر مجھے اپنے گھر بلایا۔ تو میں اس کے لئے ایک قیمتی ساڑی تحفے میں لے گیا۔

نِشا کی ماں ایک سیدھی، سادی گھریلو عورت تھی۔ دونوں بھائی بے حد ذہین اور مہذّب تھے۔ چھوٹی بہن ذرا شوخ اور ہنس مکھ تھی۔ ہمارا وقت بہت اچھا گزرا۔ وہ سب لوگ میری طبیعت کی سادگی۔ شرافت اور اخلاق سے بے حد متاثر ہوئے۔ نشا کی ماں نے کہا۔

"میں تو نشا کے دفتر میں نوکری کرنے کے خلاف تھی اکثر ایسی ویسی باتیں دفتروں کے بارے میں سننے میں آتی ہیں۔ لیکن آپ سے ملنے کے بعد میری ساری پریشانی دور ہو گئی۔"

میں نے مسکرا کر ان کی بات سنی اور شرمندہ ہونے کے بجائے دل ہی دل میں ان کی سادہ لوحی پر ہنسا۔ گھر کی بیٹھنے والی یہ نیک دل عورت کیا جانے کہ مردوں کے دل میں

کیسے کیسے شیطانی جذبات پرورش پاتے ہیں۔

نشا کی سالگرہ کی تقریب میں جانے کے بعد ہمارے درمیان تکلّف کی دیوار اتنی دبیز نہیں رہی میں نے پہلے اس کے حُسن کی تعریف نہیں کی تھی۔ لیکن اب میں اگلا قدم اٹھانے کے لئے وقت کا منتظر تھا۔

ایک روز ہم اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں لنچ لے رہے تھے۔ ہماری میز ایک گوشے میں تھی۔ جہاں سکون تھا۔ نِشا نے آسمانی پھولدار سوٹ پر ہم رنگ لہریا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال اس وقت اونچے سے جوڑے میں سمٹے ہوئے تھے چہرہ میک اپ کے بغیر بھی نکھرا نکھرا نظر آرہا تھا۔ میں نے ایک گہری نظر اس کے سراپا پر ڈالی۔ آہستہ سے کہا— ''نِشا— تم بہت خوبصورت ہو''—

اس نے اپنی دراز پلکیں اٹھا کر ایک پل مجھے دیکھا اور دوسرے لمحے اس کی نظریں جھک گئیں۔ اس نے میری تعریف کا کوئی اثر لیا یا نہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔ البتہ اس کے ہونٹوں پر ایک دلنشیں سی مسکراہٹ سج گئی تھی جو میری حوصلہ افزائی کے لئے ایک لطیف اشارہ بن گئی۔

''تمہاری سادگی میں جو حُسن اور کشش ہے۔ وہ میک اپ سے لپے پُتے چہروں میں نہیں ہوتی''—

''شکریہ سَر!'' نشا نے آہستہ سے کہا۔ اور کافی کا پیالہ میرے سامنے رکھ دیا۔

میں نے سوچا کہ آج کے لئے بَس اتنا ہی کافی ہے۔ اس لئے میں ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ شاید میرا رویّہ میری عمر کے عین مطابق تھا۔ ورنہ آج سے بیس سال پہلے نِشا مجھے ملی ہوتی تو شاید میری تعریف کا انداز ہی اور ہوتا۔ اور میں اتنی احتیاط بھی نہ برتتا۔

ایک دن نِشا آفس میں مجھ سے ڈکٹیشن لے رہی تھی کہ اچانک موہت آ گیا— میں نے نِشا کو رخصت کر دیا۔ موہت نے ایک اُچٹتی ہوئی نظر نِشا پر ڈالی اور پھر میری طرف متوجّہ ہو گیا۔

''کیسے آنا ہوا؟'' میں نے پوچھا—

''اِدھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا آپ سے ملتا چلوں''۔۔۔

وہ۔۔۔ دراصل میرے سوٹ تیار ہو گئے ہیں۔ میں ابھی ٹرائل دے کر آرہا ہوں''۔۔۔

میں نے پرس سے چند نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔

''تھینک یُو ڈیڈی''۔۔۔ موہت کھڑا ہو گیا۔ اور پھر اجازت لے کر چلا گیا۔

اس کے بعد موہت کبھی کبھی آفس آنے لگا۔ نِشا سے اس کا تعارف ہوا۔۔۔ تو رسمی سلام دعا کے دروازے کھل گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ نشا۔ موہت کی عزت کرتی ہے۔ آخر وہ اس کے باس کا نورِ نظر تھا۔ لیکن نِشا کو دیکھ کر موہت کی آنکھوں میں جو چمک پیدا ہوتی تھی۔ وہ میری نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس کا بار بار میرے آفس آنا بھی کوئی معنی رکھتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے موہت کا نشا میں دلچسپی لینا اچھا نہیں لگا۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ میں اس سے کھل کر بات نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ وہ میرا بیٹا تھا اور باپ بیٹے کے درمیان اتنا پردہ تو رہنا ہی چاہئے تھا۔۔۔ میں نے نشا پر اپنی مہربانیاں کچھ اور بڑھا دیں۔ میرا خیال تھا کہ جتنی زیادہ وہ میری ممنون ہو گی اتنی ہی تیزی سے میری طرف جھکتی جائے گی اور یوں میری منزل آسان ہو جائے گی۔۔۔ ابھی تک موہت اتنا آگے نہیں بڑھا تھا کہ مجھے اس کے اور نشا کے تعلقات میں کوئی بات قابلِ اعتراض نظر آتی۔۔۔ محض نظروں میں پسندیدگی کی جھلک دیکھ کر کوئی فیصلہ کرنا مشکل تھا۔

یوں بھی میرا خیال تھا کہ اس کے لئے ڈاکٹر لڑکی کا انتخاب موزوں رہے گا۔ میرے ملنے والوں میں چند خاندان ایسے بھی تھے۔ جن کی بیٹیاں ڈاکٹری پڑھ رہی تھیں اور میں جس وقت چاہتا رشتہ طے کر دیتا۔ لیکن مجھے اس کی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار تھا۔ حالانکہ میری بیوی کئی بار بیٹے کا رشتہ طے کرنے کی بات کہہ چکی تھی۔ لیکن میری خواہش تھی کہ موہت یکسوئی سے اپنی تعلیم پوری کر لے۔ خود اس کا بھی یہی خیال تھا۔ مجھے اس کی شادی کی اتنی جلدی بھی نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ نشا میں اس کی دلچسپی محض پسندیدگی کی حد تک ہو۔ یا پھر یہ نوجوانی کی ترنگ ہی ہو اس عمر میں ہر لڑکی نظروں کو بھاتی ہے۔ پھر نشا تھی

بھی خوبصورت۔اس کو دیکھ کر تو کوئی بھی نوجوان متاثر ہوسکتا تھا۔

ایک دن میں نے لنچ ٹائم میں نشا سے کہا۔

آج میری برتھ ڈے ہے۔کیوں نہ ہم باہر کہیں ڈنر لیں؟''

''آپ گھر پر اپنی برتھ ڈے نہیں مناتے''؟—

''اوہ— نہیں بھلا اس کی کیا ضرورت ہے؟''—

میں نے جلدی سے کہا— میں کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ اس عمر میں اپنی برتھ ڈے منانا اچھا نہیں لگتا۔لیکن اپنی زبان سے اپنی عمر کا تذکرہ کرنا مناسب بھی نہیں تھا۔پھر میں نے کبھی اپنی برتھ ڈے منائی بھی نہیں تھی— یہ تو نشا کو بلانے کا بس ایک بہانہ تھا— ابھی تک شام کے وقت وہ کہیں میرے ساتھ نہیں گئی تھی۔میں نے سوچا کہ اگر ایک آدھ بار وہ باہر میرے ساتھ شام گزارے گی تو تعلقات مزید بڑھنے کا امکان پیدا ہوگا۔مجھے یقین تھا کہ وہ میری بات نہیں ٹالے گی۔ہوا بھی یہی۔نشا نے مجھے برتھ ڈے کی مبارکباد دی اور ساتھ ہی نہایت خوش گوار موڈ میں ایک درخواست بھی کر ڈالی۔

''مجھے آپ کی دعوت قبول کر کے خوشی ہوگی سَر — لیکن یہ دعوت میری طرف سے ہوگی—''

''اس تکلّف کی کیا ضرورت ہے نشا! برتھ ڈے میری ہے اس لئے اصولاً دعوت میری طرف سے ہوگی''—

''کبھی کبھی اصول سے ہٹ کر بھی خوشیاں منائی جاسکتی ہیں۔آپ یہ سمجھیں کہ یہ میری دلی خواہش ہے۔''

''اوہ— اگر ایسی بات ہے تو میں تمہاری خواہش ضرور پوری کروں گا۔''—

میں نے متانت سے گویا اس پر احسان جتاتے ہوئے کہا ''تھینک یُو سَر''—

نشا پھول کی طرح کِھل اٹھی۔اس سے بھی زیادہ میں خوش تھا۔پروگرام کے مطابق ہم 'رٹز' میں ڈنر لینے گئے۔جب تک بیرا میز پر لوازمات سجاتا رہا ہم ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔نشا کچھ مضطرب سی نظر آرہی تھی۔شاید اس طرح رات کے وقت میرے

ساتھ آنے کے باعث گھبرائی ہوئی تھی۔ سیاہ ساڑی میں وہ اس وقت غضب ڈھا رہی تھی۔ اس کی گھبراہٹ نے اس کی معصومیت میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔

اچانک میں نے اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں کو دیکھا۔ اور اس کی نظروں کے تعاقب میں میری نظریں داخلی دروازے تک جا کر جامد ہو گئیں۔ موہت ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سرخ ربن سے بندھا ایک ڈبہ تھا۔ اور پھر اس نے ہمارے قریب آ کر وہ ڈبہ میز پر رکھ دیا۔ جھک کر میرے گال کا بوسہ لیا۔ اور محبت سے بولا۔

''سالگرہ مبارک ہو ڈیڈی''

''شکریہ موہت — لیکن تم یہاں۔ میرا مطلب ہے ——''

ہم آپ کو سرپرائز دینا چاہتے تھے ڈیڈی''——

اس نے مسکرا کر نشا کو دیکھا جس کا چہرہ گلگوں ہو رہا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے ربن کھول کر کیک نکال رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے کیک میز پر سجا دیا گیا۔ اور ایک موم بتی اس پر لگا کر روشن کر دی گئی۔

''ڈیڈی پلیز کیک کاٹیں۔''

موہت نے میرے ہاتھوں میں چھری تھما دی — میں نے پھونک مار کر موم بتی بجھائی۔ تو نشا اور موہت نے آہستہ آہستہ تالیاں بجا کر دھیمے سُروں میں ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو'' گایا۔ دونوں کی آنکھوں میں روشن چراغوں جیسی چمک تھی۔ اور ہونٹوں پر پیاری سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ مجھے ان پر ٹوٹ کر پیار آ گیا۔ کیک کاٹنے کے بعد میں نے اپنے ہاتھ سے ایک پیس نشا کے منہ میں دیا۔ اور دوسرا موہت کے کھلے ہوئے منہ میں رکھ دیا۔ دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے میں نے باری باری ان کی پیشانی پر بوسہ ثبت کیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس وقت نشا کی پیشانی چومتے ہوئے میرے دل میں شیطانی جذبات کا دور — دور تک پتہ نہیں تھا۔ اور نہ کسی قسم کی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ بلکہ میں نے پورے اعتماد سے اسے پیار کیا تھا۔ ایسے ہی جیسے موہت کو کیا تھا پھر ہم خوش دلی سے کھاتے پیتے رہے اور مزے مزے کی باتیں کرتے رہے۔ جب نشا نے بل دینے کے لئے اپنا پرس کھولا۔ تو میں

نے اس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''نشا — آئندہ میرے سامنے اپنا پرس کبھی نہ کھولنا — یہ میرا فرض ہے۔ اسے میرے پاس ہی رہنے دو — البتہ موہت کے حقوق میں تمہیں سونپ رہا ہوں — نشا نے شرما کر سر جھکا لیا۔ موہت شوخ نظروں سے اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا — پھر میں نے کار کی چابی موہت کی طرف بڑھا کر کہا —

''موہت بیٹا نشا کو گھر چھوڑ آؤ'' —

''لیکن ڈیڈی آپ ——— ؟'' —

''میں تمہارا اسکوٹر لئے جا رہا ہوں'' —

میں نے نشا کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا۔ موہت کا شانہ تھپتھپایا۔ اور پُر اعتماد قدموں سے باہر کی طرف بڑھ گیا۔

میرے دل نے کہا۔ ''محبت کرنا موہت کا حق تھا۔ میرا نہیں۔ اور اس وقت میں اپنے دل کے فیصلے پر بے حد مسرور تھا ———

☆☆

سُکھ سنسار

سب کہتے ہیں کہ میں بہت خوش نصیب ہوں۔ اور سچ مچ میں ہوں بھی ایسی ہی۔ یعنی خوش نصیب — ایک خوش حال خاندان — اور دولت مند شوہر — پیارے پیارے دو بچے — بنگلہ، کار — ملازم — قیمتی ملبوسات اور لاکر میں اَٹا اَٹ بھرے زیورات ایک عورت کو اور کیا چاہیے۔ یہی سب چیزیں تو خوش قسمتی کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ بلکہ جب سے انسانوں میں شادی بیاہ کا چلن عام ہوا ہے۔ اس وقت سے آج تک عورت کی قسمت کا پیمانہ یہی رہا ہے۔

میرے شوہر ایک پرائیوٹ فرم میں جنرل مینجر ہیں اس کرسی تک پہنچنے کے لئے انہوں نے ہر وہ حربہ آزمایا جو ضروری تھا۔ اس کے لئے بے چارے نے جائز اور ناجائز کا بھی لحاظ نہیں رکھا۔ کہتے ہیں محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ یہ بھی تو ایک طرح کی جنگ ہی تھی۔ اب اگر سابق مینجر جو جنرل مینجر کی پوسٹ کے لئے متوقع امیدوار تھا۔ ایک کار ایکسیڈنٹ میں بھگوان کو پیارا ہو گیا تو اس میں میرے شوہر کا کیا قصور؟ — اس کے بعد تو بَس وہی وہ تھے۔ اور انہیں یہ پوسٹ طشتری میں سج کر مل گئی۔ یہ طشتری انہوں نے صرف دس ہزار میں خریدی تھی — شہر کا نامی گرامی بدمعاش اپنے گرگوں کے ذریعے اکثر ایسے نیک کام کراتا تھا — اور بدلے میں نوٹ حاصل کرتا تھا — وہ تو اتفاق سے میں نے ان کی گفتگو سُن لی۔ ورنہ میرے فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلتا کہ اس گھر کی خوشیاں تک خون آلودہ ہیں۔ بَس اس دن سے میری خوشیاں دُکھ کی آگ میں جل کر خاک ہو گئیں پھر فرم کے

ڈائریکٹر چڈھا صاحب کی پتنی کو برتھ ڈے میں جراؤ سیٹ تحفے میں دینے کے علاوہ ان کے بچّوں کو مسوری کے اسکول میں داخلہ دلانے سے لے کر ان کو پاس کرانے تک سب ہی ذمّے داریاں میرے شوہر نے بڑے خلوص سے نبھائیں۔ اور ان ساری خدمات کے صلے میں وہ ان کے خاص آدمی بن بیٹھے — حالانکہ پہلے والا جنرل منیجر بڑا فرض شناس تھا — اور ان سے سخت ناراض رہتا تھا۔ اس نے تو ان کا پرموشن تک روک دیا تھا — اور کئی بار فرائض سے غفلت کے الزام میں جواب بھی طلب کر چکا تھا — لیکن انہوں نے بھی قسم کھائی تھی کہ وہ اس عہدے تک پہنچ کر دکھائیں گے۔ انہوں نے تو اور بھی بہت کچھ دکھایا اور میں نے دیکھا — کیونکہ میرا کام تو بس دیکھنا ہی تھا — اب تو میں سب کچھ دیکھنے اور سہنے کی عادی ہو گئی ہوں —

صبح سے شام تک میں ایک روبوٹ کی مانند گھر کے فرائض انجام دیتی ہوں — رات میں بھی بچّوں کو آیا کے سپرد کر کے۔ سج بن کے اپنے افسردہ چہرے پر ہنستا مسکراتا مکھوٹا لگائے۔ پتی دیو کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کلب جاتی ہوں — پارٹیوں میں شرکت کرتی ہوں۔ اور شوہر کے دوستوں میں بیٹھ کر اونچے اونچے قہقہے لگاتی ہوں۔ یہی نہیں 'ایٹی کیٹس' کے نام پر کوک میں انگور کی بیٹی ملا کر معدے میں اتارتی ہوں۔ پپلو بھی کھیلتی ہوں۔ اور ڈانس بھی کرتی ہوں اور جب آدھی رات کے بعد گھر آتی ہوں تو ذہنی اور روحانی طور پر اتنا تھک جاتی ہوں کہ میرے سارے جذبے بھی میرے ساتھ ہی سو جاتے ہیں۔ مجھے اس وقت یہ بھی فکر نہیں ہوتی کہ مسز فلاں۔ یا مسز ڈھمک جو ہم سے لفٹ لے کر کلب سے ہمارے ساتھ آئی تھیں کب تک یہاں بیٹھ کر ڈرنک کرتی رہیں۔ کب واپس گئیں یا رات میں یہیں رہیں؟ شوہر سمجھتے ہیں کہ میں نشے کی وجہ سے اپنی سوجھ بوجھ کھو چکی ہوں انہیں کیا معلوم کہ میں اعصابی تناؤ کا شکار ہوں اور تھکن سے چور — اپنے وجود کی کرچیاں سیج پر سجائے بکھری پڑی ہوں —

میرے دونوں بچّے — ایکتا اور انکت جس وقت اسکول جاتے ہیں۔ میں گہری نیند میں ہوتی ہوں — البتہ ان کے اسکول سے واپس آنے کے بعد ایک دم فریش ہو کر ان کا

استقبال کرتی ہوں۔ کھانا ہم سب ساتھ ہی کھاتے ہیں شام کی چائے پر کبھی کبھی 'پتی دیو' بھی موجود ہوتے ہیں اور بچّوں کو اپنے باپ ہونے کا پورا ثبوت دیتے ہیں۔ پھر ہم بچّوں کو ساتھ لے کر سیر کرنے جاتے ہیں اور انہیں ان کی پسند کی آئس کریم اور برگر وغیرہ کھلاتے ہیں پھر انہیں گھر چھوڑ کر آیا کو ان کے کھانے اور سونے کے متعلق ہدایات دے کر باہر چلے جاتے ہیں۔ بچّوں کا ہوم ورک کرانا اور ان کی پڑھائی کی فکر کرنا ٹیوٹر کی ذمّے داری ہے۔ آخر اسے تنخواہ بھی تو اسی کی ملتی ہے۔ ہم تو بس ان کی سالانہ رپورٹ دیکھنے کا فرض ادا کرتے ہیں۔ اور ہاں۔ اسکول کی پیرنٹس میٹنگ میں بھی باقاعدگی سے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ بھی فیشن میں شامل ہو چکا ہے۔

یہ روٹین یوں ہی چلتا رہا— شاید کچھ سال اور یہی سب چلتا— اس بیچ ایک حادثہ ہو گیا۔ میں تو اسے حادثہ ہی کہوں گی— ہوا یہ کہ اس دن ایکتا اپنے دوست پرمود کو گھر لے آئی۔ آپ سمجھ دار ہیں۔ اتنا تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ اب ہمارے بچّے جوان ہو چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں اس کی خبر ہی نہیں ہوئی— اور ہوتی بھی کیسے— جب کہ ان کو جوان کرنے میں ہم نے کوئی محنت نہیں کی تھی۔ ان کو اپنی آنکھوں سے پَل پَل بڑھتے نہیں دیکھا— ان کے جوانی میں قدم رکھنے کے خوف نے ہماری نیندیں نہیں اڑائیں۔ ان بچّوں کو تو آیا اور ٹیوٹر نے جوان ہوتے دیکھا۔ گھر کی بے جان دیواروں نے انہیں بڑھتے دیکھا— لان کے پیڑ پودوں نے انہیں سرو قد ہوتے دیکھا—

ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ اس دن ایکتا اپنے دوست پرمود کو گھر لے کر آئی۔ شاید ہم سے ملانے میرے پتی جو ایکتا کے پتا۔ یعنی ڈیڈی بھی ہیں اس وقت گھر پر ہی تھے۔ بیٹی کے دوست کو دیکھ کر ان کی غیرت جوش میں آ گئی۔ اور پل بھر میں وہ ایک غیّور دار اور فرض شناس باپ بن گئے۔ پرمود کو تو انہوں نے کھڑے کھڑے نکال دیا۔ بیٹی کو مارنے کے لئے بڑھے تو میں ان کے سامنے آ گئی۔ اور ایکتا کو اپنی پشت پر کر لیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ جوان بیٹی پر ہاتھ اٹھانا آپ پر شوبھا نہیں دیتا۔ اگر اولاد غلطی کرے تو اس کو ٹوکنا ہمارا فرض ہے"—

''اس کی ہمت کیسے ہوئی اس لونڈے کو گھر لانے کی؟ وہ غصّے سے کف اڑاتے ہوئے دھاڑے — میں نے ایکتا کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا تو وہ بالکل ہی آپے سے باہر ہو گئے —

''تمہاری ہی شہہ نے بچّوں کو بگاڑا ہے'' —

''کاش میں ایسا کر سکتی — لیکن مجھے تو اتنا بھی وقت نہیں ملا کہ انہیں بگاڑ سکوں — بنانے کا تو خیر سوال ہی نہیں اٹھتا۔'' میں نے افسردگی سے کہا —

''تم کیسی ماں ہو؟'' وہ الجھ کر بولے —

''یہی تو افسوس ہے کہ میں ان کی ماں ہو کر بھی ایک ماں کے فرائض ادا نہیں کر سکی۔ اور نہ ہی آج سے پہلے کبھی تم نے باپ ہونے کا ثبوت دیا۔ بلکہ میں تو ایکتا اور پرمود کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے تمہیں یہ احساس تو دلایا کہ تم دو بچّوں کے باپ بھی ہو'' —

''میں — میں جو کچھ کرتا ہوں انہیں کے لئے کرتا ہوں — دن رات محنت کر کے پیسہ کماتا ہوں — یہ ٹھاٹ باٹ — تمہارے میکے والوں کی دولت پر نہیں ہوتے'' —

''میکے کا طعنہ دینا بیکار ہے۔ انہوں نے تو ایک سیدھے سادے شریف انسان کو بیٹی دی تھی۔ یہ دولت اور عیش و آرام کس کام کا جس نے ان کی بیٹی کو دکھوں کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا۔ اور وہ غریب تم سے اپنی بیٹی کے دکھوں کا حساب بھی نہیں لے سکتے'' —

''دُکھ — ؟ کیسے دُکھ؟ —— یہ بنگلہ — کاریں آرام و آسائشیں تمہیں سُکھ نہیں دے سکتے تو جا کر کسی بھکاری کے ہاں مری ہوتیں۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟''

''ہاں — میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جب ہی تو تمہارے دیئے ہوئے سُکھ کا احسان نہیں مانتی۔ کبھی تم سے یہ نہیں پوچھتی کہ اتنی دولت کہاں سے آتی ہے۔ تمہاری ٹوہ نہیں لگاتی — تمہاری مصروفیات کا حساب نہیں مانگتی کبھی کسی حرکت پر اعتراض نہیں کرتی — لیکن یہ جو اچانک تمہیں باپ بننے کا شوق چرایا ہے — اس پر ضرور اعتراض ہے مجھے — آج تک تم نے بچّوں کی پرورش یا تعلیم و تربیت میں کوئی دلچسپی نہیں لی — کبھی باپ بن کر

ان کے مستقبل کے بارے میں نہیں سوچا تو اب تمہیں کیا حق ہے کہ ان کے ذاتی معاملات میں ٹانگ اڑاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی تم پر زبان کا وار کر بیٹھیں۔ کیونکہ تمہاری زندگی کا ہر لمحہ —ہر پل ان کے سامنے ہے—اور یہ بچے اپنی ماں کی طرح بے زبان بھی نہیں ہیں"—

میری کھری کھری باتیں سن کر شوہر صاحب لال پیلی آنکھوں سے مجھے گھورتے رہے—اور پھر کار کی چابی اٹھا کر تنتناتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد ایکتا سہمی ہوئی میرے پاس آ گئی اور میرے سینے سے لگ کر رونے لگی— میں نے اسے پیار کیا۔ اس کا منہ ہاتھ دھلوایا اور اسے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلائی۔ اب وہ کسی حد تک نارمل تھی— میں نے اپنے ہونٹوں پر سہیلیوں جیسی مسکراہٹ سجا کر بڑی راز داری سے پوچھا—

"یہ مودی کیسا لڑکا ہے ایکتا؟"—

———وہ پرمود کو مودی کہتی ہے۔ جب لڑکی— لڑکے کا پورا نام نہ لے کر اسے پیار کے چھوٹے سے نام سے پکارے تو ماں کو سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ معاملہ محض دوستی تک محدود نہیں۔ بلکہ بات ذرا آگے تک جا چکی ہے۔ اور ماں باپ کا آشیرواد انہیں ہمیشہ کے لئے ایک کر سکتا ہے۔ سو میرا سوال سن کر وہ شرما گئی اور آہستہ سے بولی۔

"ممی—وہ—وہ—بہت اچھا ہے"۔

"—اور تم سے پیار بھی کرتا ہے—ہے نا؟"

"اوہ ممی تم کتنی اچھی ہو؟"—

وہ مجھ سے لپٹ گئی— میں نے پرمود کے بارے میں تفصیل سے ہر بات پوچھی—اور مطمئن ہو گئی۔ دوسرے دن میں پرمود کے گھر جا کر اس کے ماتا پتا سے ملی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ سب لوگ ایکتا سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہی نہیں وہ لوگ اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ وہ اکثر وہاں جاتی رہتی تھی— اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے بہت قریب تھے—انہیں اس کی خوشیوں کا پورا خیال تھا اور انہوں نے ایکتا کو اپنی ہونے والی بہو کے روپ میں قبول کر لیا تھا۔ اس کے برعکس ہم نے پرمود کو کیا دیا؟ ذلت و

خواری اور یہ سب محض اس لئے تھا کہ ہم اپنے بچّوں سے دور تھے—

میں نے پرمود سے اپنے پتی کے رویّے کی معذرت کی۔ وہ ہنس دیا—

''آنٹی! میں جانتا تھا کہ یہی ہوگا— میں نے منع بھی کیا تھا۔ لیکن وہ اپنے ساتھ لے گئی— دراصل ہمیں اوّل اول اپنے ماں باپ کو اپنے اعتماد میں لینا چاہئے اگر انہیں اندھیرے میں رکھا جائے تو پھر اچانک جب کوئی بات انہیں معلوم ہوگی تو اس کا ردِّ عمل وہی ہوگا— جو انکل کا ہوا''—

اب میں اس سے کیا کہتی کہ ہمارے جیسے ماں باپ جو خود اندھیروں میں بھٹک رہے ہوں۔ وہ بچّوں کے اعتماد کے لائق نہیں ہوتے۔

ایکتا اور پرمود کا رشتہ پکّا ہوگیا۔ میں نے پتی دیو کو بیاہ کی تاریخ سے مطلع کر دیا۔ پہلے تو لگا کہ وہ غصّے میں مجھے شوٹ ہی کر دیں گے۔ میں بھی پوری طرح تیار تھی— لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ انہوں نے خاموشی سے چیک بک میری طرف بڑھا دی۔

ایکتا کی شادی کے بعد میں نے ایک دم ساری مصروفیات ترک کر دیں۔ کلب، پارٹیاں، فنکشن سب کو خیر باد کہہ دیا۔ شروع میں تو اِدھر اُدھر کے بہانے کرتی رہی۔ اور پتی دیو کو ٹالتی رہی لیکن جب ان کا اصرار ضِد کی صورت اختیار کر گیا— تو میں نے صاف جواب دے دیا— بس بہت ہوگیا شریمان جی اب تک میں آپ کی پتنی بن کر رہی ہوں۔ اب اپنے بچّوں کی ماں بن کر رہنا چاہتی ہوں۔ میری مانئے تو اب آپ بھی ساری خرافات سے توبہ کر کے اپنے گھر پر توجہ دیجئے— یہ نہ بھولئے کہ آپ کا بیٹا بھی جوان ہو چکا ہے اور میں نے بہو بھی پسند کر لی ہے''۔

''تم نے بہو پسند کر لی ہے یا بیٹے نے خود ہی کوئی لڑکی پسند کر کے ہمارے اوپر مسلّط کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟۔

آدمی تیز تھا— ایک دم بات کی تہہ تک پہنچ گیا—

''اس کی اور ہماری پسند الگ تو نہیں ہے— میں نے بھی گول مول جواب دیا۔

''آخر کون لڑکی ہے۔ اس کے ماں باپ کا اسٹیٹس کیا ہے۔ ہمیں جہیز کتنا دیں

گے۔ ہمارا انکت کوئی معمولی لڑکا نہیں ہے"

"جانتی ہوں — لیکن جہیز میں پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی — کیونکہ شپرا خود ایک انمول رتن ہے"

"شپرا — ؟ — نام تو کچھ سنا ہوا ہے۔"

"ضرور سنا ہوگا — بلکہ آپ نے اسے دیکھا بھی ہوگا — پچھلے دنوں آپ کے ہاں انکم ٹیکس کا جو چھاپہ پڑا تھا۔ وہ شپرا کا ہی کارنامہ تھا"۔

"یعنی شپرا تیاگی — انکم ٹیکس افسر؟" —

"جی وہی —" میں نے فخریہ اقرار کیا۔ پتی دیو کی شکل اس وقت دیکھنے والی تھی۔ مجھے ذرا سا دُکھ بھی ہوا۔ لیکن ہنسی زیادہ آئی۔ خصوصاً یہ سوچ کر کہ شپرا نے اپنے ہونے والے سسر کو کیسا تگنی کا ناچ نچایا تھا۔ کچھ دیر سوچ کر بولے۔

"اب میں سمجھا اس سازش میں تمہارا انکت بھی شامل تھا — کم بخت آستین کا سانپ — جس نے دودھ پلایا اسی کو ڈس لیا"

"تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ تمہارا بیٹا ایک فرض شناس انسان اور ایمان دار افسر ہے۔ اور اس بات کے لئے تم جتنا پچھتاؤ کم ہے کہ اس کا کردار اور کیریر بنانے میں تمہاری تربیت کا ذرا بھی ہاتھ نہیں ہے۔ ورنہ آج تم اسے کوسنے کے بجائے اس پر فخر کرتے۔ اب یہ نہ کہنا کہ بچوں کو میں نے بگاڑا ہے — بھگوان کی سوگند۔ میں نے ان کے لئے اچھا برا کچھ نہیں کیا"۔

میں نے مسکین صورت بنا کر کہا۔" —

میں تمہاری شرارت خوب سمجھتا ہوں" —

پتی دیو کے ہونٹوں پر ایک میٹھی مسکان دیکھ میں بے ساختہ ہنس پڑی۔

"کچھ پتہ ہے کہ اس شپرا کی بچی نے فرم کو کتنے لاکھ کی چپت دی ہے — اور یہ انکت — اس سے تو میں اچھی طرح سمجھوں گا — کم بخت گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھانے لگا" —

انہیں پھر غصہ آ گیا—

''تم نے بھی غضب کیا کہ حساب کتاب کے سارے سیاہ وسفید کھاتے گھر لے آئے یہ نہ سوچا کہ ایک موذی گھر ہی میں موجود ہے'' میں نے اور چڑایا۔

''اس الّو کے پٹھے کو انکم ٹیکس میں جانے کی صلاح کس نے دی تھی۔ اور کہیں ملازمت نہیں ملی اسے؟''—

''صلاح کون دے گا— وہ خود عقل وشعور رکھتا ہے— سوچا ہوگا کہ کوئی ایسی جاب کرے کہ اپنا باپ بھی ہمیشہ ڈرتا رہے—''

میرا جواب تھا—

''اور اب شپرا بھی اس گھر میں بہو بن کر آنے والی ہے۔ یعنی ''یک شد نہ دو شد'' دیکھو کیا گل کھلاتے ہیں یہ دونوں انکم ٹیکس افسر''——

''گھبراؤ نہیں وہ کتنی بھی لاٹ صاحب ہو۔ اس گھر میں اسے ہندوستانی بہو بن کر ہی رہنا ہوگا— ورنہ—؟''

ورنہ کیا؟''—

''میں نے ابھی سے پانچ لیٹر مٹی کے تیل کا انتظام کر لیا ہے۔''

میں نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا—

''اچھا— تو یہ ارادے ہیں؟''—

وہ ہنسے تو میں بھی ہنس دی۔

''شکر بھیج کہ اس نے تیرے پتی کو بخش دیا— ورنہ تجھے دو چلّو پانی تلاش کرنا پڑتا۔ ڈوبنے کے لئے''

''اب میں اتنی بھی غیرت دار نہیں ہوں شریمان کہ آپ کے بدلے خود ڈوب مروں؟''——

''ٹھیک ہے— مت ڈوب یہ لے چیک بک اور بیٹے کے بیاہ کا انتظام کر''—

پتی دیو نے حسبِ عادت چیک بک بڑھائی۔

''رہنے دیں — انکت نے کہہ دیا ہے کہ بیاہ کا سارا خرچ وہی کرے گا۔''

میں نے فخریہ بتایا۔

''ہُوں اب سمجھا کہ اتنا کیوں اینٹھ رہی ہو۔ بیٹے کی کمائی کا غرور ہو گیا ہے نا؟''۔

''غرور نہیں سُرور — نشہ''—

میں نے بڑی ترنگ میں آ کر کہا—

سچ مچ اب تو مجھے بھی اپنی خوش نصیبی پر یقین ہو چلا ہے۔ دکھوں کے ساگر میں ڈوب کر ہی یہ انمول موتی ہاتھ آیا ہے—

☆☆

کھوٹا سکّہ

آج وہ برسوں بعد میرے سامنے تھی۔ اس کے لبوں پر وہی مخصوص مسکراہٹ سجی تھی جو اس کی شخصیت کی پہچان تھی۔ اور میں جب بھی اسے یاد کرتی۔ اس سے پہلے اس کے مسکراتے ہوئے گلابی ہونٹ میرے تصوّر میں ابھر آتے۔

''ہیلو آشو ـــــ کیسی ہو؟''

میں اسے اپنے سامنے دیکھ کر خوش ہوگئی۔

''تھینک یُو ڈاکٹر ـــــ میں ٹھیک ہوں ـــ اور آپ؟''

''فائین ـــ تم بتاؤ اتنے دن کہاں رہیں؟'' ـــ

''کبھی کہیں ـــ کبھی کہیں ـــ اور کبھی کہیں بھی نہیں ـــ

کوئی ایک جگہ ہو تو بتاؤں ـــ فی الحال امریکہ سے آرہی ہوں ـــ'' وہ میرے سامنے بیٹھ گئی ـــ

'' ـــ لیکن ـــ میں نے تو سنا تھا کہ تم نے شادی کر لی کیا نام تھا اس کا ـــ؟''

''انکت'' ـــ اس نے دھیرے سے کہا۔

''کیسا ہے وہ ـــــ کیا اب بھی تمہیں اسی طرح پیار کرتا ہے؟'' میں نے شریر لہجے میں چھیڑا ـــــ

''ڈاکٹر ـــ یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے؟''

''تو کیا تم نے اس سے؟'' ـــ کچھ شاک سا لگا۔

''نہیں—'' وہ جیسے پاتال کی گہرائی سے بولی۔

''اوہ— میں سمجھ رہی تھی کہ تم دونوں شادی کر کے خوش وخرم ہو گے؟''—

''میں نے شادی تو کی تھی— لیکن انکت سے نہیں ہیزل سے— وہ بھی 'جسٹ فار انجوائے منٹ' نہ وہ سیریس تھا— اور نہ ہی میں بس ایک تجربہ کیا تھا۔''

وہ مسکرائی—

''ایک منٹ آشو—'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''شادی بیاہ زندگی، بھر ساتھ نبھانے کا عہد ہوتا ہے ایک خوبصورت معاہدہ— جسٹ فار انجوائے منٹ کرنے کے لئے تو ڈھیروں دلچسپیاں ہیں —— لیکن شادی——؟''

میں نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا—

''ڈاکٹر! میں انکت کے لئے سیریس تھی— لیکن میں اس کے گھر والوں کے معیار پر کھری نہیں اتری۔ تو اس نے ماں باپ کی پسند سے ایک مالدار لڑکی سے بیاہ کر لیا''—

''مانا کہ اس نے غلط کیا— لیکن یہ ہیزل؟''—

''آپ کو یاد ہو گا میری ایک بہن امریکہ میں ہے۔ ہیزل وہیں ملا تھا— اور میں اسے وہیں چھوڑ کر واپس آ گئی''—

''تم بہت نادان ہو آشو۔ امریکن بھی کہیں بھروسے کے لائق ہوتے ہیں۔ یہ تو ہونا ہی تھا''—

''ہمارے ہندوستانی مرد بھی کچھ کم نہیں ہوتے ڈاکٹر'' وہ تلخی سے مسکرائی تو میں شرمندہ ہو گئی۔ یقیناً وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ نرمل سے میری 'لو میرج' ہوئی تھی۔ لیکن یہ شادی دو سال سے زیادہ نہیں چل سکی۔ اور وہ مجھے ایک بیٹی کا تحفہ دے کر اور میری ذمّے داریوں میں اضافہ کر کے اپنا دامن جھٹک کر الگ ہو گیا۔

''مونی کیسی ہے؟''— اب تو بڑی ہو گئی ہو گی؟''۔

''اچھی ہے — فورتھ کلاس میں پڑھ رہی ہے''۔

''میں اس کے لئے کچھ لائی ہوں۔ آپ ناراض تو نہیں ہوں گی؟ — ساتھ ہی اس نے پرس سے ایک چھوٹی سی خوبصورت رسٹ واچ نکال کر میرے سامنے رکھ دی —

''اب لے ہی آئی ہو تو ناراض ہونے سے کیا فائدہ — ؟''

ایسا کرو شام کو گھر آ کر خود اسے دے دو — وہ بھی خوش ہوگی''

''میں کسی دن مونی کو پیار کرنے ضرور آؤں گی۔''

''وہ کھڑی ہوگئی۔'' اب میں چلتی ہوں'' اس نے ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کیا۔

''آشو اس طرح کب تک بھٹکتی رہو گی۔ کسی اچھے انسان کا ہاتھ تھام لو — ''

میں نے خلوص سے کہا۔ لیکن میری آواز کا کھوکھلا پن چھپ نہ سکا۔

''اچھے لوگوں کی پیداوار ہی کہاں ہوتی ہے۔ ان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی ساری اچھائیاں سڑ گل جاتی ہیں۔ پھر جو کچھ سامنے آتا ہے۔ وہ جنگلی کیکر اور دھتورا ہی ہو سکتا ہے۔ انسان نہیں۔ ورنہ آپ یوں تنہا نہیں ہوتیں۔ جب آپ جیسی سندر پڑھی لکھی اور کامیاب ڈاکٹر کو اب تک کوئی اچھا انسان نہ ملا تو مجھے بھلا کیسے ملے گا۔ میں تو گلے گلے برائیوں میں ڈوبی ہوں — اور بُرے کو ہمیشہ برے ہی ملتے ہیں'' —

وہ بائی کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اب بھی میرے سامنے بیٹھی ہے۔ ایک کھلی کتاب کی طرح اس کی پوری زندگی میرے سامنے تھی — وہ ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی۔ چند سال پہلے تک وہ ایک عام سی لڑکی تھی — ہم پڑوسی تھے۔ حالانکہ ہمارے بیچ میں اَن دیکھا فاصلہ قائم تھا۔ لیکن آمنا سامنا ہونے پر ہم ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھتے تھے یہ ایک طرح سے شناسائی کا اعتراف تھا — اس کے سوا کچھ نہیں — نہ ہم لوگ ان کے گھر جاتے تھے — نہ ہی وہ ہمارے ہاں آتے تھے — آشو کے پتا جی اسکول ماسٹر تھے۔ ماں سیدھی سادی گھریلو عورت تھی — آشو کی دو بڑی بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی تھا — ماں باپ کی ساری توجہ رمیش کی تعلیم اور پرورش پر تھی — وہ اسے اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ لڑکیاں تو بس یوں ہی پڑھ رہی تھیں — نہ بھی پڑھتیں تو کوئی فرق نہ پڑتا —

آشو کی بڑی بہنوں کی شادی لشتم پشتم ہوگئی۔ بڑی بہن کا پتی بجلی کا اچھا کاریگر تھا۔ اس لئے سعودی عرب چلا گیا۔ وہاں سے امریکہ نکل گیا۔ چھوٹی بہن اسی شہر میں تھی۔ آشو نے ہائی اسکول کیا تو پتا جی نے اس کی پڑھائی بند کرادی۔ وہ بہت روئی پیٹی لیکن انہوں نے صاف کہہ دیا۔

''تیری پڑھائی کے لئے میرے پاس فالتو پیسہ نہیں ہے''—

''رمیش کے لئے ہے؟''—اس نے بھی تڑخ کر کہہ دیا—

''وہ لڑکا ہے۔ اس سے ہمارے کُل کا نام چلے گا— تو بیاہ کرا اپنے گھر چلی جائے گی۔ ہمیں کیا ملے گا— اوپر سے جہیز کا بوجھ''——

''میں یہ سب نہیں جانتی— میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں''۔

وہ باپ کے سامنے سے ہٹ گئی۔ لیکن اپنے دل سے پڑھنے کی لگن کو نہ مٹا سکی۔ اس روز میں لان میں کھڑی مالی سے نئے پودے لگوا رہی تھی۔ کہ وہ گیٹ کھول کر اندر چلی آئی۔

''آؤ آشو— آج کیسے رشتہ بھول گئیں؟''

وہ پہلی بار ہمارے گھر آئی تھی اور میرے سامنے چپ چاپ نظر میں جھکائے کھڑی تھی۔ شرمندہ— شرمندہ سی۔

''کیا بات ہے آشو؟''— مجھے تشویش ہوئی—

''دیدی— میں پڑھنا چاہتی ہوں۔ لیکن پتا جی، منع کر رہے ہیں''

''کیوں منع کر رہے ہیں۔ اتنی اچھی پوزیشن سے تو پاس ہوتی ہو''۔

''وہ بس رمیش کو پڑھوانا چاہتے ہیں۔ مجھے نہیں''——

وہ روہانسی ہوگئی—

''کیا میں تمہارے لئے کچھ کر سکتی ہوں؟''——

''آپ مجھے دو تین ٹیوشن دلوا دیں— میں اپنی پڑھائی کا خرچ خود اٹھاؤں گی— پتا جی سے ایک پیسہ نہیں لوں گی''—

''ٹھیک ہے میں دو ایک لوگوں سے بات کروں گی''—

وہ میرا شکریہ ادا کر کے چلی گئی تو میں دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی—

عورت کی آزادی کا نعرہ بس تقریروں اور تحریروں تک محدود تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے سماج میں عورت اب بھی بے بس اور مجبور ہے ورنہ کیا وجہ ہے وہ آشو جیسی ذہین لڑکی کو گھر کی چہار دیواری میں محبوس رکھا جائے اور رمیش جیسے آوارہ مزاج لڑکے گرلز کالج کے سامنے ٹھاٹ سے ہیرو بنے دندناتے رہیں۔ رمیش ایک نمبر کا لوفر تھا پڑھتا وڑھتا خاک نہیں تھا۔ بہانے بہانے سے باپ سے پیسے اینٹھنا تھا اور مزے کرتا تھا۔ جی میں آیا کہ اس کے پتا جی کو اس کے سارے کرتوت بتا دوں۔ لیکن دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل دینا بھی مناسب نہیں تھا۔

آشو ٹیوشن کے پیسوں سے اپنی پڑھائی کر رہی تھی۔ میں بھی اس کی مدد کر کے خوش تھی۔ پھر ایک روز وہ میرے پاس آئی تو بہت اداس تھی۔ شاید کوئی نیا مسئلہ درپیش تھا۔

''اب کیا ہوا آشو؟ اس کی اتری ہوئی صورت کوئی نئی کہانی سنا رہی تھی—

''دیدی— پتا جی یہ گھر چھوڑ رہے ہیں۔''—

''کیوں؟''—

''کرایہ زیادہ ہے— رمیش کی پڑھائی کا خرچ بڑھ گیا ہے''

''ایک کلاس میں دو بار فیل ہوگا۔ تو خرچ بڑھے گا ہی''

''دیدی اگر وہاں بھی ٹیوشن مل گئے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ—''

''ارے کچھ نہیں ہوگا پگلی۔ پڑھنے والے بچے تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی— اور پھر اس کے مضامین کے بارے میں باتیں کرنے لگی— تاکہ اس کا حوصلہ نہ ٹوٹے۔

آشو گئی تو مہینوں مجھے اس کی خبر نہ مل سکی۔ انہیں دنوں ایک فنکشن میں نرمل سے کسی نے میرا تعارف کرایا اس کے بعد اکثر ہماری ملاقات ہونے لگی۔ نرمل اتنی تیزی سے میرے قریب آیا کہ میں بوکھلا گئی۔ وہ دوستی اور پیار میں سُست روی کا قائل نہیں تھا۔ نتیجہ ہماری شادی کی صورت میں سامنے آیا— اس کو اچھی طرح جاننے، سمجھنے اور پرکھنے کا موقع

ہی نہیں ملا۔ جب دن رات کے ساتھ میں اس کی کئی کمزوریاں سامنے آئیں تو بڑی کوفت ہوئی لیکن اب کیا ہوسکتا تھا؟۔ وہ اچھا کماتا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ خرچ بھی کر دیتا تھا— خیر پیسوں کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا— میری آمدنی بھی اچھی تھی— بات اگر یہاں تک رہتی تو نباہ ہونا مشکل نہیں تھا— لیکن اس کی شراب نوشی کی لت روز بہ روز میرے لئے ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی— تو وہ روٹھ گیا۔ میں نے بھی بلانے یا منانے کی ضرورت نہیں سمجھی— وہ خود ہی لوٹ آیا۔ اور پھر ایسا کئی بار ہوا— مونی پیدا ہوئی تو نرمل بہت خوش ہوا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی بیٹی کی خاطر شراب چھوڑ دے گا— لیکن یہ ساری احتیاط صرف گھر تک تھی— آدھی آدھی رات تک کلب میں بیٹھا پیتا رہتا— اور گھر آکر سو جاتا— میں مونی کو اس سے دور رکھتی تھی اس بات پر وہ مجھ سے خوب لڑتا تھا— گھر سے باہر اس کی کیا کیا مصروفیات تھیں مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ میں اپنے گھر کا ماحول صاف ستھرا رکھنا چاہتی تھی— شرابی باپ کے زیرِ سایہ پرورش پانے والی اولادیں نفسیاتی طور پر کئی الجھنوں اور برائیوں کا شکار ہو جاتی ہیں ایسے کئی کیس میرے سامنے تھے— جہاں بچے اپنے ماحول سے اکتا کر باہر پناہ لینے لگے اور خود بھی کئی، برائیوں — اور بری عادتوں کا شکار ہو گئے۔ پھر میں تو بیٹی کی ماں تھی۔ اور اپنی بیٹی کے لئے ایک آئیڈیل باپ کی تمنا کرنا فطری بات تھی—

ایک دن نرمل غصّے میں گھر چھوڑ کر چلا گیا تو لوٹ کر نہیں آیا۔ اور ایک روز عدالت کے ذریعہ مجھ سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ میں نے اس حادثے کو بڑے حوصلے سے برداشت کیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ مونی کو مجھ سے نہ چھین لے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ دراصل وہ ایک ذمّے دار باپ تھا ہی نہیں۔ تو بیٹی کا مطالبہ کر کے اپنی آزادی کا گلا کیوں گھونٹتا۔

مونی کو میں نے زندگی کی ہر آسائش دی لیکن باپ کی کمی پوری کرنا میرے اختیار میں نہیں تھا۔ اس سارے قصّے میں میری غلطی ایک فیصد بھی نہیں تھی۔ پھر بھی میں اپنی بیٹی سے شرمندہ تھی— کبھی کبھی یہاں ناکردہ گناہ کی سزا بھی بھگتنا پڑتی ہے۔ سو میں وہ سزا بھگت رہی تھی۔ سماج کے ذریعے اٹھائے گئے سوالوں کا جواب تھا میرے پاس لیکن میں

جانتی تھی کہ میں فرداً فرداً سب کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ اس لئے خاموش تھی — میری خاموشی ہی میرا جواب تھی —

نرمل کے بعد کئی لوگوں نے میرے قریب آنا چاہا۔ میں نے فاصلے اور بڑھا دیئے۔ شادی کی پیشکش بھی ہوئی لیکن یہ بھی مشروط تھی — مونی کا وجود کسی کو گوارا نہیں تھا۔ میں تو اپنی بچّی کے لئے ہی جی رہی تھی اس کی ادھوری زندگی کی تکمیل ہی میری زندگی کا واحد مقصد تھا۔

آشو نے جب ہندوستانی مرد کی وفا پر سوالیہ نشان لگایا تو میں چپ رہی۔ میں اس کی طرح بولڈ نہیں تھی — کم از کم وہ میری طرح مصلحتوں کی زنجیر میں جکڑی ہوئی کمزور عورت نہیں تھی — اس میں اتنا حوصلہ تھا کہ جو کچھ کرے برملا اس کا اظہار بھی کر دے — اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنا دراصل بڑی ہمّت کا کام ہے۔ وہ شادی بھی کرتی تھی تو 'جسٹ فار انجوائے منٹ' کہنے کی ہمّت بھی رکھتی تھی۔ اور میں اپنی شادی کو کوئی عنوان دینے سے قاصر تھی۔ ہم دونوں میں کتنا فرق تھا۔

مجھے دہلی ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے جانا پڑا سیمینار میں مجھے بھی پیپر پڑھنا تھا۔ سارا پروگرام بخیر و خوبی انجام پایا۔ بیرونِ مُلک سے آنے والے مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ میں نے اپنی دوست ڈاکٹر ونیتا پنڈت کی دعوت پر دو دن اس کے ساتھ گزارنے کا پروگرام بنایا تھا — ونیتا کے بچوں کے لئے گفٹ خریدنے کناٹ پلیس گئی تو مختلف دوکانوں میں گھوم پھر کر سامان پیک کرایا۔ ونیتا کا ڈرائیور کار لئے میرا منتظر تھا۔ پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے وہ مجھ سے ٹکرا گئی میں نے اسے سنبھالا نہ ہوتا تو یقیناً گر جاتی۔ اس نے اپنی مخمور آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ خمار کے باوجود پہچان کے رنگ چھپائے نہ چھپے۔

''آشو تم؟ — مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔''

''اوہ ڈاکٹر — آپ؟'' — وہ بدقت مسکرائی اور ڈگمگائی تو میں نے اپنی گرفت مزید سخت کر دی۔ اس وقت جو آشو میرے سامنے تھی۔ وہ یکسر مختلف تھی — اس کا یہ روپ

دیکھ کر مجھے بڑی شرم آرہی تھی — آس پاس سے گزرنے والے بھی عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس طرح سرِ راہ اس سے کچھ کہنا سننا مشکل لگ رہا تھا — اس کی مخمور آنکھیں۔ بہکی بہکی چال اور لہجے کی لکنت پکار۔ پکار کر کہہ رہی تھی کہ وہ نشے میں ہے۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ کیا یہ وہی آشو ہے؟۔ سادہ سا شلوار سوٹ پہننے والی۔ بڑے سے ڈوپٹے میں اپنا آپ سمیٹے — بالوں کی ایک چوٹی کیے — نظریں جھکائے۔ دبی دبی سی شرمیلی لڑکی — جو آشو اس وقت میرے سامنے؟ میری بانہوں میں تھی — وہ تو کوئی ماڈل گرل تھی — ترشے ہوئے الجھے بکھرے بال — میک اپ سے لتھڑا چہرہ — آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقوں کا بسیرا — تنگ، سیاہ چمکیلی مڈی میں اس کی بانہیں عریاں تھیں۔ اور جسم کے نشیب و فراز نظریں جھکانے پر مجبور کر رہے تھے۔ مجھے وہاں کھڑا ہونا دوبھر لگ رہا تھا — میں آشو کو سہارا دیئے قریبی کیفے میں داخل ہوگئی۔ اسے اپنے سامنے بٹھا کر میں نے اس کے ہاتھ تھام لئے۔ سر سے پاؤں تک وہ اتنی مصنوعی لگ رہی تھی کہ اس کی اپنی شخصیت کھوسی گئی تھی۔ جیسے وہ۔ خود کو خود ہی سے چھپانے کے لئے یہ سارے جتن کرنے پر مجبور ہو — میں نے دل کا درد چھپا کر سوال کیا۔ ''آشو تم یہاں دہلی میں کیا کر رہی ہو۔؟''

''کچھ نہیں'' —

''ماں اور پتا جی کیسے ہیں؟''

ٹھیک ہیں — مگر بالکل ٹھیک بھی نہیں ہیں''۔

وہ شاید پھر بہک گئی تھی —

''— اور تمہارا بھائی — کیا نام ہے اس کا —؟'' —

میں نے یاد کرنا چاہا —

''وہ کُل کا چراغ — خاندان کا نام روشن کر رہا ہے۔ ڈاکٹر ان دنوں وہ جیل میں ہے۔ باہر آکر پھر وہی کرے گا۔ ہیروئن کی اسمگلنگ۔ گانجہ اور چرس کا بیوپار۔ پتا جی کا سپوت جس کے شاندار مستقبل کی آشا میں انہوں نے بیٹیوں کو قربان کر دیا۔ میری مثال آپ کے سامنے ہے''۔

وہ ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی ——— پھر سسک اٹھی —

میں نے اسے رونے دیا۔ اور جب وہ تھک گئی تو خود ہی چپ ہوگئی — میں نے ٹشو سے اس کا چہرہ صاف کیا۔ بیرا کافی لے آیا تو کافی کا پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

''آشو! کافی پی لو۔ تمہاری طبیعت سنبھل جائے گی''۔

کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے وہ کسی سوچ میں گم تھی — میں نے بھی خاموشی اختیار کی — درد سہتے سہتے ایک وقت ایسا بھی آتا ہے۔ جب انسان پتھر بن جاتا ہے — لیکن یہی پتھر ایک ذرا سی ٹھیس سے ریزہ ریزہ ہوکر بکھر بھی جاتا ہے۔ آشو بھی بکھر رہی تھی۔ کسی اپنے کو دیکھ کر درد کچھ اور بڑھ جاتا ہے — میں اس کی بہت اپنی نہ سہی — لیکن اس کے ماضی کا ایک حصہ ضرور تھی — اس کی یادوں کی کتاب میں کہیں ایک آدھ ورق، سطر یا حرف میرے نام بھی ضرور معنون تھا۔ تب ہی تو وہ میرے سامنے ہنستے ہنستے رونے لگتی تھی — اور پھر ہنسنے لگتی تھی — اس کا پل پل بدلتا ہوا مزاج اس کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا غماز تھا۔ اور پھر وہ دھیرے دھیرے کھلتی گئی۔ آہستہ آہستہ ایک ایک ورق الٹتی رہی۔ کہانی ختم کر کے اس نے ٹھنڈی، سانس لی اور ایک دم اسے ہوش آ گیا۔ کہ وہ میرے سامنے بیٹھی ہے۔ وہ خجل ہوگئی۔

''مونی کیسی ہے؟'' —

''اچھی ہے — اس سال میٹرک پاس کیا ہے''۔

''اُف — اتنا سمے بیت گیا —؟'' اسے حیرت ہوئی —

''ہاں آشو! صدیاں لمحوں میں گزر جاتی ہیں'' —

''— اور کبھی کبھی لمحے صدیوں پر محیط ہو جاتے ہیں'' وہ بڑے کرب سے مسکرائی — میں کیا کہتی۔ صدیوں کا کرب تو میں نے بھی سہا تھا۔

''ڈاکٹر — آپ کے پاس تو ہر مرض کا علاج ہے۔ اور پھر میرا مرض لاعلاج بھی نہیں ہوا ہے۔''

وہ اپنی بات پر خود ہی ہنس دی —

''پگلی تم کو کیا ہوا ہے بس پینا چھوڑ دو — سب ٹھیک ہو جائے گا — نرمل بھی بہت پیتا تھا — بہت سمجھایا بجھایا۔ لیکن نہیں مانا — آخر کار ہمارے راستے الگ ہو گئے''۔

''جانتی ہوں ڈاکٹر! لیکن جب گھر پر ماں اور پتا جی کو دیکھتی ہوں۔ جیل جا کر رمیش سے ملتی ہوں۔ تو پھر اس کمبخت زہر کو پی کر سب کچھ بھولنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''لیکن یہ تمہاری الجھنوں کا حل تو نہیں ہے آشو — اس طرح تم اپنی صحت ہی برباد کر رہی ہو —''

''اطمینان رکھئے — میری زندگی میں کوئی نرمل نہیں ہے۔ جو اپنا راستہ الگ کرے گا۔ یہاں تو بس راستے ہی راستے ہیں۔ کبھی ایک دوسرے سے ملتے ہوئے۔ کبھی ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے — اور ان راستوں کی کوئی منزل نہیں ہے ڈاکٹر''

''تم کیا کر رہی ہو — میرا مطلب ہے کہ کوئی جاب وغیرہ؟''

''کھوٹا سکہ بھلا کیا کر سکتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح چل رہا ہے۔'' کہہ کر وہ زور سے ہنس دی۔ اس کے لہجے کا درد محسوس کر کے میرا دل روا ٹھا —

''ڈاکٹر کسی روز گھر آیئے — ماں اور پتا جی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ رمیش نے ان پر بڑے ظلم ڈھائے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے سارے خواب نوچ کر انہیں اپاہج بنا دیا ہے۔ ماں کی آنکھوں میں موتیا بند اتر رہا ہے۔ ان کا آپریشن کرانا ہے۔ پتا جی نے کئی سال سے کھٹیا پکڑ رکھی ہے۔ فالج نے انہیں معذور بنا کر ایک کونے میں ڈال دیا ہے۔ ایک میں ہوں تو گھر۔ کچہری اور جیل کے چکّر لگاتے لگاتے پاگل ہوئی جا رہی ہوں''

''آشو دھیرج سے کام لو۔ میں کسی دن ماں اور پتا جی سے ملنے تمہارے گھر ضرور آؤں گی۔''

''پلیز ڈاکٹر — آپ ان پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیں — نہ ہی میری اس حالت کا ذکر کریں — وہ تو یہی جانتے ہیں کہ میں کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں کام کرتی ہوں جہاں اکثر میری رات کی ڈیوٹی بھی ہوتی ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ ان کی بیٹی۔ جو آپ کو اپنا آئیڈیل مانتی تھی۔ کچھ کرنا چاہتی تھی — کچھ بننا چاہتی تھی — سڑکوں کی دھول بن چکی ہے''۔

''آشو تم کوئی جاب کیوں نہیں کر لیتیں۔ آخر بی اے پاس ہو؟''—

''وہ بھی کر کے دیکھ چکی ہوں—''

اس نے مایوسی سے کہا۔

''پھر بھی آشو یہ کیا کم ہوگا کہ تم عزت کے چار پیسے گھر لاؤ گی''—

''عزت کے پیسے—؟''

وہ ہنس دی—

''ڈاکٹر کبھی ان مردوں کا دماغ کھول کر دیکھیں آپ کو اس کے اندر بجبجاتے ہوئے کیڑے نظر آئیں گے۔''

وہ کھڑی ہوگئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ابھی پوری طرح ہوش میں نہیں ہے۔ اس حالت میں اسے تنہا چھوڑنا ٹھیک نہیں۔

''آشو میرے ساتھ چلو میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی''—

''تھینک یو ڈاکٹر!''

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

آشو کو اس کے گھر اتار کے میں نے سیٹ کی پشت سے سر ٹیک دیا۔

''اس دنیا میں سِکّہ اس وقت تک چلتا ہے جب تک اس کی چمک دمک قائم رہتی ہے۔ آشو اپنا سکّہ اس انداز میں کب تک چلا سکے گی پانچ سال— سات سال— پھر اس کے بعد کیا ہوگا—؟—

میرے ہونٹوں نے نہ جانے کب وہ نمکین ذائقہ چھو لیا۔ جو میری روح کو چیر کر ہونٹوں تک آ گیا تھا—

☆☆

پچھلا دروازہ

بتول کی اچانک موت نے سرمد کو زندگی سے بیزار کر دیا اسے دنیا سے رغبت نہیں رہی۔ ہنستا بستا گھر دیکھتے ہی دیکھتے اُجڑ گیا۔ مانو وقت کی رفتار رک گئی ہو۔ شب و روز میں جو ایک نظم وضبط تھا۔ ایک ترتیب تھی ٹھہراؤ تھا سب کچھ ختم ہو گیا لیکن کاروبار حیات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ فرق آیا تھا تو بس اس کی زندگی میں — کمی آئی تھی تو بس اس کی زندگی میں — بتول کے بعد اسے گھر سے وحشت ہونے لگی تھی جی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر کہیں نکل جائے — لیکن وہ تنہا نہیں تھا — اس کی تنہائی اپنی جگہ تھی — اس سے جڑی ہوئی ہستیاں اسے بار بار یاد دلاتی تھیں کہ وہ کسی کا بیٹا ہے۔ کسی کا باپ ہے۔ بوڑھے والدین اور ننھی انعم۔ جو بتول کی واحد نشانی تھی۔ اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئے تھے۔ وہ انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا — گھٹن جب زیادہ بڑھی تو اس نے اپنا تبادلہ دوسرے شہر کرا لیا۔ انعم کو نانا۔ نانی کے حوالے کیا۔ اور نئی راہوں پر نئی منزل کی تلاش میں چل پڑا —

نئی جگہ، نئے لوگ، نیا ماحول رفتہ رفتہ اسے راس آنے لگا — چند روز ایک ہوٹل میں گزارے۔ پھر دفتر کے ایک ساتھی نے اسے اپنے محلّے میں ایک کمرہ کا فلیٹ دلوا دیا۔ علاقہ صاف ستھرا تھا۔ پانچ چھ منزلہ اپارٹمنٹس سر اٹھائے کھڑے تھے۔ مارکیٹ، ہوٹل ریسٹورنٹ — ضروریاتِ زندگی کی ہر سہولت موجود تھی — اور ان اپارٹمنٹس کے درمیان ایک پرانی حویلی سر اٹھائے کھڑی تھی — جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی خاندانی رئیس کی موروثی، یادگار ہے — اور اس حویلی کا مالک اپنے بزرگوں کی شان اور عزّت کو سینے سے

لگائے بیٹھا ہے۔ جبکہ ہر شہر میں فلک بوس عمارتیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ لوگوں کی سوچ بدل چکی ہے۔ پرانی حویلیاں ختم ہو چکی ہیں اور محلات کی جگہ کنکریٹ کا شہر آباد ہو چکا ہے۔ اور زمینوں کی قیمت آسمان چھو رہی ہے — کھلے صحن۔ کشادہ مکان خواب ہو گئے تھے۔ ان کی جگہ کبوتروں کی کابک جیسے فلیٹ وجود میں آ گئے تھے۔ جہاں نہ ہوا کا گزر تھا۔ نہ روشنی کا۔ لیکن لوگ خوش تھے کہ وہ نئے زمانے کے ساتھ۔ نئے رجحان کے ساتھ زندگی جی رہے ہیں۔ بلکہ فخر کے احساس کے ساتھ اپنا طرزِ زندگی بھی تبدیل کر چکے ہیں۔ جتنی رقم میں زمین کا ایک ٹکڑا۔ جسے پلاٹ کہا جاتا تھا — ملتا تھا — اتنی رقم میں بنا بنایا فلیٹ مل جاتا تھا — بنگلے اور کوٹھیاں انہیں لوگوں کی ملکیت تھے — جن کے پاس دو نمبر کا پیسہ تھا — یا پھر کروڑوں کا کاروبار تھا — پرانے مکانات بلڈرز کی آنکھوں میں کھٹکھتے تھے۔ اور وہ طرح طرح کا لالچ دے کر صاحب جائداد کو آمادہ کرتے تھے کہ وہ ان سے کنٹریکٹ کر لیں۔ — سرمد کو اس حویلی سے دلچسپی تھی۔ اسے دیکھ کر گاؤں کی اپنی حویلی یاد آ جاتی تھی — وہ بچپن میں اکثر گاؤں جاتا تھا — پھر دادا نے اسے فروخت کر دیا — اور بیٹوں کو پیسہ دے دیا — خاندانی حویلی کا بٹوارہ تو ناممکن تھا کیونکہ کوئی بٹیا گاؤں میں رہنے کے لئے تیار نہیں تھا — اس کے بابا نے بھی شہر میں مکان خرید لیا۔ کچھ پیسہ کاروبار میں لگایا — اور اسے اچھی تعلیم دلوائی — یہاں اس حویلی کو دیکھ کر اسے گاؤں والی حویلی یاد آ جاتی تھی — خدا جانے یہ اب تک کیسے بچی ہوئی تھی — آتے جاتے وہ اس پر ایک نظر ضرور ڈالتا تھا۔ حویلی کی خاموشی دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے مکینوں کی تعداد کم ہے۔ پھاٹک بند رہتا تھا — کبھی کبھی ذیلی کھڑکی کھلی نظر آئی تھی۔ اور ایک بوڑھا ملازم آتے جاتے دکھائی دے جاتا تھا —

کام والی ماسی ایک دن بیچ آتی تھی۔ چائے اور ناشتے کے برتن دھو کر صفائی کرتی۔ اور جھاڑو پوچھا کر دیتی تھی رات کا کھانا وہ قریبی ہوٹل میں کھاتا تھا۔ لنچ آفس کے کینٹین میں کرتا۔ صبح کا ناشتہ چائے اور بریڈ سے کر لیتا تھا۔ ماسی ذرا باتونی تھی۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرنا اس کی عادت میں شامل تھا — ایک دن اس نے ماسی سے حویلی کے بارے میں پوچھا تو وہ بتانے لگی۔

''حویلی کے مالک سردار علی خاں اپنی بیوہ بیٹی اور نواسے کے ساتھ رہتے ہیں۔ گھر کے کام کاج کے لئے رمضان میاں ہیں اور کسی رشتے دار کو کبھی آتے جاتے نہیں دیکھا— نہ ہی وہ لوگ کسی سے ملتے جلتے ہیں۔''—

''ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے؟''— سرمد نے سرسری انداز میں پوچھا—

''ایک بیٹا تھا— فوج میں افسر تھا۔ کسی لڑائی میں شہید ہو گیا— سرکار نے پنشن مقرر کی تھی۔ لیکن خان صاحب نے یہ کہہ کر پنشن لینے سے انکار کر دیا کہ وہ اپنے وطن کے لئے شہید ہوا ہے۔ کسی پر احسان نہیں کیا جو تمام زندگی اس کے نام کی پنشن کھائیں''——

سرمد کو بڑا تعجب ہوا۔ پنشن تو ہر فوجی کے گھر والوں کو ملتی ہے— اس میں نیا کیا تھا — شاید خانصاب کچھ زیادہ ہی محبِ وطن ہیں— یا پھر خوددار ہیں—

اتوار کا دن تھا— وہ دوپہر میں کھانا کھا کر ہوٹل سے گھر آ رہا تھا کہ حویلی کے پھاٹک کی ذیلی کھڑکی کھلی نظر آئی۔ اچانک ایک بچہ باہر نکلا۔ اور سڑک کی طرف دوڑنے لگا جب تک وہ کچھ سمجھتا۔ بچہ ایک سائیکل سے ٹکرا کر گر پڑا— اس نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا— بچے کو زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ بس ڈر گیا تھا—

اس کی طرف سے اطمینان ہوا تو وہ سائکل سوار سے مخاطب ہوا۔ پندرہ سولہ برس کا لڑکا شرمندہ سا کھڑا تھا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سرمد نے بھی اسے ہلکی سی تنبیہہ کر کے جانے کا اشارہ کیا۔ اور بچے کو کاندھے سے لگائے قریبی دوکان تک گیا۔ اس کے لئے چاکلیٹ خریدی پھر۔ حویلی کے پھاٹک کی زنجیر کھڑکائی۔ لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو وہ کھڑکی سے اندر چلا گیا— بڑے سے احاطے کے بیچوں بیچ اصل عمارت نظر آئی۔ اس نے داخلی دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹائی تو رمضان میاں باہر نکلے۔ اور بچے کو اس کی گود میں دیکھ کر پریشانی سے بولے—

''—— میاں— یہ ببوا— آپ کو کہاں مل گیا؟''— ہم نے تو گھر کا کونہ کونہ چھان مارا''— انہوں نے ہاتھ پھیلا کر بچے کو لینا چاہا تو وہ سرمد سے اور زیادہ چمٹ گیا—

''میاں— آپ اندر آ جائیں۔ میں خانصاحب کو بلاتا ہوں''— انہوں نے

بیٹھک کھول دی۔ اور اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ سرمد نے اندر جا کر ایک طائرانہ نظر چاروں طرف ڈالی — بیٹھک قیمتی اور خوبصورت فرنیچر اور دیدہ زیب آرائشی سامان سے سجی ہوئی تھی۔ اونچی چھت سے جھاڑ فانوس لٹک رہے تھے۔ قدِ آدم شیشے۔ گل دان اور دیواروں پر نایاب پینٹنگز آویزاں تھیں۔ آتشدان پر خاندانی بزرگوں کی تصویریں رکھی تھیں — درمیانی میز ہشت پہل تھی۔ ایرانی قالین نے تقریباً پوری بیٹھک کو گھیر رکھا تھا — سرمد نے قدموں کی آواز سن کر رخ موڑا — سرخ و سپید رنگت والے ایک باوقار اور وجیہہ بزرگ سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

سرمد نے انہیں سلام کیا تو بڑی شفقت سے بولے۔

''جیتے رہو بیٹا! کھڑے کیوں ہو — بیٹھو —''

بچّے نے ان کی آواز سن کر سرمد کے شانے سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا — اور گود سے اتر کر ان کے پاس چلا گیا — ''آپ تشریف رکھیں'' — سرمد نے ادب سے کہا — وہ بچّے کو گود میں لے کر بیٹھ گئے — تو اس نے بھی نشست سنبھالی۔ ''رمضان میاں بتا رہے تھے کہ گڈّو باہر نکل گیا تھا — یہ میرا نواسہ ہے۔'' — خانصاحب نے ہنس کر تعارف کرایا — ''گڈّو میاں نہ صرف باہر نکل گئے تھے۔ بلکہ ایک سائیکل سے ٹکرا بھی گئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ انہیں چوٹ نہیں آئی'' — سرمد نے بتایا۔

''شکریہ بیٹا — تم نے ہمیں بڑی مصیبت سے بچا لیا — ہم سب تو انہیں اندر تلاش کر رہے تھے — کھڑکی عموماً بند رہتی ہے اس وقت شاید رمضان میاں بند کرنا بھول گئے'' — رمضان میاں ایک کشتی میں شربت کا جگ اور گلاس لے کر آ گئے — خانصاحب نے گڈّو کو ان کے حوالے کیا اور اس سے باتیں کرنے لگے — تھوڑی دیر میں وہ ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہو گئے — اس نے ان سے جانے کی اجازت مانگی تو خانصاحب اسے دروازہ تک چھوڑنے آئے اور بے حد اصرار سے کہا —

''سرمد بیٹا — کبھی کبھی آ جایا کرو — تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی'' —

''جی ضرور، حاضر ہو جایا کروں گا۔''

سرمد نے انہیں سلام کیا۔ اور حویلی کے باہر آ گیا۔ پھر وہ اکثر خانصاحب کے پاس جانے لگا۔ ان کی گفتگو بہت دلچسپ ہوتی تھی — وہ بہت پڑھے لکھے اور قابل انسان تھے۔ ان کی انگریزی کی قابلیت بھی کم نہیں تھی — سرمد ان سے بہت متاثر ہوا ایک دن گڈو کھیلتا ہوا باہر آ گیا۔ وہ بھی سرمد سے کافی مانوس ہو گیا تھا — سرمد اکثر اس کے لئے چاکلیٹ اور اُس کے پسندیدہ کیک لے جاتے تھے — اس وقت بھی سرمد نے انہیں چاکلیٹ کا پیکٹ تھما دیا۔ پھر — خانصاحب سے کہا۔

''خانصاحب — آپ گڈو میاں کا اسکول میں داخلہ کرا دیجئے — اس کی عمر اسکول جانے کی ہے۔ بچہ ذہین ہے۔ گھر میں رہ کر یہ کیسے پڑھے گا؟''۔

''حُسنہ اسے پڑھاتی ہے — لیکن اسکول والی بات کہاں ہو سکتی ہے۔ تم ہی کوئی اسکول بتاؤ — ''خانصاحب اس کی تجویز سے متفق تھے'' — سرمد نے بتایا

''قریب ہی سینٹ فرانسس اسکول ہے۔ میرے دوست کا بچہ بھی وہاں پڑھتا ہے — اگر آپ اجازت دیں تو میں پرنسپل سے بات کروں؟'' —

''ضرور بات کرو بلکہ ساتھ لے جا کر ان کا داخلہ کرا دو'' —

خانصاحب کی اجازت ملی تو سرمد نے گڈو کا داخلہ اسکول میں کرا دیا — گھر میں تو ماں کے علاوہ بس دو نفوس تھے خانصاحب اور رمضان میاں۔ اسکول میں گڈو میاں کو نئے نئے دوست ملے — پیار کرنے والی ٹیچریں — طرح طرح کے آؤٹ ڈور — اور انڈور گیمس انہوں نے بالکل ایک نئی جادوئی دنیا دیکھی تو ان کا دل لگ گیا۔ اسکول کے رکشہ سے آنے جانے کی بھی سہولت تھی۔ اس لئے کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی — خانصاحب سرمد کے بہت ممنون تھے — اور اب تو وہ اسے بے حد اپنا سمجھنے لگے تھے — سرمد بھی ان کی شفقت اور اپنائیت سے متاثر تھا — البتہ — ان میں اتنا لحاظ ضرور تھا کہ ایک دوسرے کی ذاتی زندگی کے بارے میں گفتگو نہیں کرتے تھے — اس لئے سرمد ان کی بیٹی حُسنہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا — حالانکہ بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی — مہینے میں ایک بار وہ گھر جا کر والدین اور انعم سے مل آتا تھا۔ اور خانصاحب بھی

اس کے اس معمول سے واقف تھے — اس بار وہ گھر گیا تو ابا نے تھوڑی بہت مرمّت اور پینٹنگ کا کام اس کو سونپ دیا — یوں تو وہ تین چار دن وہ کر واپس چلا جاتا تھا — اب کام کی وجہ سے اسے ہفتہ بھر لگ گیا۔ آفس میں اس کے لئے ڈھیروں کام پڑا تھا — اس نے ڈیوٹی کے اوقات سے علاوہ بھی کئی کئی گھنٹے کام کیا۔ چھٹّی ملتے ہی وہ خانصاحب سے ملنے چلا گیا۔ رمضان میاں نے بتایا کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ اور انہیں اندر خانصاحب کی خواب گاہ میں لے گیا — وہ اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ رسمی باتوں کے بعد سرمد نے ان سے کہا —

''خانصاحب! آپ کی طبیعت تو کچھ زیادہ ہی خراب ہے رمضان میاں بتا رہے تھے کہ آپ نے اب تک ڈاکٹر کو نہیں دکھایا — یہ آپ نے اچھا نہیں کیا — ''—

''سرمد میاں — بھلا بخار بھی کوئی ایسا مرض ہے کہ ڈاکٹری دوا کی جائے — دو ایک دن میں خود بخود اتر جائے گا — میں جوشاندہ پی رہا ہوں'' — خانصاحب نے اپنی بیماری کو اہمیت نہیں دی لیکن سرمد نہیں مانا۔ اس نے ایک اچھے ڈاکٹر کو حویلی بلا کر خانصاحب کو دکھایا — اور ان کی ایک نہیں سُنی — ڈاکٹر کے علاج سے وہ جلدی ہی ٹھیک ہو گئے — لیکن کمزور بہت ہو گئے تھے — خانصاحب کی بیماری کے دوران — دو تین بار حُسنہ سے بھی ان کی بات چیت ہوئی — پردے کی آڑ سے اس نے خانصاحب کی دواؤں اور پرہیز کے بارے میں اسے ہدایات دیں — حُسنہ ان کی بہت شکر گزار تھی — جس کا اظہار بھی وہ کئی بار کر چکی تھی — سرمد نے ابھی تک اس کی جھلک تک دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی — دراصل وہ خانصاحب کی بہت عزّت کرتا تھا — اور ان کے حوالے سے ان کی بیٹی کی بھی عزّت کرتا تھا — خانصاحب تندرست ہو گئے تو اس کا آنا جانا کم ہو گیا — جب وہ کئی دن کے بعد ان سے ملنے گیا تو انہوں نے شکایت بھی کی — اور اسے معذرت کرنا پڑی۔ خانصاحب کسی ضرورت سے اندر گئے تو پردہ کی اوٹ سے حُسنہ نے براہِ راست اس سے کہا۔

''سرمد صاحب آپ نے تو آنا ہی چھوڑ دیا۔ بابا آپ کو بہت یاد کرتے تھے — ''—

نہ جانے کیسے اس کے مُنہ سے نکل گیا—

"—اور آپ—؟؟ کہہ کر وہ خود ہی شرمندہ ہو گیا—حُسنہ نے دھیمی آواز میں اعتراف کیا—

"میں بھی"——اور پھر شاید وہ پردہ کے پاس سے ہٹ گئی— لیکن یہ دو حرف گویا اس کی زندگی میں بہار کا جھونکا بن کر آئے اور اسے نہ جانے کن جہانوں کی سیر کرانے لگے— بتول کے بعد اس نے کسی کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا تھا— والدین نے اس پر دوسری شادی کے لئے زور دیا تو وہ خفا ہو گیا— لیکن— اب— وہ حُسنہ کے بارے میں سوچنے لگا تھا— اس نے اب تک اسے نہیں دیکھا تھا— لیکن اسے یقین تھا کہ وہ خوبصورت نہ سہی قبول صورت ضرور ہو گی— اور نہ بھی ہوئی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا——اب اسے اپنا فلیٹ سونا سونا لگنے لگا تھا— تنہائی کا احساس اتنا بڑھا کہ اس نے حُسنہ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا— تا کہ پہلے اس کا عندیہ لے لے— تب خانصاحب کو اپنی خواہش سے آگاہ کر کے ان کی اجازت سے حُسنہ کو اپنا بنائے— اسے یقین تھا کہ وہ انکار نہیں کریں گے۔ اس بار وہ گھر گیا تو اس نے اماں سے اپنی خواہش کا اظہار کیا— اور حسنہ کے بارے میں بتایا تو وہ خوش ہو گئیں۔ وہ تو کب سے اس انتظار میں تھیں کہ بیٹا شادی کے لئے راضی ہو جائے— دو تین لڑکیاں ان کی نظر میں تھیں بس سرمد کی رضامندی کی منتظر تھیں— سرمد جانے لگا تو اماں نے یاد دہانی کرائی—

"خانصاحب سے بات کر کے فوراً مجھے بتانا— میں تمہارے ابا کے ساتھ خود رشتہ لے کر جاؤں گی"—

—سرمد خود بھی جلد سے جلد شادی کرنا چاہتا تھا— جب وہ حویلی گیا تو بے کراں سناٹے نے اس کا استقبال کیا۔ چہل پہل تو کبھی پہلے بھی نہیں رہتی تھی۔ لیکن ایسا سناٹا بھی نہیں رہتا تھا۔ عجیب سی ویرانی کا احساس ہو رہا تھا۔ پھاٹک کی ذیلی کھڑکی بدستور بند تھی۔ جب سے گڈو اسکول جانے لگا تھا خانصاحب نے کال بیل لگوا دی تھی۔ تا کہ رکشہ والے کو آسانی ہو جائے— اور گڈو کو لانے لے جانے کے وقت گھنٹی بجا کر اپنی آمد کی اطلاع دے

سکے۔ سرمد نے کال بیل بجائی تو دس منٹ کے بعد کھڑکی کھل گئی۔ رمضان میاں نے اسے دیکھتے ہی لپٹالیا— اور زور زور سے رونے لگے— سرمد گھبرا گیا—

"خیریت رمضان میاں—؟"—

"خانصاحب گزر گئے میاں—" وہ روتے ہوئے بولے—

"کب— کیسے؟"—

"پرسوں— دل کا دورہ پڑا تھا— منٹوں میں چٹ پٹ ہو گئے— رمضان میاں نے بتایا— سرمد اندر گئے۔ سجی ہوئی بیٹھک پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ رمضان میاں اندر حُسنہ کو اطلاع دینے جا چکے تھے۔ وہ غم زدہ اور پریشان کھڑے تھے۔ جب پردہ کے دوسری طرف سے حُسنہ کی آواز آئی—

"سرمد صاحب— بابا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے"—

حُسنہ کی سسکیوں نے انہیں تڑپا دیا۔ آہستہ سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا—

"یہ میری بدنصیبی ہے کہ ان کے آخری وقت میں ان کے پاس نہیں تھا— کیا کبھی اس کے پہلے بھی انہیں سینے میں درد کی شکایت ہوئی تھی—؟"—

"کبھی نہیں— یہ پہلا دورہ تھا جو جان لیوا ثابت ہوا"

"میں آپ کے غم میں شریک ہوں۔ میرے لائق جو بھی خدمت ہو بلا تکلف کہیں—"—

"جی ضرور—" دھیرے سے کہا۔ صاف لگ رہا تھا کہ بے پناہ صدمے نے اسے نڈھال کر دیا ہے— وہ اسے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئے— ان کا دل بھاری ہو رہا تھا— تھوڑی دیر پہلے تک وہ ہشاش بشاش تھے— اور خانصاحب سے مل کر اپنے اور حُسنہ کے رشتے کی بات کرنا چاہتے تھے— اور اب— اب سارا منظر نامہ تبدیل ہو چکا تھا— خدا جانے حُسنہ کو سنبھلنے میں کتنا وقت لگے—؟—

خانصاحب کے چالیسویں تک وہ برابر حویلی جاتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے وہاں جانا بند کر دیا— ابھی تک تو اس حویلی کا سربراہ زندہ تھا اور وہ بے دھڑک

وہاں آتا جاتا تھا — اب اُس کے وہاں جانے کا کوئی جواز نہیں تھا — وہ حویلی کی تنہا رہ جانے والی بیوہ — اور جوان لڑکی کی بدنامی کو بھلا کیسے گوارا کرتے۔ حالانکہ بار بار ان کا دل بغاوت کرتا تھا کہ اس حالت میں اسے تنہا چھوڑنا انسانیت سے بعید ہوگا۔ لیکن ایسی ہمدردی بھی کس کام کی جو ایک مظلوم لڑکی کے لئے پریشانیوں کا سبب بن جائے۔

رمضان میاں نے سرمد سے شکایت کی —

''میاں — آپ نے تو آنا ہی چھوڑ دیا۔ ہم کو بالکل ہی بھول گئے؟'' —

''ایسی بات نہیں ہے رمضان میاں — میں نے مصلحتاً حویلی جانا بند کیا ہے —'' سرمد نے آہستہ سے کہا —

''جانتا ہوں — لیکن حُسنہ بی بی اور گڈو کو آپ اکیلا کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟۔ آپ کے سوا ان کا اور کون ہے؟'' —

رمضان میاں کی بات سن کر سرمد نے سر جھکا دیا۔ دھیرے سے کہا۔

''میں کسی وقت آؤں گا۔'' —

''جی نہیں۔ آپ ابھی میرے ساتھ چلئے۔۔ بی بی نے بلایا ہے'' —

''ایک بات بتاؤ رمضان میاں — خانصاحب کی زندگی میں تو کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی — اب تو وہ بھی نہیں رہے — پھر گھر کا خرچ کیسے چلتا ہے؟'' —

''— جی — وہ گاؤں میں کچھ زمینیں بٹائی پر دے رکھی ہے۔ فصل پر اناج آجاتا ہے — اور کچھ پیسہ بھی مل جاتا ہے — اس کے علاوہ حُسنہ بی بی کے سُسر بھی گڈو کی پرورش کے لئے پیسے دیتے ہیں۔ بس — '' —

رمضان چپ ہوگئے۔ سرمد ان کے ساتھ حویلی چلے گئے — اس کے بعد وہ دوسرے چوتھے وہاں جانے لگے — انہوں نے غور کیا کہ رفتہ رفتہ بیٹھک کا قیمتی سامان کم ہوتا جارہا ہے — آخر ایک دن انہوں نے رمضان میاں سے پوچھ ہی لیا — اور رمضان میاں کے جواب دینے سے پہلے ہی حُسنہ نے پردے کے پیچھے سے کہا —

''سرمد صاحب! آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ حویلی کا ایک پچھلا دروازہ بھی

ہے—"—

حُسنہ کے لہجے کا حُزن سرمد سے چھپا نہیں رہا—اور اب اُس سے برداشت نہیں ہوا—اس نے درمیانی پردہ ہٹا دیا—سفید کفن جیسے لباس میں اپنا آپ چھپائے حُسنہ ان کے سامنے تھی—اس نے ایک مرد کے پورے اعتماد سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا—

"یہ پچھلا دروازہ اب کبھی نہیں کھُلے گا—میں کل ہی اماں اور ابّا کو لینے جا رہا ہوں—اور ہاں میری بچّی انعم بھی اب ہمارے پاس رہے گی—ہم دونوں مل کر اپنے بچّوں کی پرورش کریں گے—تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے"—

حُسنہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ رمضان میاں انگوچھے سے اپنی آنکھیں صاف کر رہے تھے—حُسنہ شرمائی سی—سر جھکائے کھڑی تھی—یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ حُسنہ جیسی حسین لڑکی نے ان کا رشتہ قبول کر لیا تھا—اور پچھلا دروازہ بند ہوتے ہی ان کے اوپر خوش نصیبی کے سیکڑوں دروازے کھُل گئے تھے—

☆☆

فرصت کے رات دن

ملازمت سرکاری ہو یا پرائیوٹ، پابندی تو ہر حال میں کرنا پڑتی ہے۔

شرما جی اکیس سال کی عمر سے ملازمت کر رہے تھے — انہوں نے کلرک کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا تھا۔ ترقی ملنے کے بعد وہ اب سرپنٹنڈنٹ ہو گئے تھے۔ ایک کُرسی سے دوسری اور دوسری سے تیسری کرسی تک پہنچنے میں انہیں برسوں لگ گئے تھے — حتیٰ کہ ان کے ریٹائرمنٹ کا وقت قریب آ گیا —

انٹر پاس کرتے ہی انہیں کلرکی کرنا پڑی تھی — اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور اونچا عہدہ پانے کا خواب، پتا جی کی اچانک موت کی وجہ سے شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ دو بہنوں کی شادی اور بھائی کی تعلیم کے فرائض ادا کرتے ہوئے عُمر کا سُنہرا دور کب اور کیسے بیت گیا انہیں پتہ ہی نہ چلا۔ ایسے میں اپنی شادی کا خیال بھی نہیں آیا۔ وہ تو جب بھائی نے جونیئر انجینئر ہوتے ہی اپنا بیاہ کر کے الگ گھر بسا لیا اور صبح و شام اپنے لئے دو روٹیوں کا انتظام کرنے میں انہیں مشکل پیش آنے لگی تو یار دوستوں کے سمجھانے کے بعد انہوں نے شادی کر لی۔

مالتی غریب گھر کی کم پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ لیکن اونچے خواب لے کر آئی تھی۔ شوہر کی کم مائیگی کی وجہ سے اس کے خواب تو کیا پورے ہوتے۔ شکایتوں کے دفتر البتہ ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ حالانکہ اس وقت تک وہ ترقی پا کر ہیڈ کلرک ہو گئے تھے — تنخواہ بڑھی تو مہنگائی بھی بڑھ گئی یوں آمدنی، اور خرچ کا توازن ہمیشہ بگڑا ہی رہا — اوپر تلے کے تین بچّوں

HaSnain Sialvi

کی آمد نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ وہ جو کبھی کبھار دوستوں میں بیٹھ کر ایک آدھ بازی تاش کھیل لیتے تھے یا گپیں مار لیتے تھے — اس سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ ملازمت اور گھریلو ذمّے داریوں سے سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی تھی —

فنڈ سے قرض لے کر جیسے تیسے بیٹی کا بیاہ کر دیا — دونوں بیٹوں کو بی اے کرا کے نوکری سے بھی لگوا دیا۔ ان کے ریٹائر ہونے کا وقت قریب آیا تو بیٹے خود باپ بن چکے تھے — یہ بھی اچھا تھا کہ بیٹوں کی ملازمت اسی شہر میں تھی۔ اور ان کے کہیں اور گرہستی بسانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ بہوؤں کے آنے کے بعد مالتی آرام سے کھاٹ پر بیٹھ کر حکم چلاتی تھی — شرما جی نے سوچا کہ وہ بھی ریٹائر ہونے کے بعد چین کی بنسی بجائیں گے۔ اپنی نیند سوئیں گے اور اپنی مرضی سے جاگیں گے۔ گم شدہ دوستوں کو تلاش کر کے بے فکری سے محفلیں سجائیں گے۔ جیون کے وہ سارے سُکھ حاصل کریں گے جن پر ان کا بھی حق تھا۔ لیکن کولھو کا بَیل بنے رہ کر وہ کوئی سُکھ نہ حاصل کر سکے۔ فرصت کے رات اور دن ان کے اپنے ہوں گے۔ اور وہ دن بھی آخر آ ہی گیا۔ وہ ریٹائر ہو گئے۔

آج انہیں آفس نہیں جانا تھا۔ سکون کی نیند کیا ہوتی ہے یہ انہوں نے پہلی بار جانا تھا — آنکھ کھُلی تو یاد آیا کہ وہ کسی کے ملازم نہیں ہیں۔ دل ایک دم پھول کی مانند کِھل اُٹھا — وہ بستر پر لیٹے لیٹے اپنے پروگرام کے بارے میں سوچتے رہے۔ ''سب سے پہلے رمیش کو پکڑیں گے۔ پھر آغا کے گھر جائیں گے — لیکن آغا کے گھر جانے سے پہلے تاش کی نئی گڈّی ضرور خریدیں گے۔ اور اگر موڈ بنا تو ایک آدھ بازی بھی کھیلیں گے۔ اور —

''اے جی —! کیا آج سارا دن پلنگ توڑتے رہو گے؟'' مالتی نے دروازہ میں منہ ڈال کر کہا۔ انہیں مالتی کی آواز ہمیشہ سے زیادہ کرخت اور بُری لگی۔ جل کر کہا۔ ''شاید تم بھول گئیں کہ آج مجھے آفس نہیں جانا ہے''

''لو یہ بھی بھلا کوئی بھولنے کی بات ہے'' —

مالتی نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ شاید وہ مسکرائی بھی ہو۔ لیکن انہوں نے گردن موڑ کر اس کی صورت دیکھنے کی کوشش نہیں کی — اور سچ تو یہ تھا کہ وہ اس کی شکل پر لعنت بھیج

کر کبھی کے آزاد ہو گئے ہوتے اگر یہ بچے نہ پیدا ہو جاتے۔ آرام سے بولے۔

''میرا ابھی اُٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے''۔

دل میں کہا— ''اپنی منحوس صورت گم کرو''—

''ذرا گھڑی دیکھو۔ سوا آٹھ بجے ہیں''—

''بجنے دو''— لہجہ اور بھی باغیانہ ہو گیا۔ یعنی پہلی بار شرما جی نے بھی لاپرواہی سے جواب دیا۔

''یوں ہی بجنے دوں— '' دیر ہو جائے گی تو ننھے کے ہاں دودھ ختم ہو جائے گا'' بیوی نے اطلاع دی۔ روز دُودھ کیسے آتا تھا؟''— جل کر پوچھا—

''وہ مرا بھوندو بالٹا لے کر آتا تھا— اور پانی میں دودھ ملا کر ناپ جاتا تھا— میں نے اس کا حساب کر دیا ہے۔ اب آپ ننھے کے ہاں سے سامنے دودھ دُوہا کر لایا کریں کم از کم بچّوں کو خالص دودھ تو ملا کرے گا۔

پتنی نے بچوں کا نام لے کر انہیں بلیک میل کیا تو وہ بادل نخواستہ بستر چھوڑنے پر تیار ہوئے اور اُلٹا سیدھا ہاتھ منہ دھو کر دودھ لینے چلے گئے—

ایک کپ گرما گرم چائے پی کر سوچا کہ سامنے والے پارک میں ذرا دیر تازہ ہوا کھائیں گے۔ واپس آ کر غُسل کریں گے۔ اور اخبار پڑھتے ہوئے ناشتہ کریں گے۔ بلکہ اطمینان سے پورا اخبار پڑھیں گے۔ روز تو جلدی جلدی اخبار کی سُرخیوں پر نظر ڈال کر آفس بھاگنا پڑتا تھا۔ شام تک اخبار کی خبریں باسی ہو جاتی تھیں۔ کیونکہ ٹی۔ وی پر تازہ خبریں اور خبروں سے زیادہ، بریکنگ نیوز، آنے لگتی تھیں— حالانکہ انہیں ٹی۔ وی کے سامنے بیٹھنے کا موقع نہیں ملتا تھا— بچے اپنے پسندیدہ کارٹون دیکھنے کے لئے آپس میں مار کٹائی کرنے لگتے تھے— ابھی وہ پروگرام کو ترتیب دینے بھی نہ پائے تھے کہ مالتی نے تھیلا اور پیسے ان کے سامنے رکھ دیئے۔

''اس کا کیا کرنا ہے؟''—

وہ یہ تھیلا پہلی بار دیکھ رہے تھے— اس لئے اس کا مصرف ان کی سمجھ میں نہیں

آیا۔ مالتی نے فوراً ان کی اُلجھن دور کردی—

''ذرا سامنے والی مارکیٹ سے سبزی لے آیئے۔ دروازہ پر جو ٹھیلے والے آتے ہیں۔ وہ باسی سبزی دوگنے تین گنے داموں پر دے جاتے ہیں۔ ساتھ والے تیواری جی بتا رہے تھے کہ وہ روزانہ مارکیٹ سے تازہ سبزی لاتے ہیں دام بھی مناسب ہوتے ہیں اور چیز بھی اچھی ملتی ہے''۔

پتنی نے بڑے آرام سے فائدے گنوائے۔

شرما جی کے دو گھنٹے سبزی مارکیٹ میں ضائع ہوگئے۔ لیکن پتنی کی چک چک سے نجات مل گئی۔ وہ برآمدہ میں بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگے۔ جھاڑو پوچھا کرنے والی ماسی نے پہلے تو انہیں حیرت سے دیکھا۔ جیسے آج سے پہلے اس نے ایسا عجوبہ کبھی نہ دیکھا ہو— پھر بڑی ناگواری— بلکہ بیزاری سے بولی۔

''صاحب جی! کہیں اور جا کر بیٹھئے۔ ہمیں کام کرنا ہے''—

ناچار وہ اخبار لے کر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ ان کے کمرہ میں ایک پرانی اور خستہ حال آرام کرسی برسوں سے پڑی تھی۔ کبھی اس کے استعمال کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ بلکہ کئی بار تو انہوں نے یہ بھی سوچا تھا کہ آخر اس کی یہاں کیا ضرورت کیا ہے؟ اس وقت وہ اسی پر نیم دراز ہو کر اخبار پڑھنے لگے۔ دل میں کہا—

''یہ تو بڑے کام کی چیز ہے۔ ایک ہی وقت میں لیٹنے اور بیٹھنے کا مزہ دیتی ہے''۔

''اخبار پڑھ لیا ہو تو کچھ کام ہی کر لیجئے—''

مالتی کی بات سن کر جی چاہا پوچھیں کہ صبح سے اب تک جو کچھ کیا وہ کام نہیں تو اور کیا تھا؟— لیکن اس جاہل بے وقوف عورت کے مُنہ لگنا بے کار تھا— شاید پہلی بار انہیں پتنی کی بے وقوفی اور جہالت کا ادراک ہوا تھا۔ آج سے پہلے انہیں اس کے متعلق سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ بس کسی طرح نشتم پشتم گاڑی چل رہی تھی۔

ان کے سوال کرنے سے پہلے اس نے ایک لمبی لسٹ انہیں تھما دی۔ اور بڑے نوٹوں سے ان کے چہرے پر ہوا کر کے کہنے لگی—

''بڑے بازار سے مہینے کا راشن لے آیئے— گھر میں سامان ختم ہو گیا ہے۔''

''اب سے پہلے کون راشن لاتا تھا؟''—

شرما جی سخت جز بز ہوئے— جب سے لڑکے بڑے ہوئے تھے یہ کام وہ کرتے تھے—

''ستیش آفس جاتے ہوئے لالہ کو سامان کی لسٹ دے دیتا تھا— اور واپسی میں وہی راشن کے کارٹون لے آتا تھا۔ کبھی اسے فرصت نہ ملتی تو لالہ اپنے نوکر کے ہاتھ سامان بھجوا دیتا تھا۔ دس بیس روپے وہ بھی چائے پانی کے نام سے لے مرتا تھا— اب آپ گھر میں ہیں تو اس سارے دردِ سر کی ضرورت نہیں ہے''—

مالتی کا اطمینان قابلِ دید تھا—

''ٹھیک ہے'' شرما جی نے مری مری آواز میں کہا۔ انکار کی صورت میں انہیں مفت کی روٹیاں توڑنے کا طعنہ بھی مل سکتا تھا— مالتی کی زبان درازی سے کچھ بھی بعید نہیں تھا— ''— اور ہاں۔ یہ نہ ہو کہ لالہ کے نوکر اپنی مرضی سے الٹا سیدھا سامان پیک کر کے موٹی رقم کا بل آپ کو تھما دیں۔ ایک ایک چیز دیکھ بھال کر لیجئے گا۔''

''پچھلی بار بادام کڑوے دے دیئے تھے اور چینی کا ہے کو تھی— بُرادہ تھا۔ ستیش کی تو مجبوری تھی کہ اسے اتنا ٹائم نہیں ملتا تھا— لیکن آپ تو—''

اپنی فرصت، کا طعنہ سننے سے پہلے ہی وہ سامان کی لسٹ اور پیسے لے کر باہر نکل گئے۔

جب سے یہ بڑے بازار اور سُپر مارکیٹس وجود میں آئی ہیں بے چارے گاہکوں کی شامت آ گئی ہے۔ خوبصورتی سے شوکیس میں سجے ہوئے پیکٹ اور ڈبے دل لبھانے سے زیادہ دل جلانے کا کام کرتے ہیں دوکاندار ایسے شاطر ہوتے ہیں کہ بیک وقت درجن بھر گاہکوں کو پھنسا لیتے ہیں۔ ہر گاہک کی ٹوکری میں دو— دو— چار— چار پیکٹ ڈالتے جاتے ہیں۔ نہ سامان پورا ہوتا ہے۔ نہ گاہک کو نجات ملتی ہے اور دوکاندار مسکرا۔ مسکرا کر ایسے پرچاتا ہے جیسے بس وہ اسی گاہک کا آڈر پورا کرنے میں مصروف ہے۔

ڈھائی گھنٹے کے بعد شرما جی آٹو رکشہ پر بھاری بھاری کارٹون رکھوا کر گھر آئے تو مارے تھکن کے برا حال تھا کھانا کھائے بغیر وہ بے سُدھ لیٹ گئے۔

مالتی نے سرسری طور پر کھانے کے لئے پوچھا تو انہوں نے جل کر کہہ دیا ''بھوک نہیں ہے''— اس نے بھی اصرار نہیں کیا— اور کارٹون کھول کر بیٹھ گئی۔ کبھی ایک پیکٹ اٹھا کر دیکھتی— کبھی دوسرا— اس کے ماتھے کی سلوٹیں ایک پل کے لئے دور نہیں ہو رہی تھیں—

ذرا دیر آرام کرنے کے بعد شرما جی نے سوچا کہ دو چار نوالے زہر مار کر لیں۔ پاؤں میں چپلیں ڈالی ہی تھیں کہ بہو نے اندر جھانکا—

''کیا بات ہے بہو؟''— بڑی سہولت سے پوچھا—

''پتا جی! وہ ببلو کو اسکول سے لانا ہے''—

بہو نے آہستہ سے کہا۔ وہ مارے مروّت کے یہ بھی نہ پوچھ سکے کہ روز ببلو کو کون لاتا لے جاتا تھا۔ بہو نے خود ہی ان کی مشکل آسان کر دی۔

''سویرے تو میں یا ماتا جی اسے اسکول چھوڑ آتے ہیں۔ واپسی میں 'وہ' لے آتے ہیں۔ لیکن 'اُنہیں' آفس سے لوٹنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ بے چارہ بچہ بھوکا، پیاسا ہلکان ہوتا ہے''—

بہو اپنی بات ختم کر کے چلی گئی— شرما جی نے جوتے پہنے اور ببلو کو اسکول سے لینے چلے گئے۔

غنیمت تھا کہ اسکول زیادہ دور نہیں تھا۔

رات کا کھانا ان کے ہاں جلدی کھا لیا جاتا تھا۔ شام کی چائے پر ناشتہ کا اہتمام نہیں ہوتا تھا— شرما جی کھانا کھا کر باسی خبریں پڑھنے کی تیاری کر رہے تھے کہ دونوں بچے اپنا اپنا بیگ لے کر آ گئے۔ نیہا نے لاڈ سے کہا۔

''دادا جی! کل ہمارا ٹیسٹ ہے میتھ کا''—

ببلو کیوں پیچھے رہتا۔ اس نے بھی انگریزی کی کتاب ان کے سامنے رکھ دی—

منمنا کر بولا—

"داداجی! مس نے کہا ہے کہ کل وہ ڈکٹیشن لیں گی"

شرماجی سونے کے لئے بستر پر لیٹے تو ان کے بدن کا جوڑ— جوڑ دکھ رہا تھا— اور وہ سوچ رہے تھے—

"اس بے گار سے تو اچھا تھا کہ وہ ریٹائر ہی نہ ہوتے سچ تو یہ تھا کہ آج تک وہ ملازمت کے نام پر عیاشی ہی کرتے رہے تھے— انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ جلد ہی کوئی نوکری تلاش کریں گے— آخر کتنے ہی ریٹائرڈ لوگ کام کرتے ہیں۔ وہ بھی کریں گے۔ کم از کم اس بیگار سے تو نجات ملے گی اور پھر ہر وقت بے کاری کا طعنہ باز آئے ایسی فرصت سے شرماجی نے آنکھیں بند کرلیں اور ملازمت تلاش کرنے کا پروگرام فائنل ہوگیا۔

☆☆

مول انمول

رینو آفس سے اٹھی تو گھر جانے کو اس کا دل نہ چاہا۔ اور انجانے میں ہی اس کی کار کارخ ساحل سمندر کی طرف ہو گیا۔ ویسے بھی گھر میں اس کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا۔ بس کھانستی کھنکھارتی آیا ماں تھی۔ جس کی گود میں پل کر وہ جوان ہوئی تھی۔ اور آیا ماں کو اب بھی یہ احساس نہیں تھا کہ وہ بڑی ہو گئی ہے۔ وہ ہر دم اس کے کھانے پینے اور آرام کی فکر میں ہلکان رہتی تھی — یا پھر ہفتے میں دو بار اس سے شادی کا تقاضہ کر دیتی تھی — اس سے زیادہ وہ بے چاری کر بھی کیا سکتی تھی — نہ تو وہ اس کے دل سے ماضی کی تکلیف دہ یادیں کھرچ سکتی تھی۔ نہ ہی اس کے احساسات کا تجزیہ کر سکتی تھی۔ اسے کیا پتہ کہ وہ اپنے دل کے گھاؤ چھپائے کس کرب سے گزر رہی ہے؟ —

ساگر نے بڑی بے رحمی سے اسے بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا تھا — یہ بھی اچھا ہوا کہ کسی بندھن میں بندھنے سے پہلے ہی اس کی اصلیت ظاہر ہو گئی اگر بیاہ کے بعد اس کی ہرجائی طبیعت کے جوہر کھلتے تو وہ کیا کرتی؟ کم از کم اب اتنا تو تھا کہ وہ زندگی کے معمولات پر عمل کر رہی تھی۔ کسی روبوٹ کی مانند وہ مقررہ وقت پر آفس جاتی — سارا دن فائلوں میں سر کھپاتی — اور شام کو گھر آ کر آرام کرتی — وقت گزاری کے لئے میگزین اور وی سی آر کا سہارا بھی غنیمت تھا — اس کی کوئی سہیلی بھی نہیں تھی — جس سے دل کا حال کہہ کر چند آنسو بہا لیتی — بس اندر ہی اندر گھٹتی رہتی — اس کے ماتا پتا تو جب وہ چھوٹی سی تھی ایک حادثے میں ختم ہو گئے تھے — موسی نے اس کی پرورش کی تھی — اور اس کے بیاہ کا ارمان دل میں

لیے چتا پر جا سوئی—

ساگر سے اس کی ملاقات ایک آرٹ گیلری میں ہوئی تھی۔ جہاں ساگر کے فن پاروں کی نمائش چل رہی تھی— اور پھر اس کے بعد دونوں کی ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ ساگر غریب تھا— لیکن اس کے حوصلے بلند تھے— اگر پیٹ میں روٹی نہ ہو تو آرٹسٹ کا تخیل بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے۔ اس نے اپنے تین کمروں کے خوبصورت مکان کے ایک کمرے کو نگار خانہ بنا دیا۔ اور ایزل برش رنگ اور کینوس کے علاوہ اسے ہر وہ سہولت بھی دی جو ایک نازک مزاج اور حساس فنکار کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ رینو نے اس کا سارا خرچ خود برداشت کیا۔ تاکہ ساگر پر غمِ دوراں کی پرچھائیں نہ پڑے— اور اس کے اندر کے فنکار کی تمام صلاحیتیں اُجاگر ہو جائیں— وہ اسے ایک کامیاب فنکار دیکھنا چاہتی تھی— اس کی ملازمت— ان دونوں کے اخراجات کے لیے کافی تھی— یہی نہیں اس نے کئی جگہ مشہور آرٹ گیلریز میں اس کے فن پاروں کی نمائش کا بھی اہتمام کیا۔ لیکن ساگر کی منزل اس کے مکان کا کمرہ یا ملک کی آرٹ گیلریز نہیں تھیں۔ اس کی منزل تو پیرس تھی فرانس کا وہ خوبصورت شہر جو اپنی رعنائیوں کے لیے مشہور تھا— اور جہاں کے آرٹ اسکول کسی بھی فنکار کو پستیوں اور گمنامیوں سے نکال کر شہرت کے اُفق پر پہنچا دیتے تھے۔ لیکن رینو ساگر کی یہ خواہش پوری نہ کر سکی۔ اور نیلم ساہنی کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا— وہ زیادہ تر بیرونِ ممالک میں اپنا وقت گزارتی تھی۔ اس نے ساگر کے خوابوں میں رنگ بھرنے کا وعدہ کیا اور ایک دن دونوں نے شادی کر لی اور ساگر— نیلم ساہنی کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے پیرس اُڑ گیا— کیا ہوا—؟ جو وہ اس سے عمر میں دس سال بڑی تھی۔ یا حسین نہیں تھی— اس کی بے پناہ دولت تو جوان اور حسین تھی—

رینو نہ جانے کب تک اپنے خیالوں میں گُم سمندر کے کنارے بنی ہوئی دیوار پر بیٹھی شوریدہ سر موجوں کے سر پھوڑنے کا تماشہ دیکھتی رہی۔ وہ تو اپنے آس پاس گھومنے پھرنے والے خوش باش جوڑوں اور ریت پر دوڑتے بھاگتے بچوں سے بھی بے خبر تھی— اور وہ اس سے تھوڑے فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اس کی محویت کو پُر شوق

نظروں سے دیکھ رہا تھا— شاید یہ اس کی گرم نظروں کی حِدّت ہی تھی جو اسے چونکانے کا سبب بنی تھی اس نے دُزدیدہ نظروں سے اسے دیکھا اور جھینپ سی گئی۔

وہ کوئی دل پھینک یا آوارہ قسم کا نوجوان نہیں تھا— بلکہ تیس بتیس برس کا میچور مرد تھا۔اس کی خوش لباسی اس کے نفیس ذوق کی مظہر تھی۔آنکھوں پر سنہری فریم کا قیمتی چشمہ تھا۔ اور سنجیدگی اس کے بشرے سے نمایاں تھی— اس نے رخ موڑ کر کچھ دور کھیلتے ہوئے بچوں پر نظریں مرکوز کر دیں— ایک لڑکا سات آٹھ برس کا ہوگا اور بچّی پانچ برس کی۔دونوں ریت کے گھروندے بنا رہے تھے— اچانک بچّی نے ہاتھ مار کر گھروندہ توڑ دیا۔اور بھاگ کھڑی ہوئی اور نہ جانے کس کے دھوکے میں اس سے آکر لپٹ گئی۔لڑکا اس کے پیچھے ہی بھاگا تھا— اور اب اس کے سرِ پر پہنچ گیا تھا—

''آنٹی! دیکھیں نا۔کٹو ہمیں مار رہا ہے''

بچّی نے اس کی ساڑی پکڑ کر فریاد کی—

''آنٹی! رِمپی نے میرا گھروندہ توڑ ڈالا— وہ دیکھئے۔''لڑکے نے ٹوٹے ہوئے گھروندے کی طرف اشارہ کیا وہ دیوار سے نیچے اُتر آئی۔اور دونوں بچّوں کو لپٹا کر بولی۔

''چلو ہم لوگ مل کر گھروندہ بنائیں گے۔''

—— اور پھر وہ بچوں کے ساتھ بڑے انہماک کے ساتھ گھروندہ بنانے لگی۔ بھُر بھُری نم ریت بار بار بکھر جاتی تھی— اور گھروندہ ٹوٹ جاتا— بڑی مشکل سے دو گھروندے بن پائے۔رینو نے اپنے ہاتھوں سے ریت کے ذرّے جھاڑے۔ہنس کر کہنے لگی—

''لو بھئی— دونوں کے گھروندے بن گئے۔اب لڑائی مت کرنا۔۔۔۔

ہاں— کیا تم یہاں اکیلے ہی آئے ہو؟''—

''آنٹی— ہمارے ڈیڈی ساتھ آئے ہیں۔وہ دیکھئے۔ڈیڈی آگئے۔''کٹو نے اشارہ کیا۔اس کی نظر اٹھی۔تو اُٹھی ہی رہ گئی۔وہ تو اسے تقریباً فراموش ہی کر چکی تھی— لیکن وہ ان بچوں کے ڈیڈی نکلے۔قریب آکر انہوں نے بچوں کو آئس کریم کے

کپ پکڑائے، اور پھر ایک کپ اس کی طرف بڑھا کر شائستگی سے بولے۔

"پلیز — آپ بھی لیں"

"جی میں — بچوں کو دیں نا" — وہ سٹپٹا گئی۔

"کیا حرج ہے۔ میں بھی تو کھا رہا ہوں"

"شکریہ" اس نے کپ تھام لیا — اور لکڑی کے چھوٹے سے چپٹے چمچے سے آئس کریم کھانے لگی —

"میں تو بڑی دیر سے آپ کے قریب ہی کھڑا تھا۔ آپ نہ جانے کن خیالوں میں گم تھیں۔ اس لئے تعارف حاصل کرنے کی جسارت نہ کر سکا" —

وہ چپ رہی — بھلا اس بات کا کیا جواب دیتی۔

بچے آئس کریم کھا کر پھر اپنے کھیل میں مشغول ہو گئے تھے۔ اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ دورانِ گفتگو دونوں ایک دوسرے کے نام سے واقف ہو چکے تھے۔ اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہیں تھی — پھر اس نے بچوں کو آواز دے لی۔ اور وہ ساتھ ساتھ پارکنگ تک آئے۔

"آنٹی — ہمارے گھر آیئے گا نا؟ —

رِمپی نے اس کی ساڑی کا پلّو پکڑ کر پیار سے کہا —

"ہاں بیٹے — ضرور آئیں گے — آپ بھی اپنی ممی کے ساتھ ہمارے گھر آیئے گا" —

اس کی بات پر بچوں نے منہ اٹھا کر اپنے ڈیڈی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ان کے لبوں پر بڑی تلخ مسکراہٹ تھی۔ شاید انہیں اپنا نظر انداز کیا جانا ناگوار گزرا تھا۔ لیکن رینو نے اس پر دھیان نہیں دیا۔ وہ ایک محتاط زندگی گزار رہی تھی۔ اور اس کی زندگی میں کسی راہ چلتے مرد کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ حالانکہ وہ انتہائی بردبار، شریف اور متین انسان نظر آ رہا تھا۔ لیکن بہر حال وہ بھی ایک مرد ہی تھا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے پرس سے اپنا کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا اور آہستہ سے بولی۔

''مسٹر سندیپ چودھری — اگر کبھی بچّے آنا چاہیں تو آپ انہیں ضرور بھیجیں — مجھے خوشی ہوگی — ''—

سندیپ چودھری نے کارڈ تھام لیا۔ اس نے بچّوں کو پیار کیا۔ اور اسے سلام کر کے اپنی گاڑی اسٹارٹ کر دی وہ بھی اپنی گاڑی پارکنگ سے نکال رہے تھے۔

''کیا میں نے غلط کیا؟''— اس نے خود سے سوال کیا

''اگر بچوں اور اس کی ماں کے بجائے وہ خود چلا آیا؟''— اس عمر کے لوگ نوجوانوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی بدمعاش ہوتے ہیں''— لیکن پھر اسے لفظ بدمعاش اچھا نہیں لگا۔ کم از کم اتنا گندہ لفظ اس کی شخصیت سے ذرا بھی میل نہیں کھاتا تھا— اس کا جیسا نفیس انسان ایسے خطابوں کے لائق نہیں تھا۔

شام کے وقت وہ حسبِ معمول اپنے لان میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ اچانک گیٹ کے اندر ایک گاڑی داخل ہوئی اور رمپی اور کٹو بھاگ کر اس کے پاس آ گئے۔ ان کے پیچھے سندیپ چودھری بھی مسکراتے ہوئے آ رہے تھے۔ اس نے بچوں کو لپٹا کر پیار کیا اور سندیپ کو کرسی پیش کی۔ ''ان دونوں نے کئی دن سے رَٹ رکھی تھی کہ آنٹی کے پاس جائیں گے''— سندیپ نے آہستہ سے کہا—

''میں بھی انہیں یاد کر رہی تھی''—

اسے خود اپنے جھوٹ پر ندامت محسوس ہوئی۔ لیکن اخلاقاً کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا—

''چلئے ہم لوگ اندر چلیں اب تو اندھیرا ہو گیا ہے''—

وہ انہیں ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ اور آیا ماں سے چائے لانے کے لئے کہا۔ بچوں کے لئے ڈھیر ساری چیزیں اس نے درمیان میز پر لا کے سجا دیں۔ اور ان کی خاطر مدارات کرنے لگی۔ سندیپ چودھری نے ڈرائنگ رُوم کا سرسری جائزہ لیا۔ لان سے یہاں تک ہر گوشے سے مکینوں کے اعلیٰ ذوق کا پَرتو جھانک رہا تھا۔ لیکن ہر طرف سناٹے کی حکمرانی تھی— اور سوائے آیا ماں کی کھٹ پٹ کے اور کوئی آواز نہیں تھی— اور نہ جانے

کیسے رینو نے ان کی سوچ کا سر اتھام لیا—

آہستہ سے بولی—

''یہاں میں آیا ماں کے ساتھ رہتی ہوں۔ ماتا پتا کا میرے بچپن میں ہی ایک حادثے میں دیہانت ہوگیا تھا''—

''ویری سیڈ''— سندیپ نے اتنا ہی کہا۔

''آپ آج بھی اپنی پتنی کو ساتھ نہیں لائے؟''—

اس سوال میں شکوہ بھی تھا۔ اور ایک طرح کی تنبیہ بھی کہ اب آپ جب بھی آئیں تنہا نہ آئیں۔ سندیپ نے کھلے دروازے سے باہر لان میں کھلے سُرخ گلابوں پر نظریں مرکوز کر دیں۔ لیکن خود اس کی آنکھوں میں گلابوں کے رنگ کی جگہ دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔

''شوبھا کئی سال پہلے میرے جیون سے دور جا چکی ہے۔

شاید مجھ میں ہی کوئی کمی تھی—''

سندیپ کی آواز کہیں دور سے آتی معلوم ہوئی—''

''—اور یہ بچے—؟''—

''یہ تنہا میری ذمّے داری ہیں۔ جسے میں کوشش بھر نبھا رہا ہوں۔''

اب کہنے سننے کو کیا رہ گیا تھا— وہ تو ان سے اظہار ہمدردی بھی نہ کر سکی۔ اور پھر انہوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ وہ بچّوں ہی سے باتیں کرتی رہی۔ اور سندیپ خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔ پھر گھڑی دیکھ کر انہوں نے اس سے جانے کی اجازت مانگی۔ بچے تو ابھی جانا نہیں چاہتے تھے۔

گھر میں ان کے لئے کیا دلچسپی تھی— وہ جانتے تھے کہ ڈیڈی اپنے بیڈ روم میں بند ہو کر میگزین پڑھیں گے— اور وہ لوگ گوانی آیا ڈورا کو پریشان کریں گے۔ لیکن انہیں تو جانا ہی تھا۔ چلتے چلتے کٹو نے وعدہ لیا۔

''آنٹی— آپ بھی ہمارے گھر آئیں نا؟''— ہم آپ کو اپنا 'ایکویرم' دکھائیں گے— اور ہم نے آسٹریلین طوطے بھی پالے ہیں'' کٹو نے گویا اسے لالچ دیا۔ اس نے

بچّوں سے وعدہ تو نہیں کیا۔ بس مسکرا کر سر ہلا دیا۔

ایسے گھر میں جہاں ایک مرد اپنے بچوں کے ساتھ رہتا ہو— وہ جا کر کیا کرتی؟— اور شاید سندیپ نے بھی یہ بات محسوس کی۔ لیکن زبان سے کچھ نہ کہا— اس کا شکریہ ادا کیا— اور بچوں کو ساتھ لے کر رخصت ہو گیا— شاید جاتے جاتے اس نے دل میں یہ بھی طے کیا تھا کہ وہ بچوں کی ضد کے باوجود اب کبھی یہاں نہیں آئے گا۔ ویسے وہ رینو کی سرد مہری اور احتیاط کے لئے اسے قصوروار بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔

ایک دن اچانک ہی کٹو اور رمپی آ گئے۔ وہ انہیں دیکھ کر خوش ہو گئی۔ اور یہ احساس ہر احتیاط پر غالب آ گیا کہ وہ بھی بچوں کو مس کر رہی تھی۔ گیٹ کے باہر گاڑی میں اسٹیرنگ پر ڈرائیور بیٹھا تھا۔ سندیپ نہیں۔ ''کہئے— اتنے دن کے بعد آنٹی کی یاد آئی''؟—

رینو نے شکوہ کیا تو کٹو جو ذرا سمجھدار تھا۔ منہ بنا کر بولا۔

''ہم نے تو کئی بار ڈیڈی سے کہا— لیکن—؟''

''ڈیڈی کو کئی دن سے بخار آ رہا ہے آنٹی'' رمپی نے بتایا۔

''پھر آپ انہیں چھوڑ کر کیوں آ گئے؟''—

''آپ کو کارڈ دینا تھا نا؟— تو ڈیڈی نے کہا خود جا کر دے آؤ—''

کٹو نے ایک خوبصورت سا کارڈ اسے تھما دیا۔ یہ رمپی کی برتھ ڈے کا دعوت نامہ تھا—

''آنٹی آپ آئیں گی نا؟'' رمپی نے پوچھا—

''ضرور آئیں گے''— وہ مسکرا دی۔

''تب ڈیڈی ہار جائیں گے اور ہمیں چاکلیٹ کھلائیں گے۔''

''وہ کیسے؟''—

''ڈیڈی نے شرط لگائی تھی کہ آنٹی نہیں آئیں گی''—

''اوہ تب تو ہم ضرور انہیں ہرائیں گے''—

اس نے بچوں کی خوشی میں بھرپور ساتھ دیا۔

''اچھا آپ لوگ جب تک یہ مٹھائی کھائیں میں تیار ہو کر ابھی آئی۔ ذرا آپ کے ڈیڈی کو بھی دیکھ لوں کتنا بخار ہے؟''—

اور پھر وہ بچوں کے ساتھ سندیپ کو دیکھنے چلی گئی۔

سندیپ نے اسے دیکھا تو ان کی بجھی بجھی اداس آنکھوں میں چراغ سے روشن ہو گئے۔ اس نے خاموشی سے تھرمامیٹر لگایا۔ اور جب پارہ ایک سو تین ڈگری پر آ کر تھم گیا تو وہ بچوں کی مدد سے ٹھنڈا پانی اور تولیے لے کر اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی میں بھیگی پٹیاں رکھنے لگی۔ آدھے گھنٹے کی کوشش کے بعد سندیپ کا بخار نیچے اترا۔ اور اس نے کچن میں جا کر سلائس سینکے۔ دودھ گرم کیا۔ اور ٹرے میں رکھ کر لے آئی—

''اب آپ کچھ کھالیں۔ خانساماں بتا رہا ہے کہ آپ نے صبح سے کچھ نہیں لیا''—

''آپ نے کیوں تکلیف کی۔''؟ سندیپ نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر سِلنچی میں کُلّی کی— اور دو تین سلائس کھا کر دودھ پی لیا۔ اور تب انہیں بھی احساس ہوا کہ وہ واقعی بھوکے تھے— انہوں نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا— دھیرے سے بولے۔

''عورت نہ ہو تو مرد بے چارہ بھوکوں مر جائے''—

''میں دلیہ بنا کر رکھے جاتی ہوں۔ شام کو ضرور کھالیں''—

''جو حکم''— سندیپ نے سعادت مندی سے کہا۔ وہ مسکرا دی۔

جانے سے پہلے اس نے سندیپ کا بستر بدلا۔ اور دھلا ہوا کرتا پاجامہ بھی ان کے قریب رکھ دیا تا کہ وہ لباس بدل لیں پھر بچوں کو ڈیڈی کی دیکھ بھال اور آرام کے بارے میں ہدائتیں دے کر رخصت ہو گئی۔

سندیپ کی بیماری کے دوران رینو کو ان کی شخصیت کے کئی پہلو معلوم ہوئے۔ اسے تعجب ہوا کہ شوبھا نے آخر ان میں کون سی برائی دیکھی جو انہیں اور بچّوں کو چھوڑ گئی۔ سندیپ بے حد متوازن خیالات کے نرم خو شائستہ اور مہربان انسان تھے— پھر ایک مشہور کمپنی میں جی ایم تھے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اگر شوبھا چاہتی تو اس گھر کو پریم اور

خوشیوں سے سورگ بنا سکتی تھی۔ وہ تو بنے بنائے سورگ کو ٹھکرا کر چلی گئی۔ کبھی کبھی ہم نادانی میں اوپر والے کی رحمتوں سے منہ موڑ کر خود اپنی تباہی کو دعوت دے ڈالتے ہیں — شوبھا نے بھی یہی نادانی کی تھی — اس نے اپنی آزادی اور خود مختاری کے لئے گھر، بچوں اور شوہر کو قربان کر دیا تھا کیونکہ سندیپ کو اس کی حد سے بڑھی ہوئی آزادی پسند نہیں تھی۔ اور وہ اسے کلب اور پارٹیوں میں جانے سے منع کرتا تھا۔ لیکن چھوٹے چھوٹے بچوں کو آیا کے پاس چھوڑ کر وہ تفریح کے لئے نکل جاتی تھی۔ اور پھر ایک دن وہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔ اس وقت ٹکو پانچ سال کا تھا۔ اور رمپی دو ڈھائی سال کی ہوگی لیکن شوبھا نے بچوں کی زنجیریں بھی کاٹ پھینکیں۔

سندیپ نے بتایا — ان کی آواز میں روح کا سارا درد سمٹ آیا تھا۔ اور آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔

رمپی کے برتھ ڈے پر اس نے پارٹی کا سارا انتظام سنبھال لیا — اور سندیپ کو ایک بار پھر کسی کے بارے میں سوچنا پڑا — ورنہ شوبھا کی بے وفائی نے انہیں اس حد تک بیزار کر دیا تھا کہ وہ عورت ذات کا نام تک سننا پسند نہیں کرتے تھے۔

پارٹی کے بعد جب وہ گھر جانے کے لئے تیار ہوئی تو سندیپ نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

''رینو اس گھر کو اور خود مجھ کو تمہاری ضرورت ہے بچوں کا پیار بھی تم سے چھپا نہیں ہے۔ اب بتاؤ تمہارا کیا فیصلہ ہے؟'' —

''فیصلہ تو ہو چکا'' رینو نے مسکرا کر ٹکو اور رمپی کو لپٹا لیا اور سندیپ نے اپنا بھاری ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھ دیا۔

☆☆

بُرا آدمی

شکورے اچانک بستی سے غائب ہوگیا تو بستی والوں نے سُکھ کی سانس لی۔ جب تک وہ گاؤں میں رہا سب کا جینا حرام کئے رہا۔ جدھر سے نکل جاتا، لوگ اپنی عزّت، جان و مال کی خیر مناتے۔ وہ انسان نہیں طوفان تھا۔ جو کہیں بھی کبھی بھی قیامت ڈھانے پہنچ جاتا تھا۔ اسے دیکھ کر اچھے اچھوں کا پسینہ چھوٹ جاتا تھا۔

مضبوط ہاتھ پاؤں، نَس نَس میں بجلیاں بھری ہوئی۔ چال میں ایسی دھمک مانو سڑک پر بل ڈوزر چل رہا ہو۔ اس کی بڑی بڑی لال ڈورے والی آنکھوں سے خون ٹپکتا تھا— اور اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ ساری دنیا سے انتقام لینے کے لئے پیدا ہوا ہو۔ اپنے پیدا ہونے کا انتقام۔ اور جس سے اسے انتقام لینا چاہئے تھا، وہ اس کے جنم لینے سے پہلے ہی اس کی ماں کو چھوڑ کر جا چکا تھا۔ ماں نے محنت مزدوری کر کے اسے پالا۔ لیکن ایک دن وہ بھی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ رات میں اچھی بھلی سوئی تھی صبح جب دیر تک نہیں جاگی تو شکورے نے رونا شروع کر دیا۔ اسے بھوک لگی تھی۔ اور ماں سوئی پڑی تھی۔ پاس پڑوس والوں نے دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ رات کے نہ جانے کس پہر سانپ اسے ڈس گیا تھا۔ شکورے اس وقت بہ مشکل تین برس کا تھا۔ بستی والوں نے اس کی چند روز دیکھ بھال کی۔ لیکن آخر کب تک وہ اس کی ذمے داری اٹھاتے۔ ان کے اپنے بال بچّے تھے۔ مسائل تھے۔ سب غریب تھے۔ پھر وہ خود ہی بستی کی گلیوں میں رُل کر بڑا ہو گیا۔ اگر اپنی بڑھوتری روکنے کا کوئی طریقہ اسے معلوم ہوتا۔۔۔ تو وہ کبھی بڑا نہ ہوتا۔

کیونکہ جب تک وہ چھوٹا رہا۔لوگ ترس کھا کر اسے کھانے کے لئے دے دیتے تھے۔جب ذرا اس نے ہاتھ پاؤں نکالے تو بستی والوں نے بھی اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔کہ بھئی اب تم بڑے ہو گئے ہو۔محنت مزدوری کرو۔اور کماؤ کھاؤ۔۔۔۔لیکن شکورے کو تو مفت کی روٹیاں لگ گئی تھیں۔سر پر کوئی بڑا نہیں تھا جو اسے کسی کام پر لگاتا اور محنت مزدوری کی ترغیب دیتا۔ بستی والے کچھ کہتے تو اسے محسوس ہوتا کہ طعنے دے رہے ہیں۔بھیک مانگنا اس کی سرشت میں نہیں تھا دو وقت کی روٹی اس کی بھی ضرورت تھی۔اس لئے جب اسے بھوک ستاتی وہ کسی ہوٹل یا مٹھائی کی دوکان پر جا کر بیٹھ جاتا اور اپنی من پسند چیزوں کا آڈر اس طرح دیتا۔جیسے جیب میں نئے نئے کرارے نوٹ بھرے ہوں۔پیٹ بھر جاتا تو وہ بڑی شان سے چل دیتا کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس سے پیسے مانگے یا اس کی فرمائش پوری کرنے سے انکار کرے۔ کیونکہ سب لوگ ہیرا کے انکار کا انجام دیکھ چکے تھے—

بسوں کے اڈے کے پاس ہیرا کا چائے کا ہوٹل تھا۔ہر وقت وہاں سے بسیں اور ٹرک وغیرہ گزرتے رہتے تھے۔اور بس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے مسافر، یا ٹرک ڈرائیور وہاں رک کے چائے پانی کرتے تھے۔ہیرا کا ہوٹل صبح سے رات کے بارہ بجے تک کھلا رہتا تھا۔

ایک دن شکورے ٹہلتا ہوا بس کے اڈّے پہنچ گیا۔اور ہوٹل کے باہر پڑی ہوئی لکڑی کی بینچ پر بیٹھ گیا۔ہوٹل کا چھوکرا دوڑ کر آیا تو اس نے چائے بَن مکھن کا آرڈر دیا۔ہیرا اس کی شہرت سے واقف تھا لیکن یہ بھی اطمینان تھا کہ درجنوں لوگوں کی موجودگی میں وہ کوئی بدمعاشی نہیں کر سکتا۔شکورے نے ڈٹ کر کھایا پیا اور جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔چھوکرا پیسے لینے آیا تو اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ہیرا کو اس کی یہ دھاندلی پسند نہیں آئی۔اس نے کاؤنٹر سے باہر آ کر سخت لہجے میں کہا—

''شکورے—دھندے کے وقت مسخری نہ کرو''۔

''مسخری کون کم بخت کر رہا ہے؟''—

شکورے منہ پھاڑ کر ہنسا تو ہیرا کو بھی غصہ آ گیا۔کہنے لگا ''یہ سامان مفت میں نہیں آتا کہ تم کھا پی کر چلتے بنو۔شرافت سے چھ روپے نکالو ورنہ اچھا نہیں ہوگا''—

ہیرا نے دھمکی دی—

''اس سے زیادہ بُرا بھی نہیں ہوگا'' کہہ کر شکورے نے ہاتھ مار کر دودھ کا بڑا سا بھگونہ بھٹی سے نیچے گرایا اور کاؤنٹر پر رکھی ہوئی ساری اچاریاں ایک ایک کر کے اچھال دیں۔ اچاریاں چکنا چور ہوگئیں۔ بسکٹ، سموسے، اور نان خطائیاں کھولتے ہوئے دودھ میں ڈبکیاں کھانا لگیں۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اسے روکے یا ٹوکے اور شکورے یہ جا وہ جا۔

اس واقعے کے بعد شکورے کی ہمت اور بڑھ گئی۔ اپنی ضرورت کا کوئی بھی سامان وہ دوکان سے اٹھالیتا اور دوکاندار منہ سے ایک لفظ نہ نکالتا۔ بستی سے ملے ہوئے گاؤں میں ایک پولیس چوکی تھی۔ جہاں دو سپاہی سارا دن کھاٹ پر پڑے جمائیاں لیتے رہتے اور دروغہ جی اپنا 'حصہ' لے کر مگن رہتے۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا فریادی رپوٹ لکھانے آتا تو گویا اپنی شامت کو خود آواز دیتا— اور اسے اپنی جان چھڑانا مشکل ہو جاتی۔ چور سپاہی کے کھیل میں بے چارہ شاہ مارا جاتا۔ اس لئے لوگ اپنا نقصان برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

زمینداری ختم ہوئی تو زمین دار بھی ختم ہوگئے۔ اب گاؤں اور قصبوں میں مہاجنوں کا راج تھا— بستی میں لالہ چمن داس سے زیادہ دولت مند کوئی بندہ بشر نہیں تھا۔ لالہ جی رہن اور بیج کا کام کرتے تھے۔ کسان اپنی ہر ضرورت پر ان سے قرض لینے پر مجبور تھے۔ اگر وہ قرض نہ لیتے تو ان کی بیٹیاں کنواری رہ جاتیں۔ کھیتوں کے لئے بیج نہ ملتا تو اناج کیسے پیدا ہوتا۔ بیلوں کی جوڑی لینا ہوتی تب بھی لالہ کی چوکھٹ پر ماتھا ٹیکنا پڑتا اور خالی خولی تو لالہ اپنے باپ کو دمڑی نہیں دیتا تو کسان کو کیسے دیتا۔ نتیجے میں کسانوں کی زمین لالہ کے بہی کھاتوں میں چڑھ جاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کا ہر کسان لالہ کا قرض دار ہوگیا۔ اور ایک گاؤں پر کیا منحصر— آس پاس کے دو چار گاؤں تک لالہ کی ہنک تھی— یہ بستی بھی ان کی حکومت کے دائرے میں آتی تھی— لالہ کی کوٹھی اونچی ہوتی گئی اور ان کی تجوریاں گاؤں کی بہو بیٹیوں کے زیورات سے اُبلنے لگیں— ان کا ہر کام قانون کے مطابق ہوتا تھا۔ اس لئے کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

شکورے کی شورہ پشتی بڑھنے لگی تو بستی کے بڑوں نے لالہ سے فریاد کی ان کی پہنچ

بہت اوپر تک تھی۔ بڑے بڑے لیڈر اور افسران کے مہمان ہوتے تھے۔ لالہ جی نے وعدہ کیا کہ وہ شکورے کو بلا کر سمجھائیں گے۔ اور اگر اس نے ان کی بات نہ مانی تو پھر اس کا دوسرا انتظام کریں گے — انہیں اپنی دولت کا زعم تھا۔ کوٹھی کے پھاٹک پر دو پہرے دار دن رات۔ چوبیس گھنٹے کھڑے رہتے تھے۔ گودام پر بھی پہرہ رہتا تھا۔

لالہ کے بلاوے پر شکورے یوں ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا جیسے اسے دعوت میں بلایا گیا ہو۔ یا پھر لالہ اس کا قرض دار ہو۔

''کیا بات ہے لالہ۔ کیوں یاد کیا ہے؟''۔

شکورے! تمہاری بد معاشیاں روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہیں۔ بستی کے غریب لوگوں کو ستا کر تمہیں کیا ملتا ہے؟''۔

لالہ نے نرم لہجے میں کہا—

''آپ سے کس نے میری شکایت کی ہے؟''—

''کیا میں بہرا ہوں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا — جب تمہاری شکایت نہ ملتی ہو؟'' — لالہ نے اسے ملامت کی۔

''لالہ — میں نے کس کی زمین ہڑپ کی ہے؟ کس کا زیور اپنی تجوری میں بند کیا ہے؟ تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے میں سود خور مہاجن ہوں۔ اور تم بستی والوں کے اَن داتا ہو۔؟''—

شکورے کے طنزیہ جملوں نے فلیتے کا کام کیا۔ وہ بھڑک اٹھے۔ چیخ کر بولے۔

''اپنی اوقات میں رہ لڑکے'' — ورنہ''—

''ورنہ تم کیا کر لو گے۔ نہ میرے پاس کھیت ہیں نہ زمین جس کا ڈر ہو۔ ڈریں وہ جن کی تجوریاں حرام کی دولت سے بھری ہیں۔ جن کے گودام غریبوں کی خون پسینے کی کمائی سے اُبل رہے ہیں''—

شکورے لالہ کا جواب سنے بغیر باہر نکل گیا۔ اسی رات لالہ کے گودام میں آگ لگ گئی۔ اور ہزاروں کا اناج جل کر راکھ ہو گیا۔ پولیس تھانہ ہوا۔ لالہ نے زمین آسمان ایک

کر دیا لیکن شکورے کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ بستی والوں نے سکون کی سانس لی۔ لالہ کا کیا ہے؟۔ ان کا نقصان تو دو تین سال میں پورا ہو جائے گا۔ البتہ ان کی مصیبت ختم ہو گئی تھی۔ اب شکورے یہاں واپس نہیں آئے گا اس کا سب کو یقین تھا—

صرف بستی ہی نہیں آس پاس کے کئی گاؤں سوکھے کی لپیٹ میں آ گئے۔ کسان بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ایسے وقت میں لالہ نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ اور سب نے شہر کا رخ کیا۔ ہر اڈّے پر مزدوروں کی بھیڑ نظر آتی تھی۔ جن دنوں مزدور کم ہوتے تھے۔ تو مزدوری بڑھ جاتی تھی۔ مزدوروں کی تعداد بڑھتی تھی تو مزدوری کم ہو جاتی تھی۔ ٹھیکے دار ایسے موقعوں پر خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔ غرض مند پیٹ کی خاطر کم پیسوں پر بھی کام کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

بشیر کام کی تلاش میں شہر آیا تو ایک ٹھیکے دار کے پاس اسے کام مل گیا۔ تین دن پہلے اسے چھٹی مل گئی تھی اب وہ روز اڈّے پر آ رہا تھا۔ اس دن بھی وہ مزدوروں کے ساتھ کھڑا تھا۔ کہ اچانک اس کی نظر شکورے پر پڑ گئی۔ وہ ذرا سب سے ہٹ کر رنگ کی بالٹی اور برش لئے کھڑا تھا۔ بشیرا کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ شکورے اور مزدوری—؟ چھین جھپٹ کر کھانے والا۔ حرام خور اور کام چور شکورے، محنت مزدوری کیسے کرنے لگا؟۔ وہ اس کے قریب گیا— کہا—

"شکورے بھیّا سلام"—

"ارے بشیرا— تم یہاں کیسے؟"۔

عرصے کے بعد کوئی پہچان والا نظر آیا تھا۔ شکورے خوش ہو گیا۔ اور محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا—

"کیا بتائیں بھیّا— سوکھے نے پوری بستی کو تباہ کر دیا۔ مجبوراً مزدوری کرنے یہاں آنا پڑا—"

بشیرا نے ایسے دکھڑا رو دیا جیسے شکورے اس کا یار بیلی ہو— اس وقت وہ اس کی ساری بدمعاشیاں بھول گیا تھا— شکورے نے بڑی محبت اور اپنائیت سے کہا۔

''آج تو شاید ہی کام ملے۔ بازار، بہت مندا جا رہا ہے۔ میرے ساتھ چلو۔ گھر پر بیٹھ کر باتیں کریں گے''—

دونوں قریب کی ایک کچی بستی میں پہنچے شکورے نے چھوٹی سی ایک جھونپڑی کے سامنے کھڑے ہو کر آواز دی۔

''ریشماں؟''—

تیرہ چودہ برس کی سانولی سلونی ایک لڑکی باہر آئی اور ایک اجنبی مرد کو دیکھ کر شرما گئی— دھیرے سے کہا—

''آج تم بڑی جلدی آ گئے— کیا کام نہیں ملا؟''—

''اڈّے پر بشیرا مل گیا۔ یہ ہماری بستی کا ہے۔ تم جلدی سے چائے بنا لاؤ''— شکورے نے کہا— وہ جھٹ اندر چلی گئی— اور شکورے نے کھاٹ بچھا کر بشیرا کو بٹھایا۔ رنگ کا ڈبہ کنارے رکھ دیا۔ ایک گہری سانس لے کر— پوچھا—

''گاؤں بستی کا کیا حال ہے''؟

''ویسا ہی جیسا تم چھوڑ کر آئے تھے۔ بلکہ اس سے بھی خراب''

بشیرا نے لالہ کا نام نہیں لیا۔ اور نہ ہی گودام جلنے کا واقعہ یاد دلایا— دل میں کہا—

''اچھا ہوا جو شکورے نے بستی چھوڑ دی— اور شہر آ کر گھر بھی بسا لیا— وہاں رہتا تو—''—

''بابا— چائے لے جاؤ—''

اندر سے ریشماں کی آواز آئی۔ بشیرا نے چونک کر اسے دیکھا۔

''یہ میری بیٹی ہے—'' شکورے نے بتایا—

''اور تمہاری گھر والی—؟''

''میں نے بیاہ نہیں کیا''—

''تو پھر یہ— یہ بیٹی؟''—

بشیرا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ شکورے نے خود ہی کہا—

"یہ اسٹیشن پر بھیک مانگتی تھی— میں اسے اپنے ساتھ لے آیا لڑکا لاوارث ہوتو شکورے بن جاتا ہے— لیکن اگر لڑکی لاوارث ہوتو—"—

شکورے نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ لیکن بشیرا اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا۔ اور اس نے بڑی محبت اور عقیدت سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے—

☆☆

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

موری کی اینٹ

جھنڈولے بالوں والی نو دس برس کی ایک میلی کچیلی بچی ان کے سامنے کھڑی تھی — انہوں نے سوالیہ نظروں سے امّو کو دیکھا — امّو نے فوراً کہا —

"بیگم! یہ بے چاری بڑی دیر سے پھاٹک پر کھڑی تھی — رمضانی نے اسے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ شاید بھوکی ہے" —

"اسے کچھ کھانے کو دے دو" —

بیگم نے ایک اُچٹتی ہوئی نظر بچی پر ڈالی تو میل کی تہوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ نہ رنگ روپ نہ ناک نقشہ خوا جانے کب سے بدن پر پانی نہیں پڑا تھا — کپڑوں کی حالت تو اور بھی خراب تھی۔

"کم بخت — کتنی گندی ہے" —

اس کی حالت دیکھ کر انہیں گھِن آ گئی۔ پھر کچھ سوچ کر بولیں۔

"مہ پارہ کا کوئی پرانا جوڑا ابھی اسے دے دو" —

امّو اسے اپنے ساتھ باورچی خانے میں لے گئیں۔ ایک کنارے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر المونیم کے پیالے میں تھوڑا سا سالن نکالا۔ اور دو روٹیاں اس کے ہاتھ میں تھما کر کہنے لگیں "لے۔ کھالے۔ اُدھر نل ہے پانی پی لینا۔ میں ابھی آتی ہوں" —

اسے چھوڑ کر وہ سامان کی کوٹھری میں گئیں۔ وہاں اوپر تلے کئی چوبی صندوق رکھے تھے۔ انہوں نے باری باری کئی صندوق کھولے۔ لیکن اس کے لائق کوئی کپڑا نظر نہ

آیا۔ مہ پارہ کے کپڑے چھوٹے ضرور ہو گئے تھے۔ لیکن سب کے سب بہت قیمتی اور اچھی حالت میں تھے۔ بڑی مشکل سے ایک سادہ شلوار جمپر ملا۔ تو انہوں نے اطمینان کی سانس لی — اور کپڑوں کا گولا سا بنا کر باورچی خانے میں لے گئیں۔ وہ ابھی تک بڑے انہماک سے روٹی کھا رہی تھی — انہوں نے پاس پڑی ہوئی پیڑھی پر کپڑوں کا گولا رکھا۔ پوچھا۔

"تیرا نام کیا ہے چھوکری" —

"بانو" چپڑ چپڑ نوالے چباتے ہوئے نام بتایا۔ پھر وہ اٹھ کر نل پر گئی — اور پانی پی کر وہیں آ گئی —

"لے کپڑے اٹھا لے اور گھر چلی جا" —

بچی نے کپڑے بغل میں دبائے اور باہر جانے کے بجائے دہلیز پر بیٹھ گئی۔

"کیا گھر جانے کا ارادہ نہیں ہے جو یوں اطمینان سے بیٹھی ہے؟"

امّو نے اسے ٹہوکا دیا — اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ انہیں ہنسی آ گئی — چمکار کر کہا —

"تیری ماں پریشان ہو گی کہ جنم جلی کہاں چلی گئی — " —

بچی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس ٹکر ٹکر ان کی صورت دیکھتی رہی — امّو چڑ کر بولیں۔

"اب دفع ہو جا۔ مجھے اور بھی بہتیرے کام کرنا ہیں۔"

بچی اٹھ کر ایک طرف چل دی وہ بھی غڑاپ سے ایک کمرے میں غائب ہو گئیں۔

امّو جب اس حویلی میں آئی تھیں تو آمنہ بیگم تھیں بیگم نے انہیں مہ پارہ کی دیکھ بھال کے لئے ملازم رکھا تھا — اس وقت مہ پارہ دو ڈھائی سال کی تھی۔ وہ اپنی توتلی زبان سے انہیں امّو کہنے لگی تو وہ پوری حویلی کی امّو ہو گئیں — یوں بھی حویلی میں بیگمات کی کمی نہیں تھی — انہیں کون آمنہ بیگم کہہ کر مخاطب کرتا — مانا کہ وہ شریف زادی تھیں — لیکن رتبہ تو بیگموں والا نہیں تھا۔ چونکہ بیوہ تھیں آل اولاد بھی نہیں تھیں — سو وہ حویلی کی ہو کر رہ گئیں اور کبھی یہاں سے جانے کا خیال بھی نہیں آیا۔ اب تو مہ پارہ خدا رکھے گیارہ بارہ سال کی

ہوگئی تھی — اور اپنی اماں حضور سے زیادہ ان سے مانوس تھی —

حویلی کے مالک صولت نواب خاندانی رئیس تھے — اللہ کا دیا بہت کچھ تھا — بیگم بھی رئیس زادی تھیں اور حیثیت میں ان سے کسی صورت کم نہیں تھیں — چھکڑوں پر لد کر ان کا جہیز آیا تھا۔ جب تک ساس زندہ رہیں وہ بہو صاحبہ کہلائیں۔ ان کے گزرنے کے بعد ''بیگم صاحبہ'' کہلانے لگیں اور کیوں نہ کہلاتیں آخر حویلی کے کل جُز کی مالک وہی تو تھیں —

صولت نواب کا زیادہ وقت مردان خانے میں گزرتا تھا۔ شادی کے ابتدائی زمانے میں تو وہ زنان خانے کے دو چار چکّر لگاتے تھے۔ کچھ ماں کا لحاظ۔ کچھ نئی نویلی دلہن کا موہ بھی تھا۔ رفتہ رفتہ دلہن بھی پرانی ہوتی گئی۔ اور ماں کے انتقال کے بعد کسی کا لحاظ پاس بھی نہیں رہا۔ اب جوان کی برائے نام آمد و رفت رہ گئی تھی — وہ بھی بس مہ پارہ کی وجہ سے۔ وہ ان کی بے حد لاڈلی تھی — شاید اس کا سبب یہ تھا کہ وہ شادی کے چار سال کے بعد پیدا ہوئی تھی — اور یہ تو انسانی فطرت ہے کہ جو شئے مایوسی کے بعد ملتی ہے اس کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ بیگم کو بھی میاں سے کوئی خاص رغبت نہیں تھی — حویلی کے انتظام سے انہیں سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی تھی — وہ اگر دنوں بلکہ ہفتوں بیوی کے پاس نہ پھٹکتے تو انہیں بھی ان کی ذرا فکر نہ ہوتی اور نہ انہوں نے کبھی میاں کی مصروفیات کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ جلنا کڑھنا تو دور رہا — ان کے لئے تو یہ حویلی اور مہ پارہ ہی کافی تھیں —

بانو دن بھر بغل میں کپڑے دبائے حویلی میں اِدھر سے اُدھر گھومتی رہی۔ رات ہوئی تو ایک کونے میں پڑ کر سو گئی۔ صبح ہوئی تو وہ پھر باورچی خانے میں موجود تھی۔ امّو نے اسے دیکھا تو مارے حیرت کے ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا — کچکچا کر بولیں —

''اے ہے کم بخت تو کل سے یہیں ہے؟'' —

بانو نے کوئی جواب نہیں دیا — اور ایک کنارے بیٹھ گئی — امّو کا جی چاہا کہ ابھی اس کا ہاتھ پکڑ کر حویلی سے باہر نکال دیں۔ پھر اس کی معصوم شکل دیکھ کر ترس آ گیا۔ لیکن ڈپٹ کر بولیں ''جا منہ ہاتھ دھو کر آ جا'' —

بانو چپ چاپ اٹھ کر چلی گئی۔ منہ پر پانی کے دو تین چھپا کے مارے اور وہیں واپس آ گئی۔ امّو نے کٹورے میں چائے انڈیلی اور باس روٹی اسے پکڑا کر چائے کا کٹورا اس کے سامنے رکھ دیا۔ پھر اسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

''چائے پی لے۔ پھر اپنے گھر چلی جانا۔ اگر بیگم نے تجھے دیکھ لیا تو بہت خفا ہوں گی۔''

انہوں نے بیگم کا نام لے کر ڈرایا۔ بانو نے اقرار کیا نہ انکار۔ خاموشی سے چائے سُڑکنے لگی۔ امّو اِدھر اُدھر ہو گئیں دوپہر میں ملازموں کو کھانا دیا گیا تو وہ پھر موجود تھی — اب تو امّو کا پارہ چڑھ گیا۔ منہ سے ایک لفظ کیسے بغیر اس کی بانہہ پکڑی اور سیدھی بیگم کے پاس لے گئیں۔ پھر اسے دھکیل کر ان کے سامنے کر دیا — کہا —

''بیگم یہ تو بڑی ڈھیٹ ہے۔ کل سے گھوم پھر کر یہیں جمی ہوئی ہے۔ جانے کا نام ہی نہیں لیتی۔ جب دیکھو باورچی خانے میں موجود ہے۔ مانو اس کے باوا نے دیگیں چڑھوائی ہوں'' —

بیگم نے اسے اپنے پاس بلایا — نرمی سے پوچھا —

''تیرا گھر کہاں ہے؟'' —

اس نے انکار میں سر ہلا دیا —

''تیرے ماں باپ کہاں ہیں؟'' — امو پھنکاریں —

''نہیں ہیں'' — بانو نے بسور کر کہا —

'نگوڑی کیا آسمان سے ٹپکی ہے؟'' —

امّو نے جھلا کر اسے ایک دھموکہ مارا — وہ روئی نہ چلائی بس ٹکر ٹکر بیگم کی صورت دیکھنے لگی۔ امّو کی مار کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بیگم کو ترس آ گیا —

''امّو شاید بے چاری لاوارث ہے۔ خدا جانے کہاں سے بھٹکتی ہوئی یہاں آ گئی — لڑکی ذات چار دن میں جوان ہو گی تو کیا کرے گی؟ —

زمانہ بہت خراب ہے۔ امّو اسے یہیں حویلی میں پڑا رہنے دو — اس کی دو

روٹیوں کی حویلی میں کمی نہیں ہے۔ جہاں اتنے جی پل رہے ہیں وہاں ایک اور سہی— مہ پارہ کو بھی دوسرا ہٹ ہوگی— غریب سارا دن اکیلی ڈاؤں— ڈاؤں کرتی ہے"—

بیگم کی اجازت ملی تو امّو اسے اپنے ساتھ لے گئیں اور امامن بوا کے حوالے کر دیا۔ امامن خوا جانے کس بات پر جلی بیٹھی تھیں اسے دیکھا تو غرّا کر بولیں—

"یہ آخور کہاں سے اٹھالائیں بی امّو— چل پرے ہٹ لڑکی"

"بیگم نے کہا ہے کہ اسے نہلا دھلا دو— کپڑے اس کے پاس ہیں ذرا صاف ستھری ہو جائے تو اسے اپنی صاحبزادی کے پاس لے جائیں گے"—

امّو بھلا امامن کے غصّے کی کیا پرواہ کرتیں۔ بیگم کا حکم سنا کر چلتی بنیں۔ اور امامن نے سارا غصّہ بانو غریب پر اتار دیا— جھانوے سے اس کے بدن پر ایسے گھسّے دئے جیسے گھوڑے کے کھریرا کر رہی ہوں— نہا دھو کر اور صاف کپڑے پہن کر تو اس کی کینچلی ہی— بول گئی۔ میل کی تہوں کے نیچے جو گندمی رنگت چھپی تھی وہ نکھر کر سنہری بالی کی طرح چمکنے لگی۔ اور اس رنگت میں تھوڑا سا نمک بھی گھُل گیا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تارہ سی چمکنے لگیں۔ گھنگھریالے بال البتہ قابو میں نہیں آرہے تھے۔ بلکہ دُھل دھلا کر اور زیادہ سرکش ہو گئے تھے۔ امّو نے ڈھیر سارا تیل چپڑ کر انہیں جمانے کی کوشش کی۔ لیکن سامنے کی شریر لٹیں اس کی روشن پیشانی پر لہرانے سے باز نہیں آرہی تھیں۔ امّو نے بڑے پیار سے اسے ایک دو ہتڑ مارا اور لے جا کر مہ پارہ کے حوالے کر دیا— مہ پارہ کو تو بیٹھے۔ بٹھائے ایک سہیلی مل گئی۔ حفظ مراتب کا سوال ہی نہیں تھا۔ کچّی عمر میں ہر چیز، ہر شئے، ہر فرد اچھا لگتا ہے— اور جہاں سب اچھا ہی اچھا ہو۔ وہاں بانو جیسی سہیلی کیوں نہ اچھی لگتی!

سارا دن بانو مہ پارہ کے ساتھ رہتی تھی— وہ مولوی صاحب اور ماسٹر صاحب سے پڑھتی تو بانو اس کے قریب بیٹھی رہتی— اس کی دلچسپی دیکھ کر مولوی صاحب اور ماسٹر صاحب بھی اسے پڑھانے لگے۔ جلد ہی اُنہیں اس کی ذہانت کا اندازہ ہو گیا—

امّو رات میں اسے اپنے قریب ہی دوسری پلنگڑی پر سلاتی تھیں۔ اور وہ ان سے ڈھیر ساری باتیں کرتی تھی— امّو کی آنکھیں بند ہو جاتیں لیکن اس کی باتیں ختم نہ ہوتیں—

وہ یہاں بہت خوش تھی—

مہ پارہ کے ساتھ بانو نے بھی پرائیوٹ ہائی اسکول کا امتحان دیا اور اچھے نمبروں سے پاس ہوگئی۔ جب دونوں بیگم کو اپنا رزلٹ دکھانے گئیں تو انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ یہ 'وہی' بانو ہے۔ وہ ان کے سامنے نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ اس کی شرمگیں مسکراہٹ میں کامیابی کی خوشی جھلک رہی تھی۔ پہلی بار بیگم کو بھی اپنے فیصلے پر خوشی کا احساس ہوا۔ اگر وہ اسے سہارا نہ دیتیں تو غریب لڑکی سڑکوں پر رُل کر ختم ہو جاتی۔

انہوں نے مہ پارہ کے ساتھ اسے بھی انعام دیا— سونے کی بالیاں جس میں سچے موتی پڑے تھے— اس کے سونے جیسے رنگ پر خوب کھِل رہی تھیں—

حویلی کے سامنے والے دو منزلہ مکان کی بالائی منزل پر کبوتر پلے ہوئے تھے۔ اور یہ گولا کبوتر ٹکڑیوں میں اڑائے جاتے تھے۔ آس پاس کے کئی گھروں میں کبوتروں کے شوقین آباد تھے۔ صبح، صبح، ہُو، ہاؤ، کی آوازیں بلند ہوتیں اور لوگ لکّیاں لے کر کبوتر اڑانے لگتے۔ ذرا دیر میں آسمان کبوتروں سے بھر جاتا۔ اور جب کبوتروں کے مالک اپنے اپنے کبوتروں کو اُترنے کا اشارہ کرتے تو طرح طرح کی آوازیں نکالتے۔ تربیت یافتہ کبوتر اپنی چھت پر اترتے وقت دوسرے کبوتروں کو بھی اپنے ساتھ لگا لاتے تھے۔ اس پر خوب خوب شور مچتا تھا۔

مہ پارہ کو اس کھیل میں بہت مزہ آتا تھا اور وہ اکثر بانو کے ساتھ چھت پر جا کر یہ تماشہ دیکھتی تھی۔ صاحبِ خانہ تو ایک کھٹولے پر لیٹے مزے سے حقہ گڑگڑاتے رہتے تھے— اور ایک دبلا پتلا لڑکا لمبی سی لگّی ہلا ہلا کر کبوتروں کو اڑانے کا فرض انجام دیتا تھا۔ اور طرح طرح کی آوازیں نکال کر ان کا جوش بڑھاتا تھا۔ جس دن کبوتر نہیں اڑتے تھے لڑکا اپنی کتابیں سامنے رکھے پڑھتا نظر آتا تھا۔ وہ کبوتروں کو اڑانے والی لگّی کی طرح سوکھا چمرخ تھا اور صُورت ہی سے بہت بے وقوف لگتا تھا۔ معمولی قمیض اور پاجامے میں ملبوس اس کا سراپا مضحکہ خیز اور شخصیت دبی دبائی سی نظر آتی تھی۔ خدا جانے اسکول جاتا بھی تھا یا محض وقت گزاری کے لئے کتابیں لئے بیٹھا رہتا تھا— مہ پارہ کو اس پر بہت ہنسی آتی تھیں—

لیکن بانو کو بہت ترس آتا تھا— ایک تو کبوتر اڑانے کی سخت ڈیوٹی— اور آؤ، آؤ کی آوازیں لگا کر انہیں واپس بلانے کی خدمت اوپر سے پڑھائی کا بوجھ— خدا جانے پاس ہوتا تھا یا نہیں؟"—

بانو چھت پر کپڑے پھیلانے جاتی تھی تو ایک نظر سامنے ضرور ڈال لیتی تھی۔ کبھی وہ دکھائی دیتا اور کبھی غائب ہو جاتا تھا— شاید کبوتر اڑانے کا بھی کوئی مخصوص موسم ہوتا تھا— پھر ایسا ہوا کہ وہ ہفتوں اور مہینوں نظر نہیں آیا— اب اس کی جگہ ایک ملازم چھوکرا کبوتر اڑانے کی خدمت انجام دینے لگا تھا— کچھ عرصے کے بعد بانو بھی اسے بھول بھال گئی۔ یوں بھی وہ یاد رکھنے کے لائق کب تھا—

"بیگم ہمارے سرکار کی تو خیر اپنی الگ ہی دنیا ہے۔ لیکن آپ کو اب صاحبزادی کی فکر کرنا چاہئے—"

امّو نے ایک دن موقع دیکھ کر بیگم سے کہا—

"میں نے رنّو دائی اور ناون دونوں کے کان میں بات ڈال دی ہے—"

بیگم نے کتاب ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا۔ اور پوری طرح امّو کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"دیکھتے سنتے بھی سال لگ جائے گا— اچھے لڑکوں کا تو نگوڑا اکال پڑ گیا ہے"— امّو فکرمندی سے بولیں—

"تم ٹھیک کہتی ہو امّو— اچھے خاندانوں کے لڑکے تو اور زیادہ برباد ہیں— وہ بس باپ، دادا کی کمائی پر عیش کرنا جانتے ہیں۔ اوپر سے طرح طرح کی بازیاں جان کو لگی ہیں۔ تعلیم سے انہیں بیر ہے کام کرنا ان کی شان کے خلاف ہے— بنتے رئیس زادے ہیں—"

بیگم نے ٹھنڈی سانس لی۔

"سرکار کے اتنے دوست احباب ہیں۔ اگر انہیں میں کوئی موزوں رشتہ مل جائے تو—"—

امّو کو صولت نواب کے دوستوں کا خیال آ گیا۔

"وہ سب دستر خوان کے ساتھی ہیں۔ بس صبح و شام کھانے آ جاتے ہیں۔ نہ ہمدردی۔ نہ خیر خواہی— کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے کہ یہ مفت کا لنگر ہی بند کر دوں— اور تمہارے سرکار سے کہہ دوں کہ بس بہت ہوا— اب آپ اپنا دربار بڑھا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی—"

بیگم نے جل کر دل کا غبار نکالا۔ آخر صبر کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔

"اگر سرکار اندر خاصہ نوش کرتے ہوتے تو ان مفت خوروں سے جان بچ جاتی"

امّو نے تاسّف سے کہا۔

"لو— یہ اور ہوئی— ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ یہ تب کی بات ہے— خدا بخشے ہماری ساس بار بار آدمی بھیج کر انہیں باہر سے بلواتیں اور وہ "ابھی آتے ہیں" کہہ کر ٹالتے رہتے— آخر ملازموں کو باہر ہی دستر خوان لگانے کا حکم صادر کر دیتے— بے چاری اماں حضور بھی بیٹے کی ماما سے مجبور ہو جاتیں۔ کئی بار میں نے اکیلے کھانا کھانے سے انکار کیا— نئی نویلی دلہن ہونے کا بھی غرور تھا— لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ جھک مار کر میں بھی چپ ہو گئی۔ وہ دن اور آج کا دن— میں نے بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا— پتھر سے سر پھوڑنے سے فائدہ بھی کیا تھا—"—

پہلی بار بیگم نے امّو کے سامنے ماضی کی راکھ کریدی تھی— اور دبی ہوئی چنگاری باہر آئی تھی۔

'ہا جس کو میں برف کا تودہ سمجھتی تھی۔ وہ تو خود اپنی آگ میں جل جل کر راکھ ہو رہی تھی"—

امّو بھی اداس ہو گئیں۔ اور دلگرفتہ لہجے میں بولیں۔

"کیا سرکار کو احساس نہیں ہے کہ بیٹی ماشاءاللہ شادی کے لائق ہو گئی ہے"—

"باہر والوں سے فرصت ملے تو بیٹی کے بارے میں سوچیں" بیگم بھی آزادہ ہو گئیں—

''اب تو جو کچھ کرنا ہے۔ آپ ہی کو کرنا ہے۔ خدا رکھے وہ اگلے چاند میں اٹھارہویں میں لگ جائیں گی''—

''امّو— مجھے تو مہ پارہ کے ساتھ بانو کی بھی فکر ہے''— میں نے رنّو دائی سے کہہ رکھا ہے کہ اس کے لئے بھی لڑکا دیکھے''—

بیگم نے ایک ماں کی سی ذمّے داری سے کہا—

''جب یہ آئی تھی تو کب ہم نے سوچا تھا کہ ایک دن یہ بھی جوان ہوگی— اور اس کی شادی بیاہ کی ذمّے داری بھی ہمارے اوپر ہوگی— خدا جانے کس کا خون ہے— کون سی ذات برادری سے اس کا تعلّق ہے— شادی کے وقت تو دس طرح کے سوال اٹھیں گے ''امّو فکر مند ہوگئیں— ''ہزار سوال اٹھیں— لیکن اسے الٹی سیدھی جگہ جھونکنا بھی تو ٹھیک نہیں ہوگا۔ پڑھ لکھ کر وہ بھی اچھا برا سمجھنے لگی ہے اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ بانو کسی بات میں کم نہیں ہے۔ بلکہ سیکڑوں سے اچھی ہے''۔

بیگم نے بانو کی تعریف کی۔

''ہماری صاحبزادی نے اور زیادہ اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ بالکل اپنے برابر کا سمجھتی ہیں'' امّو مسکرائیں —

''ہم نے بھی تو دونوں میں کبھی فرق نہیں کیا۔ بہنوں کی طرح ساتھ پلی بڑھی ہیں''—

بیگم نے خلوص سے دعا کی—

''خدا اس کا نصیب اچھا کرے''—

''آمین''—— امو نے بھی بیگم کی دعا پر آمین کہی۔ انہیں خود بھی بانو سے بہت محبت تھی۔ وہ بھی بچپن سے آج تک، ہر دم ان کے آگے پیچھے لگی رہتی تھی—

''امّو یہ— امّو وہ''— انہیں ہنسی آ گئی—

ایک روز سامنے والے دو منزلہ مکان سے جسے — ''کالا پھاٹک'' کہا جاتا تھا— زنانی سواریاں حویلی کی ڈیوڑھی میں اتریں— یہ پہلا موقع تھا جب وہاں سے کوئی

حویلی آیا تھا— میل جول اور آنا جانا بھی برابر والوں سے ہوتا ہے۔ ''کالا پھاٹک'' والے کھاتے پیتے لوگ تھے تو کیا ہوا۔ برابر کے تو نہیں تھے— گھر آئے مہمانوں کو عزت دینا حویلی کی پرانی ریت تھی۔ بیگم نے خود بڑھ کر ان کا استقبال کیا— مہمان اپنے ساتھ جو مٹھائی کے خوان اور پھلوں کی کشتیاں لائے تھے— وہ ملازموں نے اندر رکھوا دیں—

بیگم نے بڑے احترام سے خواتین کو دالان میں بچھے تختوں کے چوکے پر بٹھایا۔ ایک خاتون نے سب کے تعارف کا فرض انجام دیا—

''—— یہ ڈاکٹر اعجاز حسین کی والدہ ہیں— یہ بڑی چچی ہیں— یہ بھاوج— اور یہ بہنیں''—

ڈاکٹر اعجاز کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ ماضی کا وہ دبلا پتلا— سوکھا چمرخ لڑکا— جو لگی لئے کبوتر اڑایا کرتا تھا۔ چند ماہ قبل ہی ولایت سے ڈاکٹری کی ڈگری لے کر آیا تھا— اور اپنا مطب کرتا تھا— تندرست، گورا چٹا اسمارٹ سا نوجوان— ڈاکٹر— آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ لگائے— سوٹ بوٹ پہنے— جب اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتا ہوا بازار سے نکلتا تھا— تو دیکھنے والے رشک کرتے تھے۔ رئیس اور امیر خاندان کے مغرور اور بد دماغ حضرات اس کے ساتھ اپنی بیٹیوں کا رشتہ کرنے کے خواہش مند تھے۔ کوئی اسپتال کھلوانے کا لالچ دے رہا تھا، کوئی کار، کوٹھی اور جہیز کا لالچ دے رہا تھا۔ یہ ساری باتیں رنّو دائی نے بتائی تھیں۔ آج ڈاکٹر اعجاز کی والدہ اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر خود حویلی آئی تھیں۔ اونچے گھرانوں کے نکمّے اور آوارہ لڑکوں کے مقابلے میں متوسّط خاندان کا یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکا بدرجہا بہتر تھا— جب ڈاکٹر اعجاز کی والدہ نے دستِ سوال دراز کیا تو بیگم— مہ پارہ کی قسمت پر رشک کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ وہ اپنی لختِ جگر کے لئے ایسا ہی لڑکا تو چاہتی تھیں۔ لیکن جب انہوں نے بانو کو اپنی بہو بنانے کی خواہش ظاہر کی تو کسی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ امّو نے تڑپ کر کہا—

''ہماری صاحبزادی کا نام مہ پارہ بیگم ہے— بانو تو—''—

''ہم جانتے ہیں— اور یہ بھی مانتے ہیں کہ رشتہ اپنے برابر والوں میں ہی کرنا

چاہئے — ہماری یہ اوقات کہاں کہ حویلی والوں کی برابری کریں"—

اعجاز کی والدہ نے کسر نفسی سے کہا— چچی نے گفتگو آگے بڑھائی۔ "بیگم صاحبہ — آپ بانو کی سرپرست ہیں۔ اس لئے ہم آپ کے سامنے اپنا دامن پھیلانے حاضر ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ ہمیں مایوس نہیں کریں گی"—

اب کہنے سننے کے لئے باقی کیا رہا تھا۔ سب کچھ آئینے کی طرح صاف تھا— وہ لوگ مہ پارہ کا نہیں — بانو کا رشتہ لائے تھے — بیگم نے بڑے تحمل سے کہا—

"ہم نواب صاحب سے بات کریں گے"—

"ہماری خواہش ہے کہ رجب کے چاند میں شادی کردیں"—

ڈاکٹر اعجاز کی والدہ اور ان کے ساتھ آئی ہوئی خواتین نے دسترخوان پر سجے ہوئے لوازمات کو برائے نام چکھا۔ چاندی کا ورق لگی ہوئی ایک ایک گلوری نوش کی اور کھڑی ہوگئیں۔

"ہمیں اجازت دیجئے۔ آپ کے جواب کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔"

بیگم بڑے حوصلے سے مسکرائیں اور ڈیوڑھی تک جا کر انہیں رخصت کیا۔ امّو ابھی تک 'شاک' کی کیفیت میں تھیں۔ بیگم مہمانوں کو پہنچا کر آئیں تو امّو کی خاموشی ٹوٹی۔ آہستہ سے کہا۔ "ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہم ایک ناگن کو دودھ پلا رہے ہیں۔ جو موقع ملتے ہی ہمیں ڈس لے گی۔"—

"ایسا نہ کہو امّو — یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ اور قسمت اوپر والا بناتا ہے — ہم نہیں بناتے"—

بیگم کی اعلیٰ ظرفی نے امّو کی زبان بند کردی—

صولت نواب تو بانو کا نام سنتے ہی آپے سے باہر ہوگئے۔ "ان کے ٹکڑوں پر پلنے والی ایک لاوارث لڑکی ان کی مہ پارہ کے مقابلے پر آنے کی جرأت کرے گی — یہ وہ کیسے برداشت کرتے — گرج کر بولے —

"وہ — وہ موری کی اینٹ اس لائق کب ہے کہ ڈاکٹر اعجاز کے چوبارے کی

زینت بنے— آپ نے انہیں اس کی اصلیت بتائی ہوتی—"—

"وہ لوگ اس کی اصلیت اچھی طرح جانتے ہیں"—

بیگم کو میاں کی دھاندلی پسند نہیں آئی—

"ہم اس دو ٹکے کی چھوکری کو اپنی بیٹی کے حق پر ڈاکہ نہیں ڈالنے دیں گے"—

صولت نواب بہت طیش میں تھے—

"آپ کس حق کی بات کر رہے ہیں؟—اور یہ حق آپ کو کس نے دیا ہے؟—معاف کیجئے گا کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ "یہ، اور اس جیسی اور بھی کئی موری کی اینٹیں کہاں سے آئیں؟—انہیں جنم دینے والے بھی تو آپ ہی جیسے لوگ ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر تو آپ کو یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ موری کی یہ اینٹیں کس گٹر یا نابدان کی زینت بن کر اپنے نصیبوں کو روتی ہیں۔ ہر ایک کی قسمت بانو جیسی نہیں ہوتی۔ خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر اعجاز نے اسے اپنانے کا فیصلہ کیا—میں آج ہی اعجاز کی والدہ کو اپنی رضامندی سے آگاہ کر دوں گی"—بیگم ایک عزم سے اٹھیں اور ہوا کے نرم جھونکے کی مانند باہر نکل گئیں۔ صولت نواب کا سر جھکا تو جھکا ہی رہ گیا غلاظت سے لتھڑی ہوئی دیوار ایک ایک اینٹ کر کے ان کی نظروں کے سامنے اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆

پچھتّر برس کی ایک لڑکی

گھر تھا کہ بھان متی کا پٹارہ—

اس گھر میں رہنے والے بھی بڑے عجیب لوگ تھے—ایک ساٹھ پینسٹھ سال کی خاتون تھیں—انہیں سب امّی کہتے تھے—ان کی—چُندھی چُندھی آنکھوں میں تنفّر کا رنگ بہت گہرا تھا—حالانکہ اس تنفّر کی وجہ کسی کو نہیں معلوم تھی۔ان کے ہونٹ سکوڑے ہوئے اور بالکل سیاہ تھے—وہ حقّہ اور بیڑی کثرت سی پیتی تھیں—ان کے سیاہی مائل ہونٹ اس قدر سکڑے رہتے تھے کہ ان کا دہانہ نظر نہیں آتا تھا— کبھی کبھی یہ دہانہ پورا کھل جاتا تھا۔اور اس کھلے ہوئے دہانے سے گالیاں آتش فشاں کے لاوے کی مانند اُبلتی تھیں کہ سننے والے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔جب گلی محلّے کے شریر لڑکے دوپہر کے سناٹے میں دیوار پر چڑھ کر کچّے پکّے امرودوں پر ہاتھ صاف کرتے۔یا شامت کا مارا کوئی بکری کا بچّہ گھر میں آجاتا—تو امّی کی گالیاں کھائے بغیر نہیں جاسکتا تھا—بلکہ ان سب کی سات پشتیں ان گالیوں کی لپیٹ میں آجاتی تھیں—

امّی کی دو بیٹیاں ان کے ساتھ رہتی—بڑی سلامت بیگم اور چھوٹی جوہی بیگم تھیں—سلامت بیگم کا نام سن کر لگتا تھا کہ بڑی منّتوں مرادوں والی ہوں گی—پلوٹھی کی لڑکی ان سے پہلے ہی دنیا میں آچکی تھی—ان کی دفعہ دادا—اور دادی کو پوتا ہونے کا یقین تھا—اور انہوں نے ہونے والے پوتے کا نام سلامت مرزا تجویز کیا تھا۔جب مرزا کے بجائے، مرزئی، آگئی تو ناچار اس کا نام سلامت بیگم رکھا گیا—دادا—اور دادی تو پوتے کا

ارمان لئے قبر میں جا سوئے۔ کیونکہ امّی کے اوپر تلے چار لڑکیاں ہوئیں پھر میاں کا بھی انتقال ہوگیا— اور سارا قصّہ ہی ختم ہوگیا— سلامت بیگم نے بھی اپنے نام کی لاج رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی— ان کے ہاتھوں دوسروں کی سلامتی البتہ خطرے میں پڑ جاتی تھی— جوہی بیگم بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ اور سر سے پاؤں تک اپنے نام کی تفسیر تھیں— جوہی کی ڈالی جیسا سراپا۔ چمپا اور چمیلی کے پھولوں جیسا رنگ، موزوں، مناسب ناک نقشہ اور سب سے بڑھ کر ان کے حُسن کو دو بالا کرنے والے لمبے اور گھنے بال۔ ان کے خوبصورت بالوں کی چوٹی کمر سے نیچے تک آتی تھی— ان کا مزاج نرم اور زبان میں شہد کی سی مٹھاس تھی۔ کچھ تو وہ خود ہی اچھی فطرت کی مالک تھیں۔ ان کی شخصیت کو سنوارنے میں تعلیم کا بھی بڑا ہاتھ تھا— ان کی کسی بہن نے اسکول کا مُنہ نہیں دیکھا تھا— اپنے گھر میں وہ پہلی لڑکی تھیں— جو اسکول جاتی تھیں— کبھی کبھی سب سے بڑی بہن ماں بہنوں سے ملنے آجاتی تھیں— وہ کسی دور پرے کے محلّے میں بیاہی تھیں— انہیں اپنے پختہ گھر پر بڑا ناز تھا۔ ان کی بیٹیاں تقریباً جوہی بیگم کی ہم عمر تھیں جو اسکول اور کالج جاتی تھیں اور پردے کی قید سے آزاد تھیں۔ جبکہ اچھے اچھے گھروں کی لڑکیاں بھی اس زمانے میں پردہ چھوڑنے کی ہمّت نہیں کرتی تھیں۔ امّی اکثر نواسیوں کی بے پردگی اور فیشن پر لعن طعن کرتی تھیں۔ اس لئے وہ مہینوں۔ برسوں ننیھال کی شکل نہیں دیکھتی تھیں۔ امّی کا مختصر سا گھر دراصل ایک کشادہ مکان کا حصّہ تھا۔ صحن کے بیچ میں دیوار اٹھا کر اسے علیحدہ گھر کی شکل دے دی گئی تھی۔

آمدورفت کے لئے دیوار میں ایک کھڑکی تھی۔ جو ہر وقت کھُلی رہتی تھی۔ مکان کا دوسرا حصّہ نسبتاً کشادہ تھا۔ اس حصّے میں باجی اور دولہا بھائی رہتے تھے۔ یہ باجی کے والد کا مکان تھا۔ جو امّی کے چھوٹے بھائی تھے—

اس نے ہوش سنبھالا تو باجی کو تلے اوپر کے بچّوں میں مصروف دیکھا— باجی کی عمر زیادہ نہیں تھی— انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ ان کی شادی کم عمری میں ہی ہوگئی تھی— کیونکہ وہ کہیں سے اتنے بچوں کی ماں نہیں لگتی تھیں۔ ان کا رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا— مناسب ناک نقشہ اور موزوں قد و قامت کے ساتھ بلا کی جامہ زیب تھیں— مزاج کا دھیما پن ان کی

فطری شرافت اور نیکی کا غماز تھا— ان کی شخصیت کو نکھارنے میں اس مسکراہٹ کا بڑا ہاتھ تھا جو ہر وقت ان کے پتلے پتلے لبوں پر کھیلتی رہتی تھی— اس مسکراہٹ میں آسودگی کا عنصر اس لئے نہیں تھا کہ وہ مالی طور پر بہت مطمئن تھیں— یہ پُرکشش مسکراہٹ ان کی قناعت پسندی کی رہینِ منّت تھی۔ دولہا بھائی ایک کالج میں ٹیچر تھے— ان کا تعلّق گاؤں سے تھا۔ جہاں ان کا آبائی مکان تھا۔ ملازمت کی وجہ سے شہر میں رہائش اختیار کرنا پڑی تو ساس اور سُسر کے اصرار پر انہوں نے اپنی ضرورت کے مطابق سُسرال میں ہی پختہ کمرہ، برآمدہ، باورچی خانہ اور غُسل خانہ وغیرہ تعمیر کرالیا۔ مکان میں بجلی اور پانی کی سہولت بھی تھی۔ محلّے کے اور گھروں کے مقابلے میں باجی کا گھر بہت اچھا تھا—

جو ہی بیگم کی دیکھا دیکھی آس پڑوس کی لڑکیاں بھی انہیں باجی کہتی تھیں۔ اور ان کے شوہر کو دولہا بھائی کہہ کر مخاطب کرتی تھیں سب کی نقل میں وہ بھی انہیں باجی اور دولہا بھائی کہنے لگی— نہ کسی نے اسے ٹوکا اور نہ ہی اس نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ اس کا رشتہ ان سے کتنا گہرا ہے۔

باجی ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی تھیں ابھی چولہے پر ہانڈی چڑھائی— اور لپک کر برآمدے کے کچے فرش پر بچھی ہوئی دری پر احتیاط سے پھیلائے ہوئے لحاف میں ایک آدھ ڈورے کی لائین بھی ڈال آئیں— رات میں بچّوں کو سلانے کے بعد اُون اور سلائیاں لے کر بیٹھ گئیں— اور سوئٹر کا آدھا پلاّ بُن ڈالا— دن میں کام سے فرصت پا کر سِلائی مشین لے کر بیٹھ جاتیں— دولہا بھائی کی شیروانی اور قمیض کے علاوہ سارے کپڑے وہ خود سیتی تھیں۔ تکیہ غلافوں پر ڈی۔ ایم سی کی رنگین کڑھیوں سے خوبصورت بیل بُوٹے کاڑھتیں۔ جن کی جھالر کروشیا کی نازک بیل سے بنی ہوتی۔ گھر کا سارا کام وہ خود کرتی تھیں۔ چھوٹے بچّوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک لڑکی ملازم رہتی تھی۔ اوپر کے کام کے لئے پرانے خانساماں حیدر علی دونوں وقت آتے تھے— وہ برتن دھونے اور مصالحہ پیسنے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ ایک وقت کا کھانا اور دو روپئے ماہوار تنخواہ پر وہ کئی گھروں میں کام کرتے تھے— باجی سرِ شام کھانا تیار کر لیتی تھیں— حیدر علی سالن کا کٹورہ اور تین

چپاتیاں لے کر باورچی خانے سے باہر آتے اور اپنا خاصہ نوش کرنا شروع کر دیتے۔ اور سالن کی تعریف بھی کرتے جاتے۔ دروازے تک پہنچتے — پہنچتے ان کی دو چپاتیاں ضرور ختم ہو جاتی تھیں — اپنے زمانے میں وہ بہت نامی گرامی خانساماں تھے — آل اولاد کوئی تھی نہیں — وہ باجی سے بہت خوش رہتے تھے۔ کیونکہ وہ دولہا بھائی کے پرانے کپڑے ٹھیک کر کے ان کو دے دیتی تھیں۔ اور جاڑوں میں ان کے دبلے پتلے جسم پر دولہا بھائی کا ڈھیلا ڈھالا سوئیٹر اور کوٹ بھی نظر آتا تھا۔ عید پر باجی ان کا نیا جوڑا ضرور بناتی تھیں بیمار پڑتے تو دوا دارو کے لئے پیسے الگ سے دیتی تھیں۔ آخر ان کے دادا کے زمانے کے خانساماں جو تھے —

اسے باجی کے بچے ذرا بھی اچھے نہیں لگتے تھے — اسے ان کا باجی سے چمٹا رہنا بھی پسند نہیں تھا — باجی اگر اس سے بچوں کا کوئی چھوٹا موٹا کام کرنے کے لئے کہتیں تو وہ صاف ٹال جاتی تھی — اسے گھر بھر میں صرف دولہا بھائی اچھے لگتے تھے — باجی بھی بُری نہیں لگتی تھیں — لیکن دولہا بھائی کی بات دوسری تھی — ان کا اونچا قد — بھرا بھرا جسم، گندمی رنگت، تیکھی ناک، ذہین آنکھیں، ان کی قابلیت کل ملا کر وہ بے حد باوقار لگتے تھے — ان کا لباس بے حد سادہ ہوتا تھا — گرمی میں باہر جاتے تو سفید برکا پاجامہ، قمیض، اور سوتی شیروانی اور ٹوپی پہنتے تھے — گھر میں رہتے تو تنزیب کا سفید کرتا اور پاجامہ استعمال کرتے تھے — جاڑوں میں گرم شیروانی اور ٹوپی کے علاوہ باجی کے ہاتھ کا بُنا ہوا بغیر آسین کا سوئیٹر بھی پہنتے تھے — شوز ہمیشہ براؤن پہنتے تھے — کالے شوز کبھی نہیں پہنتے تھے — کیونکہ ان کی والدہ نے سختی سے منع کر رکھا تھا — دولہا بھائی اپنی والدہ کا کوئی حکم نہیں ٹالتے تھے — ان کا کالج گھر سے بہت دور تھا — اُن دنوں صرف یکّے اور تانگے چلتے تھے۔ وہ ایک آنہ دے کر یکّے یا تانگے پر بیٹھ کر گول چوراہے تک جاتے تھے — وہاں سے دوسرے تانگے پر بیٹھ کر قیصر باغ کے چوراہے پر اتر جاتے۔ تانگے والا فی سواری کے حساب سے کرایہ لیتا تھا۔ اور کئی سواریاں بٹھاتا تھا — اس کو بھی اچھی اُجرت مل جاتی تھی — اور سواریاں بھی کم پیسوں میں اپنی منزل پر پہنچ جاتی تھیں — قیصر باغ کے

چوراہے سے دولہا بھائی کا کالج بہت قریب تھا— کچھ عرصے کے بعد سرکاری بسیں چلنے لگیں تو تھوڑی آسانی ہوگئی— دولہا بھائی کی تنخواہ زیادہ نہیں تھی۔ دادی فصل پر دالیں، چاول، دیسی گھی اور گڑ کی بھیلی بھجواتی تھیں۔ آم کی فصل ہوتی تو اسکول اور کالج میں گرمیوں کی تعطیل بھی ہوتی تھی— سب لوگ جی بھر کے آم کھاتے تھے— دولہا بھائی نے ماں سے کبھی آموں کی فصل کا حساب کتاب نہیں لیا تھا— اور نہ ہی ان کے کسی معاملے میں دخل دیا— زمینداروں میں بیٹی کو زمین جائداد میں حصہ دینے کا رواج نہیں تھا۔ تاکہ زمینداری تقسیم در تقسیم سے محفوظ ہے دولہا بھائی کے والد نے گاؤں میں کئی مکانات بنوائے— باغات لگوائے، کاشت کے لئے زمینیں خریدیں، بیوی کی محبت میں انہوں نے سسرال کو اپنا وطن بنالیا— لیکن سسرال کے ایک پیسے کا احسان نہیں لیا۔ سب کچھ اپنی آمدنی سے بنایا— اور اپنی چہیتی بیوی کو زمیندارنی بنا دیا— انہیں خود زمینوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا— کیونکہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے— اور نامی گرامی کالجوں میں پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے تھے۔

دولہا بھائی اپنے بچّوں کی تعلیم میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ اس کی پڑھائی پر کچھ زیادہ ہی دھیان دیتے تھے— شاید اس لئے کہ وہ سب سے بڑی تھی— دوستوں سے گفتگو کے دوران بار بار دولہا بھائی کا ذکر آتا تھا— ایک دن اس کی دوست نے چڑ کر کہا—

"تمہارے دولہا بھائی ہر بات میں اتنا دخل کیوں دیتے ہیں—؟"

میرے دولہا بھائی تو کبھی کچھ نہیں کہتے"—

"کیونکہ وہ میرے ابا ہیں—" اس نے بڑے فخر سے کہا—

"ہیں"؟— دوست کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا—

"ہاں— وہ میرے ابا ہیں— اور باجی میری اماں ہیں"—

"تم انہیں اماں اور ابا کیوں نہیں کہتیں—؟"—

"بس بچپن سے عادت پڑ گئی— جو ہی خالہ کی وجہ—"

"تو اب کہا کرو—" دوست نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا—

"شرم آتی ہے"— اس کا سر جھک گیا

''اماں کو باجی اور ابا کو دولہا بھائی کہتے شرم نہیں آتی؟''

اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اس نے جو ہی خالہ کو ٹھیلے پر اسکول جاتے دیکھا تھا— اب ویسے ہی ٹھیلے پر وہ بھی اسکول جاتی تھی— لکڑی کا ڈبے نما ٹھیلا— جس کے تین طرف نمک پارے کے ڈیزائن کی لوہے کی جالی لگی تھی— اور جالی میں اندر کی طرف نیلے رنگ کے موٹے پردے پڑے تھے— اگلے حصے میں یکّے اور تانگے کی طرح دو مضبوط لکڑیاں لگی تھیں— جنہیں بم کہتے تھے— اور بھینسا گاڑیوں کی طرح ان لکڑیوں کے دونوں سروں پر موٹی سی رسّی باندھی جاتی تھی۔ جس کو ایک کہار اپنے سینے کے سہارے زور لگا کر کھینچتا تھا— اور دو کہار پیچھے سے ٹھیلے کو دھکا دیتے تھے— بالکل جانوروں کی طرح ٹھیلے میں جُتے ہوئے کہار ٹھیلا کھینچتے ہوئے اسکول تک لڑکیوں کو پہنچاتے تھے— یہ کہار اتنے چوکس رہتے تھے— کہ کیا مجال ہے کہ لڑکیاں پردہ ہٹا کر باہر جھانک لیں— لڑکیاں بھی ان سے ڈرتی تھیں— پھر ایک دن ٹھیلے کا یہ تکلیف دہ سفر ختم ہو گیا۔ کالج میں تین نئی بسیں آ گئیں۔ لیکن بسوں میں بھی پردے کا اہتمام بدستور تھا۔ البتہ جن محلّوں میں بسیں نہیں جا سکتی تھیں۔ وہاں اب بھی ٹھیلے جاتے تھے۔ یا پھر لڑکیاں گھر سے بُرقعہ اوڑھ کر گلیاں عبور کر کے سڑک تک آتی تھیں۔ اور بس میں بیٹھ جاتی تھیں— زمانہ تھوڑا بدلا تھا اور ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے زندگی کی گھٹن کو کم کر رہے تھے—

وہ تیسرے کلاس میں تھی— دولہا بھائی نے ایک دن باجی سے کہا—

''کل شام کو اپنی بیٹی کو تیار کر دینا۔ مسٹر جانسن نے بلایا ہے''۔

باجی نے حیرت سے پوچھا—

''کیوں بلایا ہے؟''—

''انہیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میری بیٹی اسکول جاتی ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی لڑکیاں نہیں پڑھتیں''—

دولہا بھائی نے بڑے فخر سے کہا۔ وہ مسٹر جانسن کو اردو پڑھاتے تھے— مسٹر

جانسن ملٹری اسپتال میں ڈاکٹر تھے۔اور نسلاً عیسائی تھے۔

باجی نے اسے ایک خوبصورت فراک پہنائی۔ بالوں میں سُرخ ربن لگائے۔ شُوز کو پالش سے چمکایا۔ نئے موزے پہنائے — محلّے کے تانگے والے جلائی سے صدر تک آنے جانے کا کرایہ دو روپے طے ہوا — وہ خوش خوش تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی دولہا بھائی پچھلی سیٹ پر بیٹھے — اور جلائی نے پائے دان کے اوپر والا حصّہ سنبھالا — اور بسمہ اللہ کہہ کر گھوڑے کو چابک ماری — گھوڑا کیا چھوٹی سی گھوڑی تھی — لیکن بلا کی پھرتیلی تھی — پہلی بار اسے تانگے کی سواری کا مزہ ملا تھا۔گھر والوں کے ساتھ تو کئی بار بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔لیکن اس طرح کہ تانگے میں پردہ بندھا تھا۔اور باہر کا نظارہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا —

بنگلے کے گیٹ کے اندر تانگہ داخل ہوا۔ اور سُرخ بجری والی سڑک عبور کر کے سیدھا پورٹیکو میں رکا۔میاں جلائی کی گھوڑی ایسا سرپٹ دوڑی تھی کہ لگتا تھا کہ ہوا سے باتیں کر رہی ہے۔ایک ملازم نے انہیں لے جا کر بیٹھک میں بٹھایا۔اور مسز جانسن کو ان کی آمد کی اطلاع دینے چلا گیا۔وہ بڑی حیرت سے بیٹھک کی ایک ایک چیز دیکھ رہی تھی۔ گدّے دار کاؤچ اور چینی کے گل دان، جن میں تازہ پھولوں کے گلدستے سجے تھے — خوبصورت پردے، آتشدان پر سجی ہوئی تصویریں، دیواروں پر لگی ہوئی پینٹنگز، ایک گوشے میں پیانو رکھا تھا۔اور کارنر پر پیتل کے شمعدان میں موم بتیاں لگی تھیں۔ایک دیوار میں عیسیٰ مسیح اور حضرت مریم کی تصویریں آویزاں تھیں۔اسے خاص طور پر وہ تصویر پسند آئی جس میں حضرت مریم ننھے مسیح کو گود میں لئے تھیں۔اور نُور کا ہالہ ان کی عظمت میں چار چاند لگا رہا تھا۔

پھولدار پردہ ہٹا کر مسز جانسن اندر آئیں۔ دولہا بھائی نے کھڑے ہو کر انہیں تعظیم دی — ان کی تقلید میں وہ بھی کھڑی ہو گئی اور ''گڈ ایوننگ'' کہا — مسز جانسن نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کا بازو تھام کر اپنے پاس بٹھا لیا — دولہا بھائی سے کہا —

''ماسٹر صاحب! آپ کی بچّی تو بہت پیاری ہے'' —

جواباً وہ مسکرائے اور 'تھینک یو' کہا — مسز جانسن بہت پیار سے اس سے باتیں

کرتی رہیں — اس کی پڑھائی کے بارے میں پوچھا اس کو کون سا کھیل پسند ہے۔ چھوٹے چھوٹے عام سے سوالات اسے وہ بہت اچھی لگیں۔ خاص طور سے ان کا لباس جو ہلکے رنگ کی ساڑی اور بلاؤز پر مشتمل تھا۔ بالوں کا جوڑا بندھا تھا۔ جبکہ اس کے اسکول کی کرسچین ٹیچریں اسکرٹ بلاؤز اور فراک پہنتی تھیں۔ اور ان کے بال کٹے ہوئے تھے —

باوردی بیرا ناشتے کی ٹرالی لے کر آیا — مسز جانسن نے ان کے لئے خود کافی بنائی، اور کیک پیسٹری سے ان کی تواضع کی دولہا بھائی نے جانے کی اجازت مانگی تو مسز جانسن نے گھنٹی بجائی۔ وہی بیرہ ایک خوبصورت سا پیکٹ لے کر آیا۔ انہوں نے وہ پیکٹ اسے تھما دیا — مسکرا کر کہا —

"یہ گفٹ تمہارے لئے ہے" —

اس نے دولہا بھائی کو دیکھا — انہوں نے سر ہلا کر گویا اسے اجازت دی اور اس نے 'تھینک یو' کہہ کر پیکٹ لے لیا۔ مسز جانسن انہیں باہر تک چھوڑنے آئیں — راستے بھر وہ پیکٹ سنبھالے رہی گلابی ربن میں بندھا ہوا ڈبہ کھولنے کے لئے اس کا دل مچل رہا تھا — گھر پہنچ کر اس نے باجی کو وہ پیکٹ دے دیا — اس میں ڈھیر ساری چاکلیٹ اور ٹافیاں تھیں — دولہا بھائی بتا رہے تھے کہ مسز جانسن کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ تو اسے یہ جان کر بہت دُکھ ہوا وہ چوتھی کلاس میں تھی جب ایک دن خبر ملی کہ ہندوستان آزاد ہو گیا ہے۔ یوں تو آئے دن ملک کی آزادی کی باتیں سُننے میں آتی تھیں — انگریزوں کے خلاف ملک بھر میں جلسے، جلوس، تقریریں، اور کہیں کہیں سے لڑائی جھگڑے کی خبریں آتی رہی تھیں۔ بار بار گاندھی جی اور نہرو جی وغیرہ کے نام اور کام کا تذکرہ ہوتا تھا۔ انگریزوں کی غلامی سے ملک کا آزاد ہونا تو خوشی کی بات تھی لیکن جو خون خرابا ہوا — وہ بہت تکلیف دہ تھا — پھر ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے اور ایک نیا ملک پاکستان وجود میں آ گیا مسلمان بڑے جوش و خروش سے پاکستان جا رہے تھے — اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جب انگریز چلے گئے۔ ملک آزاد ہو گیا۔ تو پاکستان بننے کی کیا ضرورت تھی — اور مسلمان اپنا گھر بار چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں؟۔ یہ تو اچھا ہوا کہ دولہا بھائی نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ خود اس کے کتنے عزیز

اور رشتے دار چلے گئے تھے۔ وہ ان کے فیصلے سے بہت خوش تھی۔ کیونکہ اپنا گھر اور اپنا اسکول چھوڑ کر وہ کہیں نہیں جانا چاہتی تھی — آزادی کی خوشی میں اسے بھی انعام ملا۔ چوتھے کلاس کو پرموشن دے کر ایک دم سے چھٹے کلاس میں چڑھا دیا گیا۔ پڑھائی شروع ہوئی تو پہلا جھٹکا اس وقت لگا جب یہ پتہ چلا کہ ان کے کورس سے اردو ختم کر کے اس کی جگہ ابتدائی ہندی کی کتاب پڑھائی جائے گی۔ چلو ہندی پڑھنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے — لیکن اردو کیوں ختم کی گئی۔ اس نے بیک ریڈر کی چوتھی کتاب کورس میں پڑھی تھی — یہ دوسری بات تھی کہ گھر پر مولوی صاحب نے کلام پاک کے ساتھ اسمٰعیل میرٹھی کی کئی کتابیں اسے پڑھائی تھیں — لیکن اسکول کی پڑھائی — تختی کو ملتانی مٹّی سے پوت کر — کلک کے قلم کو سیاہ داوات (روشنائی) میں ڈبو کر اردو لکھنے کا الگ ہی مزہ تھا۔ اسے اردو ختم ہونے کا بہت صدمہ تھا —

گرمی کی چھٹیوں میں وہ لوگ ہر سال گاؤں جاتے تھے — گاؤں جانے کی خوشی کی دو وجوہات تھیں — ایک تو اپنے باغوں کے آم جی بھر کے کھانے کو ملتے تھے۔ دوسری دلچسپی دادا مرحوم کے کتب خانہ سے تھی۔ جو رہائشی کان سے ملحق ایک وسیع بنگلے میں تھا — جس میں ہزاروں کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا — وہ دولہا بھائی کے ساتھ مل کر کتابوں کی جھاڑ پونچھ کرتی۔ انہیں ترتیب سے شیلف اور الماریوں میں لگاتی — اور اپنے مطلب کی کتابیں تلاش کر کے پڑھنے کے لئے لاتی۔ گرمی کی طویل دوپہریں۔ نیم روشن بروٹھے میں کھرّی چارپائی پر لیٹ کر کتابیں پڑھنے میں گزرتیں اس نے دادا مرحوم کے کتب خانہ سے چُن چُن کر داستانیں قصّے اور کہانیاں پڑھیں — پھر اصلاحی ناولوں کی باری آئی جس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس کی اردو کی قابلیت میں اضافہ ہوا — نویں کلاس میں پہنچی تو لائبریری کا کارڈ پا کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ اب اسے سال بھر تک گاؤں جانے کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ بڑی آسانی سے اپنی پسندیدہ کتابیں پڑھ سکتی تھی۔ اس نے اختیاری مضمون کی حیثیت سے اردو لی تھی۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اسے لکھنے کا شوق بھی تھا۔ گھر میں کسی کو اس کے شوق کا علم نہیں تھا۔ اس نے بھی کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا — لیکن وہ زیادہ دن اپنے شوق کو نہ دبا

سکی — اس نے بڑی محنت سے ایک کہانی لکھی۔

اور کہانی لے کر پڑوس میں اجمل بھائی کے پاس پہنچ گئی — وہ ایک مقامی اخبار میں کاتب تھے — اور خود بھی شاعر تھے — اجمل بھائی اپنی مخصوص چوکی پر بیٹھے تھے — ان کے زانوؤں پر لکڑی کا تختہ رکھا تھا۔ جس پر زرد رنگ کا سیاہ لائنوں والا کاغذ کلپ کی مدد سے لگا تھا اور وہ کلک کے قلم کو سیاہ دادات (روشنائی) میں ڈبو کر بڑے الہماک سے کسی مضمون کی کتابت کر رہے تھے۔ اس نے جاتے ہی بم داغا —

"اجمل بھائی میں نے کہانی لکھی ہے" —

"ہیں؟" — وہ اچھل پڑے اور قلم ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر الگ جا گرا — غنیمت یہ ہوا کہ مضمون بچ گیا —

"کیا کہا؟" — انہیں شاید اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا —

"میں نے کہانی لکھی ہے آپ اسے اپنے اخبار میں چھپوا دیجئے" — اس نے کہانی کے اوراق ان کی طرف بڑھا دیئے۔ انہوں نے بادل نخواستہ کاغذ تھامے اُلٹ پُلٹ کر بے یقینی سے پوچھا —

"یہ تم نے لکھی ہے؟" اسے ہنسی آ گئی — بڑے فخر سے اترا کر بولی —

"ہاں میں نے لکھی ہے" —

اجمل بھائی نے کہانی پڑھ ڈالی — پھر کہا —

"یہ بتاؤ کہ تم نے کہانی بڑوں کے لئے لکھی ہے — یا بچوں کے لئے؟" —

"کیا مطلب؟" — وہ بھنا ہی تو گئی۔

"بھئی تم نے بڑی محنت سے پڑھنے والوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں حال کھلتا ہے کہ جسے ہیروئن بنا کر پیش کیا گیا وہ دراصل ایک بلی ہے۔ یعنی وہ کون تھی" —

اسے بڑا غصہ آیا — تنک کر کہا —

واہ! یہ ہی تو اس کہانی کی خوبی ہے کہ آخر تک سسپنس بنا رہتا ہے" —

''واہ— کیا کہنا آپ کی خوبی کا— تم ایسا کرو کہ فی الحال بچّوں کے لئے کہانیاں لکھو۔ ابھی تم ذہنی طور پر بالغ نہیں ہوئی ہو—'' اجمل بھائی نے فیصلہ سنا دیا—

پہلے یہ کہانی چھپوایئے— پھر کچھ اور لکھوں گی''—

اس نے بھی ہٹ دھرمی سے کہا— اجمل بھائی نے کہانی رکھ لی۔ کہانی چھپ گئی۔ اپنا نام اخبار کے صفحے پر چھپا دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی— اس نے بھی اپنا وعدہ نبھایا۔ بچّوں کے لئے کہانیاں لکھیں— ''خواتین کا گوشہ'' کے لئے ہوم سائنس کی کاپی کے سارے نوٹس تھوڑے ردّ و بدل کے بعد بطور مضمون اپنے نام سے چھپوا دیئے— پھر ایک افسانہ لکھا— اور فرضی نام سے ایک مشہور رسالے کو بھیج دیا۔ ایڈریس بھی اجمل بھائی کا دے دیا۔ ان کی اجازت سے— افسانہ شائع ہو گیا— رسالہ بھی آ گیا— اور وہ با قاعدہ افسانہ نگار بن گئی۔ یہ اس کا اپنا خیال تھا۔ پھر یہ سلسلہ با قاعدگی سے چل نکلا۔ مختلف رسائل میں مختلف ناموں سے افسانے شائع ہونے لگے— ایڈیٹروں کے تعریفی خطوط کے ساتھ افسانوں کی فرمائش ہونے لگی۔ ایک دن اجمل بھائی کا چھوٹا بیٹا ایک پوسٹ کارڈ لے کر آیا— دولہا بھائی سامنے ہی بیٹھے تھے— اس نے پوسٹ کارڈ ان کی طرف بڑھا کر کہا— ''بجّو کا تھت (خط) اور خط انہیں تھما کر بھاگ گیا اس کے دیوتا کوچ کر گئے۔ انہوں نے خط کی سطروں پر سرسری نظر ڈالی۔ اس سے پوچھا—

''یہ نازنین شگفتہ کون ہیں؟''—

''وہ— وہ اجمل بھائی کی سالی ہیں نا تارا باجی! وہ اس نام سے کہانیاں لکھتی ہیں''—

اس نے ہکلا کر بتایا۔ دولہا بھائی نے پوسٹ کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کی جان میں جان آئی— پوسٹ کارڈ لے کر سیدھی اجمل بھائی کے گھر پہنچ گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ حرکت خود تارا باجی کی تھی—

ہائی اسکول کا رزلٹ آیا تو وہ سکنڈ ڈویزن پاس ہو گئی تھی۔ مارے خوشی کے وہ باجی سے لپٹ گئی—

''امّاں! میں پاس ہوگئی''—

پہلی بار انہوں نے اس کے منہ سے امّاں کا لفظ سنا تھا سُن کر وہ ایسا شرمائیں جیسے پہلی بار 'ماں' بنی ہوں— اسے محسوس ہوا کہ اس لفظ میں کیسی اپنائیت— کیسی حلاوت اور کتنا پیار ہے— پھر وہ دولہا بھائی کو بھی ابّا کہنے لگی۔ وہ تو تھے ہی ابّا۔ انہوں نے کسی ردِّ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ ایک فرق اور آیا— وہ اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں سے بھی پیار کرنے لگی— پیار تو وہ پہلے بھی کرتی تھی۔ بس اظہار نہیں کرتی تھی— کل تک وہ باجی کے بچّے تھے۔ اب وہ اس کی اماں کے بچّے تھے۔ اگر وہ کسی سے کہتی تو اس کا خوب مذاق بنتا—

'مارک شیٹ' ملی۔ تو اسے یہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ اسے اردو میں امتیازی نمبر ملے تھے۔ اسے چند نمبروں سے اپنا فرسٹ کلاس کھونے کا ذرا بھی غم نہ تھا۔ ابّا نے اس کے نمبر دیکھ کر کہا—

''یقیناً ممتحن صاحب کی تمہاری جیسی کوئی لڑکی ہوگی— جس نے امتیازی نمبر دینے کی سفارش کی ہوگی— ورنہ لٹریچر میں اتنے نمبر کہاں ملتے ہیں''—

اس نے ابّا کے ریمارک کا بُرا نہیں مانا— دراصل ابّا کو ہر سال ہائی اسکول اور انٹر میجیٹ بورڈ کی اردو کی کاپیاں جانچنے کے لئے ملتی تھیں۔ اور وہ ان کے پاس بیٹھ جاتی تھی— اور فیل ہونے والے طلباء کے نمبر ضِد کر کے بڑھواتی تھی— کئی بار اس نے سوالوں کے جوابات تک ابّا سے چھپا کر لکھے تھے— اسے اکثر ابّا کی ڈانٹ بھی کھانا پڑتی تھی لیکن اسے سب کچھ گوارا تھا—

ہائی اسکول کے بعد اس کی شادی ہوگئی۔ یہ ایک ایسا المیہ تھا جسے وہ تمام زندگی فراموش نہ کر سکی— اب وہ اپنے نام سے افسانے لکھنے لگی تھی۔ اس کا پہلا ناول شائع ہوا تو اس نے اس کا انتساب ابّا کے نام کیا— ابّا بہت خوش ہوئے۔ اور پہلی بار انہیں پتہ چلا کہ ان کی بیٹی، ادیب، بن گئی ہے۔ اس کا دوسرا ناول شائع ہوا تو اس کا انتساب بھی ابّا کے نام تھا۔ لیکن اس بار ان کے نام کے آگے مرحوم لکھا تھا— اس دن وہ بہت روئی تھی— بھائی بہن زیرِ تعلیم تھے۔ اس سے چھوٹا بھائی نیا نیا ملازمت میں آیا تھا— وہ ماں کا سہارا بن گیا—

چھوٹے بھائی بہنوں کو باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی — ان کی پرورش تعلیم — شادی بیاہ — ساری ذمے داریاں اس نے بھائی نہیں، باپ بن کر نبھائیں — وہ کسی کے لئے کچھ نہ کر سکی۔ اپنی مجبوری پر کُڑھنے کے سوا وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔

خاتمہ زمینداری نے گاؤں کی زمین تو پہلے ہی ہڑپ کر لی تھیں۔ کچھ سیر کی زمین ہی بچ گئی تھی۔ جو بٹائی پر دے دی گئی تھی۔ جب کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو نقصان ہی ہاتھ آتا ہے۔ باغوں کی برائے نام سالانہ آمدنی رہ گئی تھی۔ کیونکہ اب باغ بھی چوتھی حصے پر دے دیئے گئے تھے — یعنی روپے میں تین حصے رکھوالی کرنے والے کے اور چار آنے مالک کے —

چھوٹے بھائی نے شادی نہیں کی۔ اس کی قربانیاں بے مثال تھیں — اس کے خمیر میں باپ دادا کا اثر بدرجۂ اتم موجود تھا۔ جن ہاتھوں میں قلم ہونا چاہئے تھا۔ ان میں اوزار تھامنا پڑے تاہم اس تضاد کے باوجود فطری میلان نے اس کی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا — اور بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی — شاعری ہو یا ناول — ترجمہ ہو یا تنقید — مضمون ہو یا تبصرہ اس کے قلم نے اپنا لوہا منوالیا۔ اور وہ جو اس کی صلاحیتوں کی قائل تھی — اپنی دعائیں اس کے نام کر کے خوش تھی۔

زندگی کی پُر خار راہیں طے کرتے ہوئے وہ بہت دور نکل گئی تھی — اس نے اپنے جسم کا سارا خونِ نچوڑ کر اس کی روشنائی بنائی اور اپنی انگلیوں کو اس روشنائی میں ڈبو کر صفحۂ قرطاس پر کچھ نشان ثبت کر دیئے۔ دنیا والوں نے اسے کبھی افسانہ کہا — کبھی ناول مُلک و بیرون ملک اس کے افسانے اور ناولیں شائع ہوتی رہیں۔ انعامات اور اعزازات اس کی جھولی میں جمع ہوتے رہے۔ لیکن اس کی تشنگی برقرار رہی — ایسا نہیں تھا کہ اسے شہرت کی ہوس تھی — بس ایک خلش تھی کہ اس نے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا تھا۔ جو اس کی شناخت بنتا لکھنا اس کا شوق تھا — سو وہ لکھتی رہی — حالات، حادثات اور دکھوں کی چکّی میں پستے ہوئے اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا۔ لیکن اس نے پرواہ نہیں کی۔ پانے سے زیادہ کھونے کا سودا کیا۔ تب بھی اس نے شکوہ نہیں کیا۔ کیونکہ سود و زیاں کا حساب کتاب کرنا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ وہ سدا سے حساب میں کمزور تھی۔ سو سارا حساب کتاب لا حاصل

تھا۔ اس کے لئے بس اتنا کافی تھا کہ کچھ لوگ اسے 'جانتے' ہیں۔ ساری دیتا سے اپنا آپ منوانا ہو تو اس کے لئے اپنے لہو کا چراغ جلانا پڑتا ہے۔ وہ تو پہلے ہی اپنے سارے لہو کی روشنائی بنا کر صفحات پر انڈیل چکی تھی — اب اس کے پاس اپنا کہنے کے لئے کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ زندگی کا کشکول تو کب کا خالی ہو چکا تھا۔

ماضی کے گلیاروں میں بھٹکتی ہوئی پچھتر برس کی ایک لڑکی نے جب اپنے وجود کے بچے کھچے ریزوں کو جمع کیا تو ایک مُشتِ خاک کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا یہ وہی مُشتِ خاک تھی۔ جس سے اس کا وجود تخلیق ہوا تھا۔ اور اب خاک — خاک سے ملنے کے انتظار میں تھی — کہ ہر ذی رُوح کا انجام فنا ہے۔ باقی رہنے والی ذات تو بس ایک ہی ہے۔ وہ جو سب کا رب ہے رب العالمین اور صرف رب العالمین —

☆☆

بند گلی کا آخری مکان

نخاس کی تنگ اور اندھیری گلی یکا یک تیز دُودھیا روشنی سے نہا گئی۔ پھر ایک ایک کر کے پچاسوں گیس کے ہنڈے سڑک پر آتے گئے۔ اور ہنڈے اٹھانے والے خستہ حال مزدور ہرے رنگ کی کفنیوں اور سیاہ چُست پاجاموں میں ملبوس — سڑک کے دو رویہ ترتیب سے قطار بنا کر کھڑے ہوتے گئے۔ اور ان کے بعد نو دس لڑکوں کا ایک مختصر سا جلوس گلی سے برآمد ہوا۔ لڑکے علم مبارک کے گرد حلقہ بنائے نوحہ خوانی کر رہے تھے۔ علم کا نقرئی پنجہ بجلی کے کھمبوں کے برابر بلند تھا۔ جھل جھل کرتا کارچوبی پٹکا پھولوں کے خوبصورت سہرے سے اس طرح سجا ہوا تھا کہ پھولوں کی لڑیاں زمین سے بس ایک آدھ فٹ ہی اونچی تھیں۔ پھر یہ جلوس عوام کی چہل پہل سے آنکھیں چُرائے۔ ان کی بے حسی پر گریہ کناں آگے بڑھ گیا۔ اس کے عقب میں وہ تنگ گلی پھر سنسان اور تاریک ہوگئی — اور پھر بند گلی کا وہ آخری مکان بھی اندھیروں اور سناٹوں میں ڈوب گیا۔ جس کے ایک کمرے میں فرزانہ بیٹھی — سسک سسک کر رو رہی تھی۔ اور اس کے قریب بیٹھے ہوئے دو کم عمر اور بھولے بھالے بچے حیرت سے اس کو روتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

یہ اس گھر سے نکلنے والا محرّم کا آخری جلوس تھا — اور فرزانہ آخری نوحہ خواں —

گلی کے آخری سرے پر بنا ہوا یہ عالی شان مکان کبھی بے حد مشہور اور مقبول تھا۔ امیروں اور رئیسوں کی پالکیاں — اور ہوادار دن کے اُجالوں اور رات کی تاریکیوں میں پورے کرّ و فر سے آکر دروازے پر لگتے تھے۔ اور امراء و رؤساء پوری آن و بان سے مخملیں

مسندوں اور ایران قالینوں پر جلوہ افروز ہوتے۔ ان کی اطلس اور ذربفت کی شیروانیوں میں سونے کے جراؤ بٹن جگمگاتے — بڑی سی جیبی گھڑی کی طلائی زنجیر بٹن سے ٹنگ کے سہارے لٹکتی ہوتی۔ انگلیوں میں قیمتی پتھروں والی۔ انگوٹھیاں اور آرسیاں ان کی شان اور امارت کے قصیدے سناتیں طلائی یا نقرئی مُوٹھ والی سُبک سی چھڑی سہارے کے لئے نہیں۔ زیبائش کے لئے بھاری پنجے میں دبی رہتی۔ بنارسی صافوں اور ترچھی ٹوپیوں سے سجے ہوئے پُرنخوت سروں کی ایک ہلکی سی جنبش پر دل افروز کے سامنے روپیوں کے ڈھیر لگ جاتے اور اس کی زمانہ شناس ماں ترچھی نظروں سے روپیسوں کے ڈھیر کو آنک کر ایک آسودہ سی سانس لے کر مسکرانے لگتی — کہ جاتی بہاروں کی خزاں آلود شامیں اور اُجاڑ دن بھی کچھ ایسے بُرے نہیں تھے۔ ہاتھی لاکھ لٹے۔ پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا تو ہوتا ہی ہے۔ ریاستیں ختم ہوئیں۔ رئیسی ٹھاٹ باٹ بھی بیتے دنوں کا قِصّہ بن گئے۔ لیکن رئیسی مزاج اور طنطنہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ اور اس کے گھر آنے والے اپنی وضع داری پر کوئی آنچ نہیں آنے دیتے تھے۔

اس مکان میں دل افروز کی وہی حیثیت تھی جو انگوٹھی میں جڑے ہوئے نگینوں کے درمیان جگمگاتے ہوئے قیمتی پتھر کی ہوتی ہے — بے حد خوبصورت — بے حد قیمتی اور بے حد نمایاں دل افروز کو خدا نے حُسنِ صورت کے ساتھ حُسنِ سیرت سے بھی نوازا تھا — نفاست، شائستگی اور ذہانت کا یہ جیتا جاگتا مجسّمہ جب محفل میں فتنے جگاتا تو اچھے اچھوں کے ہوش اڑ جاتے، فنِ رقص میں وہ استاد بندے علی خاں اور موسیقی میں بنّے میاں کی شاگرد تھی استادوں کا کلام جب اس کے نورانی گلے سے سُر اور آواز کا سنگم بن کر نکلتا — تو غزل کے معنی اور مفہوم ہی بدل جاتے دادرا۔ ٹھمری، گجری، گیت اور بھجن اس کی پُرسوز آواز میں فن کی بلندیوں کو چھو لیتے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے تھے کہ وہ کسی بڑے رئیس کی اولاد ہے۔ لیکن فقیر کے کشکول اور رنڈی کی کوکھ کا بھلا کیا پتہ؟ — سو وہ بھی بس اپنی ماں کی بیٹی تھی — ویسے راجہ چمن پور دل افروز کو اولاد ہی کی طرح چاہتے تھے — اس کی ماں راجہ صاحب کی باقاعدہ ملازم تھی۔ اور وہ لوگ مہینوں ان کے علاقے پر گزارتے تھے — راجہ صاحب نے دینا چھوڑی تو دل افروز جوان ہو چکی تھی۔ سچ ہے — اللہ ایک در بند کرتا

ہے تو سود رکھولتا ہے — دل افروز کے ذریعے آنے والی دولت راجہ صاحب کی نوازشوں سے دس گنا زیادہ تھی — شاید اس کا سبب دل افروز کا وہ رکھ رکھاؤ بھی تھا جو امیروں اور رئیسوں کو ایک خاص فاصلے پر رکھتا تھا — وہ عام طور پر سے محفلوں میں ناچتی گاتی بھی نہیں تھی — آنے والے خود ہی اس کی محفل کو رونق بخشتے تھے — اور جیبیں خالی کر کے چلے جاتے —

اس نگوڑے دل کے آنے کے بھی ڈھنگ نرالے ہوتے ہیں دل افروز بھی ماں کے سکھائے سارے سبق اور گُر بھول کر ایک مُفلس ٹیچر کو دل دے بیٹھی جو اسے اردو، فارسی پڑھانے آتا تھا میرؔ و غالبؔ، سعدیؔ اور شیرازیؔ کا کلام دل افروز کے قلب و ذہن پر سحر بن کر چھا گیا — اور ٹیچر وہ جادوگر ثابت ہوا جس نے اس کو اس کی ساری اداؤں اور عنایتوں سمیت اپنے دل میں قید کر لیا۔

اس گھاٹے کے سودے میں دل افروز کو اپنے عاشق، بلکہ معشوق سے بس یہی تحفہ ملا تھا۔ ننھی منّی گڑیا جیسی بیٹی فرزانہ — اور اس کی ماں نے بھی اپنی خفگی بھول کر شاہ مینا صاحب کے مزار پر چادر چڑھائی کہ بیٹی کی آمد سے کچھ تو آئندہ کا سہارا ہوا — ورنہ اس قلاشؔ ٹیچر نے تو اس کی بھولی بھالی بیٹی کو کہیں کا نہیں رکھا تھا۔

دل افروز نے فرزانہ کی پرورش پر خاص توجہ دی اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق اسے انگریزی بھی پڑھائی۔ وقت بڑی تیزی سے بدل رہا تھا — رئیسوں کے ٹھاٹ باٹ ختم ہو رہے تھے۔ دل افروز بھی سن سے اتر چکی تھی — جمع جتھا دولت کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ اور اب تو ہر دو تین ماہ کے بعد اس کا کوئی زیور لالہ مدن لال کے آہنی سیف میں پہنچ جاتا تھا — اور جب فرزانہ سن شعور کو پہنچی تو لوگ اس سہ منزلہ مکان کی رنگین داستانیں تقریباً بھول چکے تھے — چوک اور نخاس میں بازاروں کے رُخ کھلنے والے دروازوں پر موٹے موٹے پردے اور چقیں پڑ گئی تھیں۔ اور پچھواڑے کے دروازوں سے آنے والوں میں چھوٹے بڑے — امیر و غریب اور شریف و رذیل کا امتیاز باقی نہیں رہا تھا — وہ تو اچھا ہی تھا کہ دل افروز کے گھر میں پچھواڑے کوئی دروازہ نہیں تھا — اور گلی اس کے مکان پر ختم

ہو جاتی تھی — ورنہ شاید اسے بھی ہر کس و ناکس کی جیب میں کھنکھناتے ہوئے سکّوں کی جھنکار سننا پڑتی۔

دل افروز وقت کی تبدیلیوں کا مشاہدہ بڑی باریک بینی سے کر رہی تھی — تاکہ اپنی بیٹی فرزانہ کے لئے نئی راہوں کا انتخاب کر سکے۔ وہ اپنی بیٹی کے لئے گزرا زمانہ تو لوٹا نہیں سکتی تھی۔ لیکن اسے نئے زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ضرور سکھا سکتی تھی۔ اب جبکہ ڈیرے دار طوائفوں اور جسم کا سودا کرنے والیوں میں کوئی فرق نہیں رہا تھا — وہ فرزانہ کو اس زندگی اور ماحول سے دور رکھنا چاہتی تھی تاکہ بند گلی کے اس مکان میں تازہ ہوائیں آسکیں۔ اور بند کھڑکیوں کی گھٹن دور ہو سکے۔

خاموش فلموں کے بعد بولتی فلموں کا زمانہ شروع ہوا تو آگرہ، بنارس اور دلّی کی ایک سے ایک نامی طوائف قسمت آزمانے کے لئے بمبئی پہنچ گئی۔ گوہر بائی۔ جدّن بائی، وسیم بانو، شہزادی سب سینما کے پردے پر جگمگانے لگیں۔ ان دنوں ایک طرح سے فلمی دنیا پر ان طوائفوں ہی کی حکومت تھی۔ پھر حکومت بھی کیسی کہ عزّت، دولت اور شہرت ان کے قدم چومتی تھی — اور ان کی شہرت بازاروں سے نکل کر ہوٹلوں، کلبوں، اسکول — اور کالجوں تک پھل پھول رہی تھی — جو شریف زادیاں ان کا نام تک سُننا گوارا نہیں کرتی تھیں — اب بڑے شوق سے ان کا ذکر کرتی تھیں۔ اور دوڑ، دوڑ کر ان کی فلمیں دیکھتی تھیں۔ ایسی عزّت اور ہر دلعزیزی تو ساری دنیا کے چوک اور نخاس مل کر بھی انہیں نہیں دے سکتے تھے —

فرزانہ اپنی ماں جیسی خوبصورت تو نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی تھی تو اسی کی بیٹی۔ اوپر سے نئے زمانے کے فیشن اور کالج کی لڑکیوں جیسی ادائیں — جیسے خنجر کی دھار — سان پر رکھ دی جائے — اس کی چنک منک اور نخروں میں بھی ایسی ہی کاٹ تھی — پھر ٹیچر باپ جیسا بھولپن۔ جس پر اس کی ماں اپنا آپ تک وار بیٹھی تھی — اور گھاگ نانی کے کچھ بنائے نہ بنی تھی — ان سب چیزوں نے مل جُل کر فرزانہ کو بہت کچھ بنا دیا تھا — جس پر ایک زمانہ فِدا ہو سکتا تھا — لیکن اس کے لئے کوٹھے نہیں بنگلے کی ضرورت تھی — اور دل افروز نے اپنا مکان بھائی بھتیجوں کے حوالے کیا اور فرزانہ کو ساتھ لے کر بمبئی پہنچ گئی جُوہُو پر ایک

خوبصورت بنگلہ کرائے پر لے کر گیٹ پر چوکیدار بٹھا دیا تا کہ ہر اَسیرا غیرا۔ نتھو خیرا — وقت بے وقت مونہہ اٹھا کر نہ چلا آئے۔ کچھ دن فلمی دنیا میں گھوم پھر کر ہوا کا رخ دیکھا بھالا — اور اس زمانے کے جانے مانے پروڈیوسر منتوشی جی سے فلم کا معاہدہ کر لیا۔ منتوشی جی کی بَس ایک ہی شرط تھی کہ بے بی (فرزانہ) ان کی فلم کے علاوہ کسی دوسرے کی فلم میں کام نہیں کرے گی۔ کوئی اور ایسی بات کہتا تو دل افروز بے بی کی طرف سے خود اس کے آفر پر لات مار دیتی — لیکن منتوشی جی نہ صرف بڑے پروڈیوسر تھے۔ بلکہ بیوی بچّوں والے اور بہت ہی سنجیدہ انسان تھے — اور باٹلی والا — اور اَمک ڈھمک پروڈیوسروں کی طرح بدنام (یا نیک نام) نہیں تھے —

ان دنوں ہیروئینس — ہیرو کی بہ نسبت پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں کو زیادہ قابل توجّہ سمجھتی تھیں۔ فلم کے پردے پر تو وہ ہیرو سے ہی محبت کرتی تھیں — لیکن شوٹنگ کے بعد ہیرو صاحب کو ٹاٹا کر کے پروڈیوسر کی 'دہلمین' یا شیورلیٹ میں ہوا ہو جاتی تھیں اور بے چارہ ہیرو اپنے قاعدے سے سنوارے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرتا — لوکل ٹرین پکڑنے کے لئے پیدل چل دیتا تھا —

منتوشی جی نے فرزانہ کو لے کر کئی کامیاب فلمیں بنائیں — تنہائی، دلربائی، دریچہ، مہنگائی، فردوس وغیرہ نے خوب خوب دھومیں مچائیں — دیکھتے ہی دیکھتے فرزانہ کا نام فلم کے آسمان پر چاند سورج بن کر جگمگانے لگا — ذاتی بنگلہ — بینک بیلنس — گاڑی — سب کچھ ہو گیا — فرزانہ اور دل افروز سال میں پندرہ بیس روز کے لئے بیرونِ ملک ضرور جاتی تھیں۔ اور محرّم اپنے گھر پر ہی کرتی تھیں — شہر میں فرزانہ کی آمد کی خبر پھیلتے ہی کالج اور اسکول کی لڑکیاں اس کو دیکھنے کے لئے گھروں سے چھپ چھپا کر آتیں اور اس کے کالے لباس میں چمکتے دمکتے حُسن کو دیکھ کر رشک کرتیں۔ غریب لوگ مجلس کے بترک کے لئے ٹوٹ پڑتے اور یوں پہلی محرم سے دس محرم تک فرزانہ کے گھر میں زنانے اور مردانے میں ایسی بھیڑ بھاڑ رہتی کہ گلی سے سڑک تک سر ہی سر نظر آتے۔

پہلی بار جب فرزانہ کے جسم پر چربی کی تہیں چڑھیں تو وہ شوٹنگ کی ساری

تاریخیں کنفیل کر کے ماں کے ساتھ لکھنؤ چلی گئی۔ منتوشی جی تو خود بھی یہ ہی چاہتے تھے کہ فرزانہ ان دنوں بمبئی میں نہ رہے۔ ورنہ بات کھُل گئی تو ان کی بیوی آفت کھڑی کر دے گی۔ فلمی میگزین الگ باتیں بنائیں گے۔ ویسے تو اس کا جل کی کوٹھری میں سب کے سب ہی کالے تھے — پھر بھی اوپر سے عزّت کی سفیدی پھیرنا ضروری تھا — پہلے پہل تو دل افروز کچھ گھبرائی — لیکن منتوشی جی کے احسان اتنے تھے کہ وہ فرزانہ کو دو چار باتیں سنا کر رہ گئی — کچھ مہینوں کے بعد فرزانہ پلنگ پر پاؤں مار کر کھڑی ہوگئی تو پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوگئی تھی — دل افروز نے بھی تو مالش، مساج، احتیاط، پرہیز، ورزش ہر چیز کا خیال رکھا تھا۔ ورنہ عورت تو پہلی زچگی کے بعد ہی ڈھلے ہوئے آٹے کی طرح تھُل تھُل ہو جاتی ہے۔ لیکن فرزانہ کوئی گھریلو بی بی تو تھی نہیں جوان جھمیلوں میں پڑتی سو اس بار وہ ماں کو گھر پر ہی چھوڑ گئی دل افروز بھی مطمئن تھی کہ 'بے بی' فلمی داؤں پیچ سے اچھی طرح واقف ہو چکی ہے۔ اور اکیلی رہ سکتی ہے۔ اس بار بمبئی جانے کے بعد فرزانہ کو اپنی زندگی میں خلاء کا احساس ہوا۔ اسے ایسا لگا کہ وہ اپنے جسم کا ایک ٹکڑا گھر پر ہی چھوڑ آئی ہے۔ جس ننھے سے وجود نے اس کی سانسوں کے ساتھ مل کر سانس لی تھی۔ جس کا ننھا سا دل اس کے ساتھ دھڑکا تھا۔ جو اسی کے وجود کا ایک حصّہ تھا۔ زندہ اور جاندار حصّہ اسے وہ لکھنؤ میں ہی چھوڑ آئی تھی — لیکن منتوشی جی نے اسے فلموں کی چمک دمک دکھا کر بہلا دیا۔ اب وہ سال میں کئی چکّر لکھنؤ کے لگانے لگی۔ اس بات پر کئی بار اس کا منتوشی جی سے جھگڑا بھی ہوا لیکن اس کی آواز بنگلے سے باہر نہ جا سکی۔

دوسری بار فرزانہ کو پھر کچھ مہینے گھر پر ہی گزارنا پڑے تو دل افروز ہتھے سے اُکھڑ گئی —

"میری مانو تو منتوشی جی سے کہو اب باقاعدہ شادی کر لیں ورنہ ان دو۔ دو لڑکوں کو کس کے کھاتے میں ڈالو گی؟" —

لڑکی ہوتی تو پھر بھی فکر کی کوئی بات نہیں تھی" ——

"وہ زمانہ اور تھا بیٹا — لڑکے اپنی ماں بہنوں کی دلالی کرتے تھے، راجوں،

مہاراجوں، امیروں اور رئیسوں سے بے جھجک مول بھاؤ کرتے تھے۔ جس کے بدلے میں وہ زندگی بھر روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد رہتے تھے — لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے تمہارے لڑکے تمہارا کاروبار نہیں سنبھالیں گے بلکہ اپنے ناجائز ہونے کی بات سن کر ڈوب مریں گے"۔

"میں انہیں مرنے نہیں دوں گی۔ انہیں خوب پڑھاؤں لکھاؤں گی اور اس قابل بناؤں گی کہ وہ عزّت سے جی سکیں" "ہُنہ عزّت! وہ بھی رنڈی کی اولاد کی۔ ایکٹریس بن کر تم میں سُرخاب کے پَر نہیں نکل آئے ہیں۔ بلکہ تمہارے لڑکے جہاں جائیں گے تمہاری شہرت ان کی بدنامی کا سبب بنے گی" "پھر میں کیا کروں اماں —؟ منتوشی جی تو اپنی عزّت کی دہائی دینے لگتے ہیں۔ بیوی بچّوں کا واسطہ دے کر میری زبان بند کر دیتے ہیں" —

ان کا کیا ہے وہ تو فلموں میں دوسری 'بے بی' لے آئیں گے آج کل تو جس کو دیکھو ایک 'بے بی' لئے ان فلم والوں کے آگے پیچھے پھرتا ہے تم اپنی سوچو۔ تمہارا کیا ہوگا؟ "تیس سال کی عمر میں اماں کا رول کرو گی یا ایکسٹرا کے ساتھ ناچو گی"۔

فرزانہ اس بات کا کیا جواب دیتی۔ ماں کوئی غلط بات تو نہیں کہہ رہی تھی —

منتوشی جی کی نئی فلم کا مہورت ہوا تو فرزانہ کے بجائے ایک نئی لڑکی شیریں ان کی فلم کی ہیروئن تھی۔ یہ پارسی لڑکی نہ صرف اونچے خاندان سے تعلّق رکھتی تھی۔ بلکہ کانونٹ کی پڑھی ہوئی تھی دھیرے دھیرے خاندانی لڑکے اور لڑکیاں بھی ادھر کا رخ کرنے لگے تھے۔ ابھی تو پارسی اور کرسچین ہی فلم میں اپنی جگہ بنا رہے تھے — پارسیوں کے پاس تھیٹر کی سنہری تاریخ تھی — تو کرسچین لڑکیاں بے شرمی میں آگے تھیں۔ لیکن وہ دن بھی دور نہیں تھا جب اچھے خاندان کے بچّے بھی فن کی خدمت کے نام پر فلموں میں کام کرنے کو عزّت کی بات سمجھنے لگیں گے —

فرزانہ نے منتوشی جی سے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اُدھر افروز اللہ کے گھر سدھاریں اور بھائی بھتیجوں نے سارا مال تال اڑانا شروع کر دیا۔

فرزانہ اپنا بنگلہ، گاڑی اور سارا سامان بیچ کر لکھنؤ پہنچ گئی۔ وہاں تو دیکھ کر لگتا تھا کہ کسی نے گھر پر جھاڑو ہی پھیر دی ہے — صرف ایک سال میں سب کچھ ختم ہو گیا تھا —

مُفت کا مال اڑانے والے رشتے داروں نے اس کی محنت کی کمائی کو دونوں ہاتھوں سے لُٹایا تھا— پھر پتہ چلا کہ مکان بھی ایک مہاجن کے پاس رہن ہے۔

فرزانہ کا دل بالکل ہی ٹوٹ گیا۔ وہی گھر تھا— وہی گلی اور وہی لوگ— لیکن وقت کتنا بدل چکا تھا— اس بار بھی اس نے دل کھول کر محرّم کیا— لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ اس کا آخری محرّم ہے—

بند گلی کے اس مکان سے فرزانہ ماضی، حال اور مستقبل کے سارے تعلّق توڑ چکی تھی۔ جب دل ٹوٹتا ہے تو رشتوں کی ڈور خود بخود کٹ جاتی ہے۔ ایک صبح فرزانہ اپنے دو بیٹوں اور تھوڑے سے سامان کے ساتھ پاکستان ہجرت کر گئی۔ اپنے وطن اور اپنے گھر میں لُٹنے سے اچّھا تھا کہ پردیس میں بے نام ونشان جیا اور مرا جائے۔

سیٹھ رب نواز کسی کام کے سلسلے میں دلّی جانے لگے تو فرزانہ بھی ان کے ساتھ چلنے کے لئے ضد کر بیٹھی— لاہور سے دلّی تک کا ہوائی سفر کچھ گھنٹے کا تھا— لیکن فرزانہ کو یہ مختصر سا وقت بھی صدیوں پر محیط محسوس ہوا۔ فرزانہ نے لکھنؤ کا ویزا بھی بنوا لیا تھا۔ اپنے شوہر رب نواز کو دلّی میں چھوڑ کر وہ لکھنؤ چلی گئی۔

نخّاس کا بازار پہلے سے زیادہ بارونق ہو گیا تھا— نئی نئی دوکانوں اور بلڈنگوں کا اضافہ ہو چکا تھا— سنڈیلہ ہاؤس، کالی کوٹھی، دلربا منزل، امین بلڈنگ، اور پھر فرزانہ کی ٹیکسی رک گئی— شاید اس کی منزل آ گئی تھی—

گلی میں داخل ہوتے وقت فرزانہ کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ ''وہ یہاں کیا لینے آئی ہے؟''— کس سے ملنے آئی ہے؟'' اس کا یہاں کون ہے؟— ''—

وہ ایک دوکان کے پٹرے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

ایک ادھیڑ عمر کا آدمی مٹّی کے تیل کے اسٹوو کی مرمت کر رہا تھا— اس کے دونوں ہاتھ کالے ہو رہے تھے— جھرّیوں دار چہرے پر بھی جگہ جگہ کالے دھبّے لگے تھے۔ گاہک سے کوئی بات کرنے کے لئے اس نے چہرہ اوپر اٹھایا تو فرزانہ چونک اٹھی—

''اُف— یہ تو کرامت ماما ہیں''—

''وہ لمبے چوڑے، چھیل چھبیلے ماما کہاں چلے گئے؟''۔

ایک دم فرزانہ ان کے قریب چلی گئی — برقعے کی نقاب کو برابر کیا اور ان سے مخاطب ہوگئی۔

''آپ کرامت ماما ہیں؟'' —

''ہاں — ہاں — میں کرامت ہوں۔ بی بی آپ کو کیا کام ہے؟''

''جی۔ وہ آپ کی کوئی بھانجی ہے پاکستان میں؟'' —

فرزانہ کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں —

''فرزانہ؟ — ہاں — ہے تو —'' وہ الجھے الجھے سے بولے۔

''میں پاکستان سے آئی ہوں۔ فرزانہ کی دوست ہوں۔ اس نے آپ کے لئے کچھ چیزیں بھیجی ہیں —''

اس نے چمڑے کا خوبصورت سا سوٹ کیس ان کے سامنے رکھ دیا — اور پرس سے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی نکال کر انہیں تھما دی —

''کرامت ماما — کیا اب بھی یہاں اسی طرح محرّم ہوتا ہے؟''

فرزانہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''ہاں بی بی۔ سب کچھ ویسا ہی ہے۔ بلکہ پہلے سے بھی بہتر ہے — مگر بہت کچھ بدل بھی گیا ہے'' —

''— اور وہ — آپ کا مکان؟'' —

''وہ اب ہمارا نہیں رہا —'' —

کرامت ماما نے دھیرے سے کہا —

''وہی کیا — اب تو کچھ بھی ہمارا نہیں رہا —''

فرزانہ نے دھیرے سے کہا — اور جانے کے لئے مُڑنے لگی۔

''بی بی — فرزانہ کے دو بیٹے بھی تو تھے؟۔ کس حال میں ہیں؟'' —

''دو نہیں — چار بیٹے ہیں — چاروں اچھی نوکریوں پر ہیں —''

یہ کہہ کر فرزانہ جلدی جلدی قدم بڑھا کر سڑک پر آ گئی—

رات کی گاڑی سے اسے دلّی جانا تھا—اور درمیان کا یہ وقت وہ اسٹیشن پر ویٹنگ روم میں گزارنا چاہتی تھی—اس بندگلی کی ساری گھٹن اس کے وجود میں سما گئی تھی۔ وقت دو مونہا سانپ بنا کبھی آگے— کبھی پیچھے بھاگ رہا تھا—اور وہ دونوں طرف سے ڈسی جا رہی تھی—وقت کا سا راز ہر اس کے روم روم میں سرائیت کر گیا تھا— لیکن ——— ابھی موت بہت دور تھی———

☆☆

مَصلوب

شہر کے سب سے مہنگے اور خوبصورت ہوٹل کی وسیع عریض لابی میں وہ بڑے اطمینان سے ایک صوفے پر بیٹھی 'ڈن ہل' کے کش لے رہی تھی — شیفون کی ساڑی کا آنچل اس کے کاندھے سے ڈھلک گیا تھا — اور سلیولیس بلاؤز کے گہرے کٹاؤ سے اس کی دُودھیا، گداز بازوؤں کی جھلک جان لیوا حد تک نمایاں تھی — تراشیدہ بالوں کی لٹیں محرابی پیشانی پر بکھری ہوئی تھیں — جنہیں سنوارنے پر اس کی ذرا بھی توجہ نہیں تھی — وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں سے تو کیا خود اپنی ذات سے لاپرواہ نظر آ رہی تھی —

ویٹر اس کے سامنے کولڈ ڈرنک رکھ گیا — لیکن وہ سگریٹ کے مرغولوں میں گم تھی — ایک امریکن اس کو 'ہائے' کرتا گزرا تو وہ بھی مسکرا دی۔ بڑی بے باک مسکراہٹ تھی — امریکن اسے ہنس، ہنس کر دیکھتا ہوا باہر چلا گیا — ہوٹل کا عملہ اس کی موجودگی میں بڑا چاق و چوبند نظر آ رہا تھا — جی۔ آر۔ ای، سخت الجھن میں تھا کہ مسٹر کمار کو اس کی آمد کی اطلاع کیسے دے ان کی تاکید تھی کہ انہیں ڈسٹرب، نہ کیا جائے — وہ بے حد اہم میٹنگ میں مصروف ہیں'' —

رسپشن پر اس وقت سناٹا تھا۔ دونوں خوبصورت اور اسمارٹ سی لڑکیاں اپنے سامنے رکھے رجسٹر سے نظریں اٹھا کر اس کو دیکھ لیتی تھیں۔ ان کی نظروں میں اس کے لئے عزّت سے زیادہ ترس ہوتا کیا اس لئے کہ اس کا شوہر اپنی سکریٹری مسز لال کے ساتھ ایک 'اہم میٹنگ میں مصروف ہے — ؟ اور وہ — یعنی اس ہوٹل کے مالک کی دھرم پتنی — اس

ہوٹل اور کاروبار کی مالکہ — ایک معمولی ہستی کی طرح ہوٹل کی لابی میں بیٹھی سگریٹیں پھونک رہی ہے —؟

اس کے میک اپ اور قیمتی ساڑی کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک قابل رحم ہستی ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر قیمتی ملبوس کے کفن میں بھی زندہ لعشیں کفنائی جاتی ہیں۔ جبکہ معمولی لباس میں لوگ زندگی کو جیتے ہیں۔ عام لوگوں کی عام سی زندگی کیسی سادہ، کتنی پُرکشش ہوتی ہے۔ جیسے یہ ریسپشنسٹ لڑکیاں — یا پھر بٹلر، شوفر، جمعدار، اور — اور جیسے ہزاروں لاکھوں لوگ — زندہ اور جاندار لوگ —

''راجی — تم کب آئیں؟'' —

کمار اس سے مخاطب تھے۔ ان کے پیچھے مسز لال شرافت اور پوترتا کی دیوی بنی کھڑی تھیں۔

''بس ایسے ہی — ادھر سے گزر رہی تھی تو سوچا ایک نظر تمہارا ہوٹل بھی دیکھ لوں'' —

''اُوپر کیوں نہ آ گئیں —؟'' —

''تم کسی ضروری میٹنگ میں مصروف تھے۔ سو میں نے ڈسٹرب نہیں کیا —''

راجی نے ایک نظر فاختہ کی مانند سہمی ہوئی مسز لال پر ڈالی اور مسکرانے لگی — اس مسکراہٹ نے مسز لال کو ہراساں کر دیا۔ اور وہ کمار صاحب سے اجازت لے کر چلی گئی — کمار نے صفائی پیش کی۔ پتہ نہیں اپنی یا مسز لال کی طرف سے —

''یہ حکم تو جانم دوسروں کے لئے تھا۔ تم یہاں کی مالکہ ہو۔ آؤ — اوپر چلیں'' ——

''نہیں —— اب میں جاؤں گی'' ——

راجی نے سگریٹ ایش ٹرے میں ڈالی۔ کھڑے ہو کر ساڑی کا آنچل سنوارا اور پرس شانے پر لٹکا کر باہر کی طرف بڑھ گئی — کمار گیٹ تک اس کے ساتھ گئے راجی نے اپنی کار اسٹارٹ کی — وہ بھی پلٹے اور لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔

''چلو بلا ٹلی—'' کمار نے اطمینان کی سانس لی— ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ راجی کوئی تماشہ کھڑا کر دے گی— بے چاری مسز لال بھی نروس ہوگئی تھی— یہ راجی دن بہ دن ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی ہے لیکن اس کا کوئی علاج بھی تو نہیں ہے—''—

کمار اپنے کمرے میں ایک کرسی پر نیم دراز راجی ہی کے متعلق سوچ رہے تھے کہ انٹرکام کا بزر گنگنانے لگا۔ وہ چونک کر سیدھے ہو گئے۔

''ہاں۔ بولو کیا بات ہے؟''۔ جیسے انہیں پتہ ہو کہ دوسری طرف کون ہوگا۔

''سَر! آپ کے لئے کچھ ٹھنڈا لے آؤں؟''—

دوسری طرف سے پوچھا گیا—

''اوہ شیور (Sure)''— کمار نے خوش مزاجی سے کہا اور فون رکھ دیا— ان کے لبوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی—

''یہ عورت وقت کی نبض پہچانتی ہے۔ اور— اور— میری بھی— اسے معلوم رہتا ہے کہ مجھے کب کس چیز کی ضرورت ہے''—

کمار نے مسز لال کی جی ہی جی میں تعریف کی اور سامنے رکھے کاغذات کو خواہ مخواہ ادھر سے اُدھر رکھنے لگے وہ ہمہ تن مسز لال کے منتظر تھے— جس نے چند مہینے میں ان کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا— اور راجی کا برسوں پرانا سحر توڑ دیا تھا—

کمار صاحب اور راجی نے رومانس، محبت اور شادی تک کئی منزلیں سَر کی تھیں۔ دونوں کا تعلق اونچے گھرانوں سے تھا۔ اس لیے ان کی شادی میں کوئی مشکل نہیں ہوئی— نہ ظالم سماج نے روڑے اٹکائے— نہ ذات پات کی دانتا کِل کِل ہوئی— شملہ میں ان دونوں کا رومانس پروان چڑھا— ساتھ جینے— اور شاید ساتھ مرنے کی بھی قسمیں کھائی گئیں— (محبت میں یہ سب کچھ ہونا نہایت ضروری ہے)۔ راجی اپنے کالج کی، بیوٹی کوئن تھی— تو کمار بھی اپنے کالج کی کرکٹ ٹیم کا کیپٹن اچھا مقرر اور ہونہار طالب علم تھا— دونوں کے والدین کو یہ رشتہ ہر طرح مناسب لگا۔ اور بڑی دھوم دھام سے ان کی شادی ہوگئی۔ مہینوں دونوں ہنی مون مناتے رہے۔ ساری دنیا میں گھومتے پھرے۔ شاپنگ،

تفریح، سیر تماشہ سب سے جی بھر گیا تو گھر واپس آ گئے۔

ابھی ہنی مون سے واپس آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ راجی کو اُلٹیاں شروع ہو گئیں — ڈاکٹر نے مبارک باد دی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ راجی تو سخت پریشان ہوئی۔ اَبھی تو ہنی مون کا نشہ بھی نہیں اترا تھا کہ یہ اُفتاد پڑ گئی۔ کمار بے حد مسرور تھا — جب راجی نے اپنے چاند سے بیٹے کی صورت دیکھی تو اسے ننھے منّے گل گوتھنا سے بچّے پر ٹوٹ کر پیار آیا — وکاس دونوں کی آنکھ کا تارا تھا۔ اگلے برس ریتو آ گئی۔ اور راجی پوری طرح بچّوں میں مصروف ہو گئی —

کمار کے پتا جی اچانک ہارٹ اٹیک میں چل بسے تو بزنس کی ساری ذمے داری اس پر آ پڑی اور وہ بیوی بچوں سے زیادہ کاروبار میں اپنا وقت دینے لگا — راجی جو کمار کی بھرپور محبت اور توجّہ کی عادی تھی — اس تبدیلی کو قبول نہ کر سکی — اور اُلجھی اُلجھی رہنے لگی — کئی بار اس نے کمار سے شکوہ کیا — لیکن کمار نے کبھی پیار سے اور کبھی جھڑک کر اسے ٹال دیا۔ اور شاید غلطی یہیں سے شروع ہوئی — دونوں بچّے اسکول جانے لگے تھے — راجی ان کے جانے کے بعد اتنی بڑی کوٹھی میں تنہا رہ جاتی۔ اور کسی بدروح کی طرح بڑے بڑے کمروں اور برآمدوں میں گھوما کرتی۔ اسے نہ کلب کا شوق تھا — نہ پارٹیاں اٹینڈ کرنے کا۔ اور نہ ہی اس کی سہیلیاں تھیں — بس وہ گھر کے کاموں میں خود کو مصروف رکھتی — فرنیچر کی ترتیب بدلتی۔ کمروں کی سیٹنگ تبدیل کرتی — کوٹھی کا ہر گوشہ سجاتی سنوارتی لان میں مالی بابا کے ساتھ مصروف رہتی — نہ جانے کہاں کہاں سے نایاب پودے منگوا کر اس نے لان کو سنوارا — اور ڈھیروں گملے برآمدے میں، سیڑھیوں پر حتّٰی کہ کمروں کے اندر تک سجا دیے۔ لیکن ایک روز یہ کام بھی ختم ہو گیا۔ اس کی دلچسپی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ اور پھر ایک دن وہ آیا جب اس نے گھر کی پرواہ ہی کرنا چھوڑ دی — اور تمام ذمّے داری نوکروں پر ڈال دی —

کمار نے ایک ہوٹل کے پلان پر کام کرنا شروع کیا تو گویا اسے تن بدن کا ہوش نہیں رہا۔ جب تک یہ پلان کاغذ پر رہا اس کی بے چینی نے ڈپریشن کی صورت اختیار کر لی اور جب ساری تیاریوں کے بعد اس نے ہوٹل کی تعمیر کا ٹھیکہ ایک مشہور کنٹرکشن کمپنی کو

دے دیا تب کہیں جا کر اس کا ذہنی تناؤ کم ہوا۔ لیکن مصروفیت اور بڑھ گئی۔ وہ اپنے ہوٹل کو شہر کا سب سے خوبصورت اور عالی شان ہوٹل بنانے کے لیے کوشاں تھا۔ اور کم از کم تین ستاروں کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا تھا— جیسے جیسے ہوٹل کی تعمیر کا کام مکمل ہو رہا تھا راجی کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا— یہ ہوٹل اس کی سَوت بن گیا تھا۔ جس نے کمار کو پوری طرح ہتھیا لیا تھا۔ وہ سوچتی کاش زلزلہ آ جائے اور ہوٹل زمیں بوس ہو جائے۔ یا کوئی ملک انجانے میں اس جگہ بَم گرا دے اور سب کچھ تہس نہس ہو جائے۔ لیکن اس کی بچکانہ خواہشات کے برعکس ایک دن بڑے ٹھاٹ سے ہوٹل کا افتتاح ہوا، زوردار پارٹی ہوئی شراب اور شباب نے ہر فرق مٹا دیا تھا— یہ جشن آدھی رات تک چلتا رہا— لیکن وہ اس طوفانِ بدتمیزی کو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکی اور گھر واپس چلی آئی۔ بچے سو چکے تھے۔ وہ بھی انہیں کے قریب لیٹ گئی۔ اور دیر تک روتی رہی۔ آج اس نے کمار کا ایک اور روپ دیکھا تھا۔ وہسکی کے نشے میں بدمست کسی ریکھا، بملا، روزی اور سوزی کی بانہوں میں جھومتا ہوا اور سیکڑوں مہمانوں کے سامنے اسے نظر انداز کر کے اس کی بے عزّتی اور دل آزادی کر کے گویا اس نے راجی کو اس کا مقام بتا دیا تھا۔

راجی۔ وکاس اور رینو کو خود ہی اسکول چھوڑنے جاتی تھی۔ واپسی میں ڈرائیور انہیں لے آتا تھا— اسکول کے راستے میں ایک اسپتال پڑتا تھا۔ لیکن یہ عام اسپتالوں سے بالکل مختلف تھا۔ نہ یہاں مریضوں کی بھیڑ بھاڑ نظر آتی تھی نہ تیمارداروں کا ہجوم دکھائی دیتا تھا— بس کسی کسی وقت کوئی گاڑی آتی جاتی دکھائی دے جاتی تھی— یا پھر اِکا دُکا ملازم نظر آ جاتے— ایسا سناٹا— ایسا سکون تھا— مانو اسپتال نہ ہو قبرستان ہو— اس سے زیادہ چہل پہل تو اسپتال سے ملحق گرجا گھر میں نظر آتی تھی— داخلی گیٹ کے بعد لان تھا لان کے بعد کمروں کی قطار— اور جہاں کمروں کی یہ قطار ختم ہوتی تھی— وہاں پھر ایک آہنی گیٹ تھا— جو ہر وقت بند ہی رہتا تھا— اور ایک چوکیدار اسٹول پر مستعدی سے بیٹھا رہتا تھا— راجی سوچتی تھی— اس گیٹ کے پیچھے کیا ہے،۔ کوئی طلسمی دنیا— یا جادوئی شہر؟ یقیناً سارے مریض اس گیٹ کے پیچھے کسی عمارت میں رہتے ہوں گے— اسپتال کے گیٹ پر

ایک بورڈ آویزاں تھا۔ جس پر انگریزی اور اردو زبان میں تحریر تھا۔

"دماغی امراض کا اسپتال"—

اور اسپتال کی چہار دیواری پر جگہ جگہ لکھا تھا۔

"مہربانی کر کے شور مت کریں"

"ہارن آہستہ بجائیں"

"دھیرے چلیے"

دماغی مریض— یعنی پاگل یا نیم پاگل— بے چارے قابلِ رحم لوگ جو زندگی کی چہل پہل سے اس قدر نزدیک ہونے کے باوجود اس سے کتنی دور ہیں۔ بلکہ ان کے لیے گہما گہمی اور شور وغل مُضر ہے۔ انہیں سکون کی ضرورت ہے— انہیں اس دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہے— جو دیوار کے اُس طرف آباد ہیں ان کی دنیا تو اس چہار دیواری کے اندر ہے۔ اپنے خاندان، عزیز واقارب— اور سماج سے کٹے ہوئے یہ لوگ اپنے روز وشب کس طرح گزارتے ہوں گے۔ یا پھر انہیں کوئی احساس ہی نہیں ہوگا کہ کیا کچھ گزارا جا رہا ہے۔ کیا پیچھے چھوٹا جا رہا ہے۔ اور ہر وہ لمحہ جو گرفت سے چھوٹ جائے پھر کبھی پکڑ میں نہیں آتا۔ اور شاید انہیں اس کی کوئی پرواہ بھی نہ ہو— کبھی کبھی ہوش وخرد سے بے گانہ ہو جانا بھی کتنا اچھا ہوتا ہے۔ جہاں اچھائی بُرائی کا احساس نہ ہو— ظلم وزیادتی کا فرق نہ معلوم ہو— تو وہاں زندگی کیسی سہل اور پرسکون ہو جاتی ہے جیسے ایک خوابِ مسلسل— اور ایک سکوتِ بیکراں۔ نیند گہری اور پرسکون نیند۔ بیداری جہاں جُرم ہو اور خوابِ غفلت ایک نعمت— اور یہ سب اس چہار دیواری کے پیچھے ہے—

راجی کا جی چاہتا تھا کہ وہ اسپتال کے اندر جا کر مریضوں سے ملے۔ ان کا دُکھ سُکھ محسوس کرے اور اگر ہو سکے تو ان کا دُکھ بانٹ لے۔ انہیں زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں دے— اور ان کے لیے جو بھی ممکن ہو کرے— وہ بن دیکھے ہی ان مریضوں سے ہمدردی اور اُنس محسوس کرنے لگی تھی— ہر بار اس راہ سے گزرتے ہوئے وہ اسپتال پر ایک نظر ضرور ڈال لیتی تھی۔

کرسمس پر سارا شہر خوب سجایا گیا۔ گرجا گھروں کی آرائش تو قابلِ دید تھی— پھولوں، جھالروں، جھنڈیوں اور غبّاروں سے آراستہ گرجا گھر سکون و مسرّت کے گہوارے نظر آرہے تھے— بچّوں کے اسکول بند تھے— پھر بھی جو ٹیچرز شہر میں موجود تھیں— انہیں راجی نے خوبصورت تحائف دیے۔ اور بچّوں کو خوب گھمایا پھرایا— کئی طرح کے کیک بنا کر ملازموں میں تقسیم کیے۔ اسپتال کے سامنے سے گزرتے ہوئے۔ راجی یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ اسپتال خوب سجا ہوا تھا۔ رنگ برنگے قمقموں نے اس شہرِ خموشاں کو رنگ و نور میں نہلا دیا تھا۔ اور تھوڑی سی چہل پہل بھی نظر آرہی تھی— ان مریضوں کو کس نے تحفے دیے ہوں گے۔ شاید کسی نے بھی نہیں— وہ تحفے لینے کے قابل ہی کب ہیں— شاید انہیں تو یہ بھی خبر نہ ہو کہ آج اتنا بڑا تیوہار ہے۔ اسپتال کے عملے کے لوگ انہیں کے سامنے خوشیاں منا رہے ہوں گے اور وہ ان مسرّتوں سے لاتعلق ہوں گے— یہ کیسا ظلم ہے ان کی ذات پر؟—

راجی کی ساری خوشیاں ملیا میٹ ہوگئیں اور وہ اداس ہوگئی— خدا جانے یہ کیسا جذباتی رشتہ تھا اس کا اَن دیکھے اور انجانے مریضوں کے ساتھ؟ جسے وہ صرف محسوس کر سکتی تھی۔ اس کا سبب بتانے سے وہ خود بھی قاصر تھی—

بچّوں کے اسکول کھُلنے میں چند روز باقی تھے جب کمار نے فیصلہ سنا دیا۔

"بچّے دہرہ دون میں پڑھیں گے۔ میں نے ساری کارروائی مکمل کر لی ہے۔ ان کے جانے کے انتظامات کر دو۔ ایک ہفتے کے بعد انہیں اپنے کلاسز جوائن کرنا ہیں"—

"تم نے مجھ سے پوچھے بغیر یہ فیصلہ کیوں کیا؟— یہ میرے بچّے ہیں— ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے تم کو میری رائے لینا ہوگی—"—

"یہ بچّے میرے بھی کچھ لگتے ہیں؟ ان کی بہتری کے لیے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ تم سے مشورہ لینا بالکل بھی ضروری نہیں ہے۔"—

"لیکن یہ ظلم ہے کمار— میں ان کے بغیر مر جاؤں گی— انہیں کے سہارے تو میں زندہ ہوں"—

"کوئی نہیں مرتا راجی! ہم بھی تو شملہ میں رہ کر پڑھتے تھے۔ ہمارے ماں باپ تو نہیں مرے؟ ہنسی خوشی ہمیں رخصت کرتے تھے—"

کمار نے گویا اس کا مذاق اڑایا—

اس نے کہنا چاہا کہ ہمارے ماں باپ کے بیچ یہ دوریاں اور یہ فاصلے نہیں تھے— جو ہمارے درمیان ہیں۔ لیکن وہ کھل کر نہ کہہ سکی— وہ کہتی بھی تو کمار کب سنتا— وہ تو اس سے بالکل لاتعلق ہو چکا تھا۔ عرصے سے ان کے بیڈ روم بھی الگ تھے— مصروفیات بھی جدا تھیں۔ ناشتے اور کھانے کے اوقات بھی الگ تھے۔ بلکہ جب سے ہوٹل کا سلسلہ شروع ہوا تھا— کمار وہیں کھاتا پیتا تھا— اور بیشتر وقت وہیں گزارتا تھا— اس کے لئے ایک 'سوئیٹ' مخصوص تھا۔ رات میں بھی وہ نہ جانے کب آتا تھا— اور اپنے کمرے میں سو رہتا تھا—

محبت کی معراج اگر شادی ہے تو شادی کی معراج کیا ہے— یہ لاتعلقی، یہ اجنبیت اور یہ دوری؟ تو پھر محبت اور شادی سب دھوکہ اور فریب ہے۔ یکسر جذباتی عیاشی وہ بھی چند روزہ— اور ناپائیدار اور جو رشتہ پائیدار نہ ہو— جس کی اساس محض— جذبات پر ہو۔ اس کا ٹوٹ جانا ہی اچھا ہے— لیکن رشتہ جڑنا جتنا آسان ہوتا ہے۔ ٹوٹنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ کم از کم ایسا آسان بھی نہیں ہوتا— راجی کی مخالفت اور بچّوں کی ناراضگی کے باوجود بچّوں کو دہرہ دُون بھیج دیا۔ ان کا بزنس مینجر مسٹر چندرا— ایک ملازم کے ساتھ انہیں دہرہ دون پہنچانے گیا— خود کمار کو اتنی بھی فرصت نہیں تھی کہ وہ انہیں اسٹیشن جا کر سی آف کرتا— کیونکہ اس شام اس کے ہوٹل میں پہلی بار کیبرے ڈانسر شیلا کا پروگرام تھا— اور بہت اہم ہستیاں مدعو تھیں—

راجی بچّوں کو اسٹیشن چھوڑنے نہیں گئی— اپنے کمرے میں پڑی روتی رہی— آیا نے کئی بار آ کر اسے سمجھایا— بجھایا— لیکن اس نے اپنے آنسوؤں کو بے روک ٹوک بہنے دیا— یہ لاوا تو بہت دنوں سے اندر ہی اندر پک رہا تھا— کھول رہا تھا— اور اسے خود بھی معلوم تھا کہ کسی دن بھی یہ کھولتا ہوا لاوا باہر آ جائے گا۔ کمار نے نہ تو اس کی دلجوئی کی نہ

اسے بہلانے اور منانے کی ضرورت محسوس کی۔ اس کے نزدیک تو یہ راجی کا پاگل پن ہی تھا۔ راجی نے کار اسپتال کے کمپاؤنڈ میں ایک کنارے روک دی—

رسپشن کاؤنٹر پر دبلی پتلی ہنس مکھ سی لڑکی بیٹھی تھی— اسے دیکھ کر وہ بڑی اپنائیت سے مسکرائی— راجی کو اس کی مسکراہٹ سے بڑا حوصلہ ملا—

''میں ڈاکٹر سے ملنا چاہتی ہوں''—

''کسی مریض کو دکھانا ہے میڈم؟''—

''مجھے خود ہی تھوڑی سی پرابلم ہے''

''آپ بیٹھ جائیں پلیز''—

لڑکی نے راجی سے پوچھ کر ساری تفصیلات ایک رجسٹر میں نوٹ کیں— اور ایک سِلپ دے کر کہا—

''کل صبح نو بجے ڈاکٹر سالومن کے ساتھ آپ کا اپائنٹمنٹ ہے''—

''تھینک یُو سو مچ''

راجی نے سِلپ تھامی اور اپنی کار کی طرف بڑھ گئی— ذہنی امراض کے اسپتال سے اس کا پہلا رشتہ قائم ہو گیا تھا— یہ اس کی دیرینہ آرزو کی تکمیل تھی— یا اس کی ضرورت یہ بات کہنا ذرا مشکل تھا— وہ خود بھی کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھی۔ البتہ یہ ضرور محسوس کر رہی تھی کہ اسے یہیں اپنا کھویا ہوا سکون ملے گا—

ڈاکٹر سالومن، ڈاکٹر چترا فلپ اور ڈاکٹر رینالڈ تیواری کے ساتھ اس کی کئی میٹنگز (Meetings) ہوئیں۔ ہر میٹنگ کے بعد راجی نے خود کو زیادہ خوش، زیادہ مطمئن محسوس کیا۔ وہ ہفتے میں تین بار اسپتال جاتی تھی— رفتہ رفتہ وہ ڈاکٹرز اور اسٹاف سے گھل مل گئی— اس طلسمی نگری کا راز اب راز نہیں رہا تھا— پرائیوٹ وارڈ اور جنرل وارڈ ہر طرح کے مریضوں سے بھرے ہوئے تھے— اعلیٰ خاندان کے تعلیم یافتہ لوگ— بے حد سلجھی ہوئی بات چیت اور معیاری شوق اور رہن سہن— لیکن وہ سب گوشۂ عُزلت کے مکین بننے پر مجبور تھے— کوئی گھر کے ماحول سے فرار پانے کے لئے منشیات لینے لگا تھا۔ کوئی ڈپریشن

کا شکار تھا۔ کوئی اپنے آس پاس کے ہنگاموں سے اکتا کر یہاں آ گیا تھا۔ کسی کا جائز حق مار کر دوسرے کا پرموشن کر دیا گیا۔ تو برداشت وصبر کی حدوں سے تجاوز کر کے یہاں آ گیا۔ والدین سے شکایت شوہر سے شکوہ، سماج کے خلاف غم وغصہ — اپنی ذات سے نفرت — اپنے وجود کی نفی — اولادوں کے ہاتھوں ستایا بے کس انسان — عبرت — عبرت درد لامتناہی جہنموں کا سلسلہ —

راجی ان سب کی غم گسار بن گئی۔ سب کا دکھ درد بانٹنے پر تیار ہو گئی۔ کسی کو تحفہ دیا۔ کسی کو پیار دیا۔ کسی کے ساتھ روئی۔ کسی کے ساتھ ہنسی — سب مریض اس سے مانوس ہو گئے — ڈاکٹر اس کی عزت کرنے لگے — اسٹاف اس سے محبت کرنے لگا — روزانہ پھل اور مٹھائی کے پیکٹ اٹھائے چلی آتی — تیوہاروں پر سب کو تحائف تقسیم کرتی — نادار مریضوں کی دوا کے اخراجات برداشت کرتی — ان سب کی ضروریات کا خیال رکھتی — اسپتال کو کئی ہزار روپے ڈونیشن دیا — کتنا ضروری سامان خرید کر دیا — یہ اسپتال اس کا کعبہ تھا — اس کا مندر تھا — جہاں پہنچ کر اسے سکون اور خوشی کی دولت ملتی —

بچے ہر سال سرما کی تعطیل میں آتے اور لوٹ جاتے — لیکن اس کے معمول میں فرق نہ آتا — اب اسے کمار کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ وہ مسز لال کے ساتھ وقت گزارے — یا نئی نئی کیبرے ڈانسرز کے ساتھ راتیں گزارے اسے کوئی ملال نہ ہوتا — وہ شہر میں رہے یا بیرون ملک جائے وہ ذرا بھی فکر نہ کرتی — سب کچھ کیسا نارمل لگتا تھا —

اس بار وکاس اور ریتو آئے تو اس نے محسوس کیا کہ ریتو کچھ بڑی ہو گئی ہے۔ وہ لباس کے اندر بھی ضروری کپڑے پہننے لگی تھی — راجی نے بے اختیار رینو کو سینے سے لگا کر پیار کر لیا — وکاس کے بالائی ہونٹوں پر ہلکے ہلکے روئیں جم رہے تھے۔ ابھی وہ اتنا بڑا نہیں ہوا تھا کہ اسے جوان کہا جاتا لیکن ہیرو بنے رہنے کا شوق اس کے رنگ برنگے ملبوسات سے ظاہر ہوتا تھا۔ راجی نے اس کی پیشانی چوم کر سکون کی سانس لی۔ ''اُف میرے بچے مجھ سے دور رہ کر جوان ہو گئے۔ اور میں ان کے تئیں اپنا کوئی فرض نہ نبھا سکی۔ کمار نے مجھ سے میرے سارے حقوق چھین لیے۔ میرے بچوں کو مجھ سے دور کر دیا — مجھے خود میری ذات

سے بیگانہ کر دیا میں دوڑ دوڑ کر اسپتال کیوں جاتی ہوں — اس لیے نا کہ وہاں میرے اپنے ہیں۔ اور اس گھر کے در و دیوار تک میرے لیے اجنبی بن چکے ہیں۔"

ایک شام کہ ہر شام کی طرح اداس تھی — اچانک کمار اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سخت غصّے میں تھا۔ راجی نے اپنے اندر سکون کی ٹھنڈی لہریں بہتی محسوس کیں — اس نے زبان سے کچھ نہ کہا — بس سوالیہ نظریں اس پر مرکوز کر دیں۔ کمار نے ایک کاغذ لہرایا۔

"ریتو کسی سے عشق کر رہی ہے۔ اس کے لو لیٹرز پکڑے گئے ہیں۔ پرنسپل نے اس بار اسے وارننگ دے کر چھوڑ دیا ہے۔ اور آئندہ اس نے کوئی ایسی حرکت کی تو اسے اسکول سے نکال دیا جائے گا۔"

راجی کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اس نے اپنا منہ گھما لیا —

"تم اسپتال کے چکّر لگاتی رہو — تمہیں تو پاگل بننے کا شوق ہے۔ اور لڑکی میری عزّت کا جنازہ نکال رہی ہے۔ سنا تم نے پاگل عورت میں کیا کہہ رہا ہوں؟" —

کمار چلایا تو وہ مسکرانے لگی —

"خوب سنا کمار صاحب۔ بلکہ میں تو کسی ایسی خوشخبری کی عرصے سے منتظر تھی — کیا آپ کو پتہ نہیں ہے کہ آپ کی بیٹی جوان ہو چکی ہے؟" —

"کیا مطلب — جوان ہونے کا اس بدمعاشی سے کیا واسطہ ہے۔ تم تو مجھے بھی پاگل کر دو گی" —

"جی نہیں — آپ کو پاگل کرنے کے لیے مسز لال — روزی ٹینا، مینا اور شیلا ہی کافی ہیں۔ میں نے آپ کو اس حد تک پاگل نہیں کیا کہ آپ اپنے فرائض سے آنکھیں بند کر لیں۔"

راجی نے قہقہہ لگایا تو کمار جل کر چلا گیا —

اگلے ہفتے ریتو اور وکاس گھر پر موجود تھے۔ کمار خود دہرہ دون گیا تھا — اور انہیں

اسکول سے نام کٹوا کر گھر لے آیا تھا۔ ریتو اور وکاس اس کے گلے لگ کر رو دیئے۔ کمار کا حکم تھا کہ ریتو گھر پر ہی رہے گی۔ البتہ وکاس کا داخلہ مقامی کالج میں کرا دیا تھا۔

راجی تیز رفتاری سے کار چلاتی ہوئی اسپتال پہنچی — اور ڈاکٹر سالومن کے آفس میں داخل ہو کر ہذیانی انداز میں چیخی —

''ڈاکٹر — آج میں نے ان سب کو آزاد کر دیا۔ سب کو بے چارے کب سے پنجرے میں بند تھے — اچھا کیا نا؟'' —

ڈاکٹر سالومن نے اس کے خون آلود ہاتھوں کو دیکھا۔ داغ دار کپڑوں کو دیکھا۔ اور بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔ اس کی پشت تھپتھپائی۔ محبت سے بولے —

''بی ایزی ڈارلنگ — آرام سے بیٹھو۔ تم نے بہت اچھا کیا جو سب کو آزاد کر دیا'' —

راجی کرسی پر گر سی گئی۔ ڈاکٹر نے نرس کو ایک — انجیکشن تیار کرنے کا حکم دیا۔ اور اسے سہارا دے کر سائیڈ روم میں لائے — بیڈ پر اسے آرام سے لٹا دیا — اور اس کے بازو میں انجکشن لگا کر دس پندرہ منٹ تک اسے تھپکتے رہے۔ حتیٰ کہ راجی آرام سے سو گئی —

چپراسی نے ڈاکٹر سالومن کو بتایا —

''کمار صاحب کا فون ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' —

''ہوں — بڑی جلدی خیال آ گیا'' —

سالومن بڑبڑائے اور فون کی طرف بڑھ گئے —

''ہیلو'' —

''ہیلو — ڈاکٹر سالومن میں کمار بول رہا ہوں'' —

''پتہ ہے کمار صاحب — اطمینان رکھیں — راجی اپنے صحیح مقام پر پہنچ گئی ہے'' —

''وہاٹ؟'' کمار غرائے'' —

''جی ہاں — ہم سارے ڈاکٹرز اور خود راجی اپنی کوششوں میں ناکام ہو گئے —

شاباش ہے آپ کو— کہ آپ نے اسے اس جگہ پہنچا کر ہی دم لیا—"

ڈاکٹر سالومن نے فون رکھ دیا۔ نرس سے کہا—

"راجی کے لیے سات نمبر وارڈ تیار کر دو"—اور خود راجی کے پاس چلے گئے۔ وہ انجکشن کے اثر سے گہری نیند سو رہی تھی—اس کے پتلے پتلے لبوں پر پُرسکون مسکراہٹ تھی اور یہ مسکراہٹ پکار پکار کر کہہ رہی تھی، میں بے گناہ مصلوب ہوں— مجھے سولی سے اتار لو—میں جینا چاہتی ہوں اپنے بچوں کے لیے—اس سنسار کے ہر دُکھی انسان کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں"—

ڈاکٹر سالومن نے سفید رومال سے اپنے آنسو پونچھے کمرے سے باہر نکلے— سامنے اسٹاف کے لوگ کھڑے تھے—

خاموش اور اداس—

"راجی۔ یہاں آ گئی ہے۔ اب وہ ایک لمبے عرصے تک یہیں رہے گی۔"

انہوں نے کسی کو مخاطب کئے بغیر کہا—اور گیلری میں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے کسی طرف نکل گئے—

☆☆

ایک آگ کا دریا ہے

اگر میں اپنی عمر کا حساب کرنے بیٹھوں تو چالیس میں سے بیس سال گھٹانے کے بعد صرف بیس سال بچیں گے۔ یعنی وہ بیس سال کا عرصہ جسے میں اپنی زندگی کہہ سکوں۔ اور اگر اس میں سے پندرہ برس اور کم کر دوں تو ازدواجی زندگی کے صرف پانچ برس خوشیوں کے میزان پر پورے اتریں گے اور یہ پانچ برس ایک لڑکی کے ارمانوں اور اس کے رنگین خوابوں کی تعبیر کے لئے ایسے ہی ہیں جیسے کسی پیاسے کو بیکراں سمندر سے بس چند قطرے دیئے جائیں۔ جس سے پیاس تو بجھے گی۔ تشنگی کا احساس اور بڑھ جائے گا— تو ایسی تھی میری زندگی، جسے زندگی کہنا زندگی پر تہمت رکھنا ہے—

یوں تو ہماری تمام عمر ہی ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی— شادی سے پہلے اس پر ماں باپ کا اختیار ہوتا ہے۔ اور شادی کے بعد اس کے ایک ایک لمحہ پر شوہر کا اختیار ہو جاتا ہے— کہ وہ جس طرح چاہے اسے برتے۔ اس کا جی چاہے تو ہمیں خوشیوں کے ہنڈولے میں جھلائے (اگرچہ ایسا کم ہی ہوتا ہے) اور دل چاہے تو دن رات جلائے اور کڑھائے— میری تقدیر میں جلنا اور کڑھنا لکھا تھا— سو قسمت کا لکھا پورا ہوا— شوہر کی پانچ سالہ رفاقت اور محبت کا ثبوت میرے تین بچے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں عورت کے اندر جھانکنے کا رواج نہیں ہے ازدواجی زندگی کامیابی کی ضمانت بچوں کی تعداد سمجھی جاتی ہے۔ جس عورت کے جتنے زیادہ بچے ہوں— اسے اتنا ہی خوش نصیب سمجھا جاتا ہے— ان بچوں کی ولادت کے دوران عورت کو جس ذہنی کرب سے گزرنا پڑتا ہے— اس کا احساس

کوئی نہیں کرتا— یہ ایک آگ کا دریا ہے— جسے پار کرنے میں عورت کو کتنے امتحانوں کی بھٹی میں جلنا پڑتا ہے۔اس کا حساب کون کرے؟—

مجھ سے پوچھیں تو میں صاف صاف کہہ دوں کہ یہ صرف ایک مفروضہ ہے— جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں— لیکن ہمارے معاشرے کا بنیادی ڈھانچہ ہی مفروضوں پر قائم ہے۔ جب زندگی میں خوشیاں نہ ہوں، سکون نہ ہو— تو یہ بچے بھی ہمارے امتحان کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔اور ہمارے ساتھ ساتھ ان کی معصوم خوشیاں بھی جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ ان کا قصور بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ یہ ایک مرد کی 'وقتی' خواہشات اور لمحاتی خوشی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں اور اس پر ان کا بس بھی نہیں ہوتا— نظامِ قدرت سے انحراف کرنے کی قوت اگر ان میں ہوتی تو دنیا کا ہر دوسرا بچہ اس سے منحرف ہوتا— دراصل مرد کی خواہشات کا ریلا اتنا زوردار ہوتا ہے کہ اس پر قابو پانا یا اسے روکنا یا اس پر 'بند باندھنا' کم زور عورت کے بس کی بات نہیں ہے۔ مردوں کے بنائے ہوئے اس سماج میں عورت کو اب تک وہ درجہ نہیں مل سکا جو اس کا حق ہے۔ حالانکہ اس کے حق کی حفاظت میں مذہب— قانون، اخلاق اور انسانیت بھی اس کے ساتھ ہیں۔لیکن یہ سب کاغذی باتیں ہیں—

''ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ کے مصداق عورت کے حقوق کو پامال کرنے والے مرد کو کبھی کسی عدالت میں جوابدہ نہیں ہونا پڑتا— عورت کو کمزور بنانے میں سب سے زیادہ تو اسی صنفِ قوی کا ہاتھ ہے۔ تاکہ وہ اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کے لئے سامنے نہ آسکے—

والدین کے حسابوں میری شادی بہت ٹھیک وقت پر ہوئی۔ یعنی سولہویں سال میں ہاتھوں میں مہندی رچائے۔ دل میں ارمانوں کی دنیا بسائے۔ آنکھوں میں سنہرے خواب سجائے شوہر کی دہلیز پر اتری— اور گھر والوں نے سُکھ کی سانس لی۔ کہ بیٹی خیر سے اپنے گھر کی ہوگئی۔ میں بھی خوش تھی کیونکہ اس وقت میں ناسمجھ تھی— شعور بیدار نہ ہو تو ایسی حماقتیں سرزد ہونا عام سی بات ہے۔ اور شعور بیدار بھی کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ عمر تو علم حاصل

کرنے کی ہوتی ہے۔ علم جو زندگی کو برتنے کا سبق دیتا ہے۔ آگہی کے دروازے کھولتا ہے— ادراک کی قوت بخشتا ہے۔ لیکن معاشرے نے عورت کو اس حق سے بھی محروم رکھا ہے— ہمارے سماج میں عورت کو علم کے حصول کی خاطر گھر بٹھانے کا تصوّر ہی نہیں ہے— بلکہ اس کی ادھوری تعلیم کو کبھی کوئی مسئلہ ہی نہیں سمجھا جاتا— اور پڑھائی چھڑوا کر اس کے ہاتھوں سے کتابیں اور قلم لے کر الگ رکھ دیئے جاتے ہیں سو مجھے بھی اسکول سے اٹھا کر ڈولی میں بٹھا دیا گیا— میں اس زیادتی کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند نہ کر سکی۔ کیونکہ اتنی عقل ہی نہیں تھی۔ پھر چونکہ امتیاز نئے نئے شوہر بنے تھے۔ ان کے پیار اور چاؤ چونچلوں میں کھو کر کبھی مجھے یہ خیال بھی نہ آیا کہ میرے ساتھ کیسا زبردست دھوکہ ہوا ہے۔ اس وقت تو میں بھی اسی کو زندگی سمجھ رہی تھی— عقل تو اس وقت آئی جب میرے حقوق پر ڈاکہ پڑا— ڈاکہ ڈالنے والا بھی باہر کا آدمی نہیں تھا۔ میرا شوہر امتیاز ہی تھا۔ جس کے پیار کا سیلاب جس زور و شور سے آیا تھا۔ اسی طرح اتر گیا۔ اور میں گزرے لمحوں کے نقش تلاش کرتی رہ گئی۔ یہ نقش بھی کہاں ملتے کہ طوفانی ہواؤں نے سب کچھ مٹا ڈالا تھا— بس چار سو ایک جامد سناٹا تھا—

ابتدائی دنوں میں امتیاز ہر رات سب سے چھپا کر میرے لئے موتیا کے گجرے ضرور لاتے تھے— اور بڑے چاؤ سے میرے ہاتھوں اور بالوں میں سجاتے تھے۔ اور میں خود کو آئینے میں دیکھتی تو اپنی خوش نصیبی پر جھوم اٹھتی— ایسا چاہنے والا شوہر بھلا کب کسی لڑکی کو ملا ہوگا— اور پھر جب وہ بڑے پیار اور اصرار سے مٹھائی کے پیس کھلاتے تو من و سلویٰ بھی اس کے سامنے ہیچ نظر آتا۔ ان کی محبت کے ساتھ بچّوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا— اور میں دن رات گھر داری اور بچّوں میں مصروف ہوتی گئی۔ پہلے گجرے غائب ہوئے۔ پھر مٹھائی کھٹائی کی دوکانیں بند ہوئیں اور رفتہ رفتہ میاں کے میٹھے بول بھی رخصت ہو گئے—

عورت تو اپنے پہلے بچّے کی آمد کے بعد ہی اپنے سارے ساج سنگھار بھول کر اپنی تخلیق کے لاڈ و پیار میں ڈوب جاتی ہے۔ اس کی معصوم مسکراہٹیں اور پیاری پیاری حرکتیں

ہی اس کا سنگھار بن جاتی ہیں۔ اور پھر جب اوپر تلے کئی پیارے پیارے بچّے آ جائیں تو اپنی طرف دھیان دینے کا وقت ہی کہاں ملتا ہے — ؟ عورت کا بس چلے تو ان کی خاطر دنیا ہی چھوڑ دے۔ ماں بننے کی مسرّت میں وہ ان حقائق سے بھی چشم پوشی کرنے لگتی ہے جو آئندہ زندگی میں اس کے سکون اور مسرّتوں پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے کسی مہیب کالی رات کی مانند دبے قدموں اس کی طرف بڑھتے آتے ہیں۔ شوہر کی خدمت، بچّوں کی پرورش اور گھر کے کام کاج کے بعد اس کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہوتا کہ ایک پَل کے لئے آئینے پر نظر ہی ڈال لے۔ ایک لمحہ کے لئے رک کر یہ دیکھ لے کہ وہ کیا کچھ کھوتی جا رہی ہے۔ ہوش تو اس وقت آتا ہے۔ جب وہ سب کچھ کھو کر تہی دامن رہ جاتی ہے۔ کیسی بے وقوف ہوتی ہے یہ عورت ذات بھی! کاش وہ بھی مرد کی طرح عقل مند ہوتی — اور اپنی ذات اور اپنی شخصیت پر بھی توجہ دیتی۔ ایک میری ہی مثال لے لیں — جس وقت میں بچّوں کی نیپی بدلتی ہوں یا ان کی گندگی صاف کرتی ہوتی ہوں — امتیاز نکھرے ستھرے۔ بہترین سوٹ میں ملبوس، آئینے کے سامنے کھڑے قیمتی خوشبوؤں کا اسپرے کرتے ہوئے، بریل کریم سے بالوں کو سیٹ کر کے ٹائی کی ناٹ کونت نئے ڈھنگ سے باندھتے ہوتے ہیں۔ ناشتے میں پانچ منٹ کی بھی دیر ہو جاتی۔ تو پورا گھر سر پر اٹھا لیتے۔ اور بار بار طعنہ دیتے کہ تمہیں تو اپنے بچوں ہی سے فرصت نہیں ملتی — میرا خیال کیا خاک رکھتی ہو — ؟ اور میں ہڑ بڑا جاتی۔ میرے ہاتھ پھرتی سے ناشتہ بنانے لگتے۔ کیا یہ بچّے تنہا میرے ہیں؟ — امتیاز سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے؟ — اگر نہیں تو پھر یہ آ کیسے گئے۔

امتیاز کی بے پروائیاں بڑھتی گئیں تو میں نے ان کی توجہ حاصل کرنے کی ازسرِ نو کوشش کی۔ ایک شام جب وہ سج دھج کر باہر جانے کے لئے تیار تھے — اور بڑے خوش نظر آ رہے تھے۔ تو میں ان کے قریب چلی گئی۔ خوشبو کا ایک ریلا سا ان کے اطراف بہہ رہا تھا — میں نے سُوں سُوں کر کے سونگھا۔ اور مسکرا دی۔ خیال آیا ''امتیاز آج بھی کیسے اچھے ہیں'' —

''امتیاز — میں بھی چلوں گی۔ ایک مدّت سے باہر نہیں گئی ہوں۔ ہم اچھی سی فلم

دیکھیں گے اور کھانا بھی باہر ہی کھائیں گے۔ بس دو منٹ رکیں۔ میں جھٹ پٹ تیار ہوتی ہوں" میں نے کہا۔

"تم ؟— تم باہر جاؤ گی؟ ذرا آئینے میں اپنی صورت تو دیکھو" ایک استہزائیہ مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل گئی۔

میری نظر بے اختیار آئینے کی طرف اٹھ گئی۔ اُف! وہاں تو میرے بجائے کوئی چڑیل نظر آ رہی تھی— مدقوق جسم۔ سوکھی گھاس جیسے بکھرے بال، بجھی بجھی آنکھیں، پچکے گال، اور میلا لباس، کیا واقعی یہ میں ہی ہوں؟ میں نے خود سے سوال کیا اور اپنی سوکھی کھڑنک انگلیوں سے بالوں کو سہلایا۔ آنکھوں کو چھوا۔ اور ہونٹوں کو مَس کیا۔ اور پھر میری اُنگلی کی پور— ہونٹوں کے ذرا اوپر ابھرے ہوئے سیاہ تِل پر ایک پَل کے لئے رک گئی گئی— یہ سیاہ تل جو امتیاز کو بہت پسند تھا— کیا اب انہیں نظر نہیں آتا؟ لیکن اس تِل سے پرے میرا وجود بھی تو ہے جو میری ذات کی نفی کرتا ہے۔ وہ شاید کوئی بھولا بھٹکا آنسو ہی تھا۔ جو مجھ سے چوری چوری آنکھ سے ڈھلک آیا تھا— اور میری ٹھنڈی پور نے اس گرم گرم قطرہ کو اٹھا لیا۔ میں اسے زمین میں جذب نہیں ہونے دوں گی۔ یہ آنسو اتنا بے وقعت نہیں ہے۔ یہ ایک قطرہ میری ذات کا۔ میرے ہونے کا واحد ثبوت ہے۔ میں زندہ ہوں۔ میں زندہ رہوں گی، اپنے لئے نہ سہی، اپنے بچّوں کے لئے جیوں گی میں نے دیکھا کمرہ خالی تھا، امتیاز جا چکے تھے اور میں تنہا کھڑی تھی امتیاز کو ایک شگفتہ اور شاداب چہرہ کی جستجو ہے۔ اور مجھے شاید اب کسی کی تلاش نہیں ہے۔ جو خود ہی کھو چکا ہو— وہ بھلا کچھ پانے کی تمنا کیسے کر سکتا ہے۔ میں تھکے تھکے قدموں سے باہر آ گئی۔

اس روز امتیاز آفس کے کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کے دفتر کا ساتھی منوج کچھ کاغذات دینے آ گیا۔ اور دبی زبان سے بولا۔

"بھابھی لگتا ہے کہ آپ نے امتیاز کو کچھ زیادہ ہی چھوٹ دے دی ہے"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"—

"تو کیا آپ کو کچھ بھی پتہ نہیں؟"—

''نہیں — مجھے کچھ نہیں معلوم۔ آپ ہی بتا دیں'' —

''وہ — اور نازنین — ''منوج چپ ہو گیا اور مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ بات بہت آگے بڑھ چکی ہے —

''منوج میں نے کچھ اندازہ تو لگایا تھا۔ لیکن — ''

''آپ اسے سمجھایئے بھابھی — ''منوج یہ کہہ کر چلا گیا۔

میں نے اپنے آپ سے کہا ''کوئی فائدہ نہیں ہے'' دراصل میں نے انہیں پایا ہی کب تھا۔ جو کھونے کا احساس ہو — بلکہ شاید کوئی مرد ''اپنا آپ'' کسی عورت کو نہیں سونپتا — خواہ وہ اس کی شریکِ حیات ہی کیوں نہ ہو — وہ اپنا ٹکڑا — ٹکڑا وجود ساری عمر بانٹتا رہتا ہے۔ اور عورت سے یہ امید کرتا ہے کہ وہ صرف — اور صرف اس کی ہو کر رہے — وہ تو صرف امید ہی کرتا ہے۔ اور عورت اسے یقین اور اعتماد کے خزانے بخش دیتی ہے۔ تب ہی تو وہ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور نئی دنیاؤں میں نئے جزیرے تلاش کرتا ہے۔ خوشیوں۔ خوشبوؤں اور روشنیوں کے نئے جزیرے۔ جو اسے زندگی کا بھرپور احساس بخشیں — اور وہ فخریہ کہہ سکے کہ میں مرد ہوں — امتیاز بھی ان جزیروں کی تلاش میں تھا — اور اس کے چہرے کی طمانیت بتا رہی تھی کہ وہ اپنی تلاش میں کامیاب رہا ہے ''نازنین — نازنین — یہ نام امتیاز کی زبان سے شہد بن کر ٹپکنے لگا — اس کی غربت — اس کی مظلومی — اس کا رکھ رکھاؤ — اس کی خودداری — اور پھر سب کے آخر میں اس کے حسن کی تعریف — آدھے ادھورے جملوں سے بس اتنا ہی معلوم ہوا کہ نازنین ان کے آفس میں کام کرتی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کے آفس میں کئی لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ لیکن اس سے پہلے کبھی کسی کا ذکر اس عنوان سے نہیں سنا تھا — شاید وہ اس دنیا کی واحد غریب، مظلوم، خوددار — اور ہاں حسین بھی — لڑکی ہے — پھر میں نے محسوس کیا کہ رفتہ رفتہ امتیاز اس کا ذکر کم کرنے لگے ہیں۔ یہ خطرے کا سگنل تھا۔ کم از کم میں تو یہی سمجھتی تھی — اور میرا اندیشہ سچ نکلا — نازنین امتیاز کی زندگی میں جس زور و شور سے آئی تھی۔ ویسی ہی خاموشی سے واپس بھی چلی گئی — لیکن امتیاز کی بے وفائی کے نقوش نہ مٹ

سکے — اور برسوں بعد — جب وہ ایک رات پشیمان، شرمندہ، اداس اور پچھتاووں سے جھکے میرے پاس واپس آئے تو میں نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ امتیاز گڑگڑائے —

"— مجھے معاف کردو — میں نے تمہیں بہت دکھ دیئے ہیں" —

"میرے دکھ کا احساس آپ کو آج ہوا۔ جب نازنین آپ کو ٹھکرا کر کسی اور کے پاس چلی گئی —؟"

"وہ اس لائق نہیں تھی کہ اس کو تم پر فوقیت دی جاتی۔ وہ کم ظرف عورت تھی —"

"اسے گالی نہ دیں۔ امتیاز کہ اس نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔۔۔۔

آپ کتنے منافق ہیں امتیاز — اگر آپ کسی عورت کو ٹھکرائیں تو جائز اور اگر عورت آپ کو ٹھوکر مارے تو قابلِ گردن زدنی؟"

"میں — میں تمہارے پاس واپس آ گیا ہوں —"

"خوب! لیکن میں نے آپ کو اس کی اجازت نہیں دی۔ اور نہ میں کبھی آپ کو معاف کروں گی" —

"نازنین عورت نہیں ناگن تھی۔ جس نے میرے گھر کی خوشیوں کو ڈس لیا۔ وہ بے وفا تھی۔ مجھے اس سے نفرت ہے" — امتیاز نے زہر اُگلا۔

"نفرت تو مجھے بھی آپ سے ہے۔ بے وفا وہ نہیں آپ ہیں امتیاز — بلکہ میں تو اس کی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے 'مرد' کو پہچاننے کا سلیقہ بخشا — مرد کو سمجھنے کا گُر بتایا — آپ کا کیا ہے؟ — کل کوئی اور نازنین مل گئی تو آپ پھر اس غلطی کو دہرانے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ اور پھر معافی — نہیں — نہیں — میں اب مزید فریب نہیں کھا سکتی — آپ اپنی دنیا میں لوٹ جائیں — مجھے اب آپ کی ضرورت نہیں ہے — میرا بیٹا — میرا اپنا جواد — ماشاء اللہ جوان ہو گیا ہے۔ عزت سے دو روٹی تو وہ بھی مجھے دے سکتا ہے — " —

"کیا میرا اور تمہارا ساتھ اسی 'روٹی' کے رشتے سے تھا؟ — اور کچھ نہیں تھا ہمارے بیچ؟ — "

"نہیں — ہرگز نہیں — کیونکہ آپ نے روٹی کپڑے کے سوا میرا کوئی حق نہیں مانا۔ لیکن میں جانور نہیں ہوں جسے صبح و شام چارہ بھوسا دے کر مالک اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائے۔ میں ایک جیتی جاگتی عورت ہوں۔ جذبات اور احساسات رکھتی ہوں۔ اور میں آپ سے اپنی زندگی کے ایک ایک پل کا حساب مانگتی ہوں۔ آپ میری زندگی کے بیس سال لوٹا دیجئے۔ میں آپ کو معاف کر دوں گی" —

میں دروازہ بند کر کے اندر آئی — اور بستر پر لیٹ کر میں نے آنکھیں موند لیں — خدا جانے آج سارے آنسو کہاں غائب ہو گئے تھے — آج مجھے ان کی کتنی ضرورت تھی — آنسو نہ نکلے۔ تو دل سینے سے باہر آ جائے گا — جس کی شریانوں میں خون نہیں — ایک مرد کی بے وفائی کی آگ رواں دواں ہے — اور اس آگ نے ایک دو نہیں — بیس برس مجھے جلایا ہے۔ اور میں جو ایک مُشتِ خاک ہوں — امتیاز کو یہ حق کبھی نہیں دوں گی کہ وہ اس راکھ کو فضاؤں میں منتشر کر دے —

میری بیٹیاں میرے دل کی ٹھنڈک ہیں تو جواد میرا مان اور میرا غرور ہے — میں اپنی بیٹیوں کو ورثے میں عورت کا ایثار ضبط اور حوصلہ دوں گی — لیکن جواد کو امتیاز نہیں بننے دوں گی — اسے بتاؤں گی کہ ——

"عورت مرد کی کھیتی ہے، تو اس کھیتی کو زمانے کی گرم ہواؤں سے بچانا اس کا فرض ہے کہ ہر عورت میں آگ کا دریا پار کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا —"

☆☆

سوئیٹ ہوم

ولیم نے اپنے خوبصورت اپارٹمنٹ کا جائزہ لیا اور مسکرانے لگا۔

آج اس کا اپارٹمنٹ صحیح معنوں میں ایک مکمّل گھر معلوم ہو رہا تھا۔ مسز مارٹن اور مسٹر ہنری کی آمد نے نہ صرف اس گھر کے سونے پن کو دُور کیا تھا— بلکہ اس کی زندگی کے ازلی خلا کو بھی پُر کر دیا تھا۔ ایک بے نام ونشان بچّے کی زندگی میں محرومیوں کے سوا ہوتا بھی کیا؟ ہے یتیم خانے والے ان بچّوں کی پرورش ضرور کرتے ہیں۔ اُنہیں پڑھا لکھا کر اس قابل بھی بنا دیتے ہیں کہ وہ اپنی روزی خود کما سکیں— لیکن وہ ان بچّوں کو ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت تو نہیں دے سکتے۔ ولیم بھی یتیم خانے میں پلا بڑھا تھا اور اپنے گھر کی تمنا اس کے دل کے کسی گوشے میں پروان چڑھ رہی تھی— پھر اس نے سخت محنت کی اور ایک گھر بنا لیا۔ یہ گھر اس کے خوابوں کی تعبیر ضرور تھا۔ لیکن ابھی یہ گھر ادھورا تھا— نامکمّل تھا— اس گھر کا خالی پن دور کرنے کے لیے اس نے قیمتی سامان سے اپنا— اپارٹمنٹ بھر دیا— لیکن وہ خلا ان مادّی چیزوں سے پُر نہ ہونکا۔ جس نے شعور سنبھالتے ہی اس کی روح کی گہرائیوں میں زخم ڈال دئے تھے—

دوستوں نے اسے شادی کی ترغیب دی۔ لیکن اس کی سوچ کا دھارا نہ بدلا— بیوی گھر کو سجا سنوار سکتی ہے— بچّوں کو جنم دے سکتی ہے— لیکن اسے ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت تو نہیں دے سکتی— بیوی کی محبت اور رفاقت— والدین کی محبت اور رفاقت کا بدل نہیں ہو سکتی۔ یوں اس کی ازلی محرومی اس کے ساتھ گھر میں بھی چلی آئی۔

اپنے اخبار کے لئے نئی نئی کہانیوں کی تلاش میں ولیم اِدھر اُدھر گھومتا رہتا تھا— ایک دن اولڈ ہوم جا پہنچا— یہاں اسے کئی دلچسپ کہانیاں ملنے کی امید تھی— لیکن ان بوڑھوں سے گفتگو کرنے کے بعد کوئی دلچسپ کہانی تو ولیم کو کیا ملتی، وہ خود اس کہانی کا حصّہ بن گیا۔ اب تک وہ یتیم خانوں ہی کو دنیا کی بدترین جگہ سمجھتا رہا تھا— اور یتیموں کو دینا کی بے کس ترین مخلوق، لیکن یہاں آکر اسے پتہ چلا کہ یہ 'اولڈ ہوم' بھی کسی عقوبت خانے سے کم نہیں ہیں اور یہ بیمار، اور کمزور بوڑھے وہ بدنصیب انسان ہیں جو اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی لاوارث ہیں۔ کیونکہ ان کا ناکارہ وجود ان کی اولادوں پر بوجھ بن چکا ہے اور ان کے پاس ان کی دیکھ بھال کے لئے وقت نہیں ہے— اپنے ہی بنائے ہوئے گھر سے انہیں بے دخل کر کے یہاں سِسک سِسک کر جینے اور موت کی آرزو میں لمحے۔ لمحے کی موت مرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ ولیم نے وہ بدنصیب مائیں بھی دیکھیں۔ جو ماں بننے کے جرم میں یہاں قید کی گئی تھیں۔ اپنے بچّوں کا ذکر کرتے وقت ان کے جھرّیوں بھرے چہرے پر ممتا کا نور ضُوفشاں ہو جاتا تھا۔ ان کا وقت انتظار کی جان لیوا اذیّت میں بیت رہا تھا۔ نئے سال کے کارڈ کا انتظار۔ یا پھر اپنی برتھ ڈے پر کسی بیٹی یا بیٹے کے تہنیت نامہ کا انتظار— کرسمس کے موقع پر کسی معمولی تحفے کا انتظار— زندگی جو عذاب مسلسل تھی— انتظار کی بیساکھیوں کے سہارے گھسٹ رہی تھی۔

ولیم نے اس اولڈ ہوم میں ایسے باپ بھی دیکھے جنہوں نے اپنی عمر کے بہترین سال اپنے بچّوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے اور انہیں ایک خوش گوار مستقبل دینے کی جدّ و جہد میں گزارے تھے۔ انہوں نے اپنے مضبوط بازوؤں کی قوّت اس گھر کی تعمیر میں صَرف کی تھی۔ جہاں ان کے بچّے آرام سے رہ سکیں۔ ان کے عیش و آرام کی خاطر انہوں نے دن رات کڑی محنت کی تھی اور اب اپنے ہی گھر سے دور زندگی کی اندھیری اور یخ بستہ راتوں میں تنہا کھڑے تھے— آج ان کے قدموں تلے نہ زمین اپنی تھی اور نہ سر پر چھت اپنی تھی— وہ زندگی جس پر انہیں کبھی بہت ناز تھا۔ آج اس کی ہر سانس مستعار لی ہوئی تھی—

ولیم کو یتیم خانے کی وہ ڈارمیٹری یاد آئی جہاں اس جیسے بچّے اپنے بستر کی تنہائی

میں ماں کی ممتا بھری آغوش کی گرمی کے لئے ترستے تھے۔ اور کھردرے کمبل کی گرمی سے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اپنا جی خوش کرنے کے لئے بچّوں نے ڈارمیٹری کی دیواروں پر رنگین پنسلوں سے کاغذ پر 'سوئیٹ ہوم' لکھ کر چپکا دیا تھا۔ بچّے اگر ایسی حرکتیں کر کے خود کو فریب دیتے تھے تو یہ ان کی مجبوری تھی لیکن یہ بھولے بھالے ضعیف لوگ کس مجبوری کے تحت فریب کھا رہے تھے۔ ولیم نے وہاں جس سے بھی سوال کیا — اس نے اپنی مجبوری بڑھا چڑھا کر بیان کی اپنے بچّوں کا دفاع کرتے ہوئے وہ یہ بھی بھول گئے کہ اس اولڈ ہوم تک ان کی رہنمائی ان کی اولاد نے کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں کی ہے۔ بلکہ اپنے عیش و آرام کی خاطر کی ہے۔ وہ انہیں بوجھ سمجھتے ہیں — ناقابلِ برداشت بوجھ —

ولیم نے اس روز اخبار کو کوئی کہانی نہیں دی — اور اس کی جگہ کوئی اور مضمون لگانا پڑا — وہ سخت آزردہ تھا — اتنی عمر تک وہ ماں باپ کے پیار کے لئے ترستا رہا اور اس اولڈ ہوم میں کتنے ماں باپ ہیں جو اولاد کی صورت دیکھنے کو ترستے ہیں۔ جن کے لئے اپنا گھر ایک بھولی بسری کہانی بن گیا ہے۔ جبکہ اس عمر میں والدین کو اپنے بچّوں کی محبت اور خدمت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ جس جگہ ان کی ذمّہ داریاں ختم ہوتی ہیں وہیں سے اولاد کے فرائض شروع ہوتے ہیں۔ اور تب ولیم نے ایک فیصلہ کیا اور وہ اولڈ ہوم سے مسز مارٹن اور مسٹر ہنری کو اپنے گھر لے آیا

اگر لاوَلد والدین کسی بچّے کو گود لے سکتے ہیں تو بن ماں باپ کا بچّہ والدین کو بھی گود لے سکتا ہے۔ یہی فیصلہ تھا ولیم کا۔

مسز مارٹن کا کمزور بازو تھام کر ولیم نے بڑی محبت سے کہا —

''ممّی —— یہ آپ کا کمرہ ہے — کسی چیز کی کمی ہو تو بتا دیں''

مسٹر مارٹن نے کپڑوں کی الماری — آرام دہ مسہری رائیٹنگ ٹیبل پر کتابوں کے ریک اور آرام کرسی پر نظر ڈالی پھر سائڈ ٹیبل پر رکھا ریکارڈ پلیئر آن کر دیا۔ ہلکی موسیقی سے کمرہ گنگنا اٹھا۔ مسز مارٹن کی آنکھوں میں تشکّر کے آنسو جھلملانے لگے۔

''بیٹا یہ سب بہت خوبصورت ہے میری امیدوں سے کہیں زیادہ ہے یہ سب'' —

انہوں نے ولیم کی پیشانی چوم لی ''گاڈ بلیس یُو مائی سن'' مسز مارٹن کی دعا اور ان کے پیار نے ولیم کی روح تک کو سرشار کر دیا۔ پھر اُس نے مسٹر ہنری کو ان کا کمرہ دکھایا—

اس شام ڈرائینگ روم میں ''وی سی آر'' پر ایک کارٹون فلم دیکھتے ہوئے وہ کافی پی رہے تھے اور ساتھ ہی دلچسپ باتیں بھی کر رہے تھے۔ اس وقت تینوں بہت خوش تھے۔ مسز مارٹن کا مسٹر ہنری سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ لیکن ولیم کے رشتے نے ان دونوں میں بھی ایک تعلّق پیدا کر دیا تھا۔

اگلے ہی دن مسز مارٹن نے گھر کا کام سنبھال لیا۔ اور مسٹر ہنری نے لان کی درستگی۔ فرنیچر کی پالش اور گھر کی صفائی کی ذمّے داری اپنے سر لے لی۔ ولیم ہفتہ بھر کا راشن۔ گوشت، انڈے، سبزی وغیرہ چھٹّی کے دن لے آتا تھا۔ مطلوبہ سامان کی لِسٹ مسز مارٹن اور مسٹر ہنری دونوں مل کر بناتے تھے۔ جس میں سرِ فہرست ولیم کی ضروریات کا سامان ہوتا تھا اور جب اس فہرست میں ولیم کچھ اضافہ کرتا تو دونوں ایک ایک آئٹم پر بحث کرتے تھے— مسز مارٹن کہتیں۔

''ابھی پچھلے ہی ہفتے تو تم میرے لئے دستانے لائے تھے۔ ابھی مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے—''

ولیم کہتا ''ممّی تم بھول رہی ہو— میں دستانے نہیں— موزے لایا تھا—''

''ٹھیک ہے۔ موزے ہی ہوں گے لیکن فی الحال انہیں رہنے دو— جب ضرورت ہوگی کہہ دوں گی''—

مسٹر ہنری یاد دلاتے—

''میرا شیونگ سیٹ تو بالکل نیا ہے— ولیم تم نے بے کار ہی لِسٹ میں اس کا اضافہ کر لیا''—

''میں نے ایک نئی قسم کا شیونگ سیٹ بازار میں دیکھا ہے— سوچتا ہوں لے ہی آؤں''

ولیم کے لیے یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں بہت قیمتی تھیں۔ وہ ان دونوں کا بے حد

خیال رکھتا تھا— کبھی انہیں گھمانے پھرانے لے جاتا۔ کبھی اسٹیج شو دکھاتا— کبھی ان کی خاطر پک نِک کا پروگرام بناتا۔ اس طرح جیسے کوئی بچّوں کو بہلاتا ہے— مسز مارٹن— اور مسٹر ہنری اس کی محبت خدمت اور سعادت مندی دیکھ کر نہال ہو جاتے— مسٹر ہنری کو اپنا بیٹا یاد آ جاتا— جیکسن کیسا نافرمان، بدتمیز اور خودسر تھا۔ اس کی حرکتوں پر کُڑھ، کُڑھ کر ماں تو ختم ہی ہوگئی اور انہوں نے گھر کے بجائے اس اولڈ ہوم میں رہنا پسند کیا— کم از کم وہاں انہیں سکون تو تھا— اور مسز مارٹن تو تین بچّوں کی ماں تھیں۔ ساری زندگی شرابی شوہر نے دُکھ دیئے— پھر بچّے جوان ہوئے تو رہی سہی کسر اُنہوں نے پوری کر دی۔ وہ سوچتیں کہ کاش ان کے لڑکے بھی ولیم کی طرح ہوتے اور وہ اپنے گھر میں سکون سے بڑھاپا کاٹتیں۔ لیکن نصیب میں تو اور ہی کچھ لکھا تھا۔ سولڑکے خود ہی انہیں اس ہوم میں ڈال گئے— اب ولیم ایک غیر لڑکا ان کی محرومیوں اور اداسیوں کو دور کرنے کے لئے دن رات کوشاں رہتا ہے اس نے انہیں ایک گھر دیا۔ اور ماں جیسی عزّت اور محبت دی۔

مسٹر ہنری اور مسز مارٹن ولیم کے مستقبل کے لئے نت نئے پروگرام بناتے رہتے— سب سے زیادہ تو انہیں اس کی شادی کی فکر رہتی تھی— انہیں حیرت تھی کہ ولیم نے ابھی تک کوئی لڑکی پسند کیوں نہیں کی— ایک روز مسز مارٹن نے ولیم سے پوچھ ہی لیا—

"ڈارلنگ! کیا دنیا کی ساری لڑکیاں اندھی ہوگئی ہیں"؟

"ممّی— میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا—"—

"یہی کہ لڑکیوں کو میرا اتنا ہینڈسم اور اسمارٹ بیٹا کیوں نظر نہیں آتا—" مسز مارٹن نے گویا برا مان کر کہا۔

ولیم ان کی بات سمجھ کر ہنسنے لگا—

"ممّی بات ذرا الٹی ہوگئی ہے۔ مجھے کوئی ایسی لڑکی نظر نہیں آتی جو آپ کی طرح خوبصورت اور محبت کرنے والی ہو"

"میں تمہاری شرارت سمجھ رہی ہوں۔ لڑکے! یقیناً تم نے میری وہ تصویر دیکھ لی ہے—"—

''وہ تصویر تو ڈیڈی نے بھی دیکھی ہے—''—

''اس اولڈ مین نے کیوں دیکھی ہے میری تصویر؟''—

مسز مارٹن نے مصنوعی غصّے سے کہا—ولیم ہنس پڑا—اور انہیں ستانے کے لئے بولا۔

''ڈیڈی تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ پیگی جوانی میں بہت حسین تھی''

مسز مارٹن جھینپ گئیں—پھر سنجیدگی سے بولیں—

''مذاق میں بات نہ ٹالو ولیم! تمہیں شادی کر لینا چاہئے—''

یہی عمر ہوتی ہے گھر بسانے کی—''

''ممی تم تو اچھے بھلے گھر کو جہنّم بنانے کا مشورہ دے رہی ہو—ہم آج کتنے خوش ہیں—شادی کے بعد جب ایک اجنبی ہستی اس گھر میں آئے گی اور ہر چیز کی مالک بن جائے گی تب بھی کیا ہم اسی طرح خوش رہ سکیں گے؟ یقین مانو ممّی سب سے پہلے تو وہ تم دونوں کو بے دخل کرنے کی سوچے گی۔ اور میں یہ بات کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ میرے پیارے ممّی ڈیڈی اس عمر میں گھر سے بے گھر ہوں— نہیں ممّی—ابھی کچھ اور نہ سوچو پلیز'' ولیم نے التجا کی—

''ولیم—مائی سن! تم فطرت کے خلاف فیصلہ کر کے کبھی خوش نہیں رہ سکتے۔ ایسا نہ ہو کہ کل تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑے اور ہمیں تم سے۔ یعنی اپنے بیٹے سے شرمندہ ہونا پڑے۔ کیونکہ تم یہ سب ہماری ہی خاطر تو کر رہے ہو؟—

''اوہ ممّی بھول جاؤ کہ میں یہ سب تم دونوں کی خاطر کر رہا ہوں—یہ فیصلہ تو میں نے اپنی خوشی کے لئے کیا ہے۔ میں خوش رہنا چاہتا ہوں۔ ماں باپ کے سایۂ شفقت میں چند سانسیں سکون اور مسرّت کی لینا چاہتا ہوں۔ بیوی تو کسی دن بھی مل سکتی ہے۔ بلکہ جب چاہوں گا مل جائے گی۔ لیکن جیسی چاہوں گا ویسی نہیں ملے گی۔ اس لئے کیا فائدہ اچھی بھلی زندگی کو جہنّم بنانے سے—میں اپنے ماں باپ کے ساتھ بہت خوش ہوں—''—

ولیم نے مسز مارٹن کو اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اور مسز مارٹن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ولیم کو

سمجھانے کے لئے اور کون سی دلیل لائیں۔

ولیم نے تو اسٹیلا سے بھی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ فی الحال چند برس تک شادی نہیں کرے گا— اسٹیلا اس سے ناراض بھی ہوگئی تھی اور کئی دن کٹی کٹی سی رہی تھی— لیکن ایک جگہ کام کرنے کی وجہ سے وہ زیادہ دن خفا نہیں رہ سکی۔ اور ان میں پھر بات چیت ہونے لگی۔ حالانکہ دونوں کا رویّہ ذرا محتاط قسم کا تھا— پھر بھی ساتھ والوں کو ان کی رنجش کا علم ہو ہی گیا— یہ بات تو سب ہی جانتے تھے کہ ولیم نے 'اولڈ ہوم' سے دو بوڑھوں کو لا کر ماں باپ بنا لیا ہے۔ شروع شروع میں انہوں نے ولیم کا مذاق بھی اڑایا— پھر اس کی سنجیدگی دیکھ کر خود ہی چپ ہو گئے— اسٹیلا بھی یہ بات جانتی تھی— اور ایک طرح سے وہ ان بوڑھوں کو اپنا رقیب سمجھتی تھی۔ جن کی خاطر ولیم اسے ٹال رہا تھا— وہ کبھی ولیم کے گھر نہیں گئی تھی۔ اور نہ اس کے ساتھ کہیں 'ڈیٹ' پر گئی تھیں— بس آفس میں دونوں روز مل لیتے تھے— لنچ ساتھ کر لیتے تھے— اسٹیلا کو ولیم کی سنجیدگی اور سادگی پسند تھی— وہ عام نوجوانوں کی طرح نہ تو چھچھورا تھا— اور نہ لڑکیوں کے پیچھے بھاگتا تھا— ایسے نوجوان کے ساتھ گھر بسا کر وہ یقیناً خوش رہتی۔ لیکن بیچ میں اچانک یہ بوڑھے آ ٹپکے۔ اور شادی کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ اسٹیلا کو کبھی کبھی بہت غصّہ آتا تھا۔ کہ جا کر ان نکمّے بوڑھوں کو خوب کھری کھری سنائے یہ بھی نہ سہی تو کم از کم انہیں احساس تو دلائے کہ ان کی وجہ سے ولیم اس پر اور خود اپنی ذات پر کیسا ظلم کر رہا ہے۔ اور ایک دن وہ سچ مچ ولیم کے گھر پہنچ گئی۔ اس وقت ولیم آفس میں تھا۔ اس لئے وہ اطمینان سے گفتگو کر سکتی تھی—

مسز مارٹن نے اسٹیلا کو بڑی گرم جوشی سے خوش آمدید کہا۔ مسٹر ہنری نے اسے چاکلیٹ والی کافی پلائی۔ اور پھل بسکٹ اور پیسٹری بھی پیش کی۔ اتنی خاطر تواضع دیکھ کر اسٹیلا کا دل پگھل گیا۔ اور ان بوڑھوں کے خلاف اس کے دل میں جو بھی غم و غصّہ تھا وہ صابن کے جھاگ کی مانند بیٹھ گیا۔ اسٹیلا کو یہ دونوں بزرگ بہت اچھے لگے۔ اس نے اپنا تعارف ولیم کی دوست کی حیثیت سے کرایا تھا— لیکن مسز مارٹن سمجھ گئیں کہ اس دوستی کے پسِ پردہ کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ اس لئے وہ اسٹیلا سے کچھ زیادہ ہی دُلار سے پیش آ رہی تھیں۔

''ولیم نے تمہاری جیسی پیاری دوست کا کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔ اور نہ کبھی ہم سے ملوانے کی کوشش کی۔ کہیں تم دونوں کی لڑائی تو نہیں چل رہی ہے۔''——

''ولیم تو بہت اچھا دوست ہے ممی—— دراصل ہماری دوستی اس قسم کی نہیں ہے جیسی عام طور سے ہوتی ہے۔''

اسٹیلا نے صفائی پیش کی۔

''ہمارا بیٹا آج کل کے نوجوانوں کی طرح بے لگام نہیں ہے۔ وہ رشتوں کی عزّت کرنا جانتا ہے۔ رشتہ چاہے دوستی کا ہو یا کوئی اور—— ہر حال میں اس کے لئے قابلِ احترام ہے''

مسز مارٹن نے بڑے فخر سے کہا۔ اور مسٹر ہنری کی طرف دیکھ کر تائید چاہی۔ انہوں نے اثبات میں گردن ہلا کر ان کی بات کی تائید کی۔ اور مسکرانے لگے۔

''ولیم نے کبھی تم سے شادی کی بات کی۔ یا اس موضوع پر بات کرتے شرماتا ہے——؟''——

''ولیم اس موضوع کے علاوہ ہر موضوع پر بات کرتا ہے''

اسٹیلا نے آہستہ سے کہا۔

''ایک بار تم ہمّت کر کے بات کرو بیٹی! میری تو دلی خواہش ہے کہ وہ جلد شادی کر کے اپنا گھر بسالے''——

''ممی میں اپنی طرف سے پوری کوشش کر چکی ہوں——

بلکہ ہماری لڑائی بھی ہو گئی تھی۔ لیکن وہ شادی کرنے سے انکار کرتا ہے——''——

''یہ تو بہت غلط بات ہے۔ میں ولیم کو سمجھاؤں گی''۔

مسز مارٹن نے اِسٹیلا کو تسلّی دی۔

''آپ بہت اچھی ہیں ممی۔ آپ ولیم کو یہ بھی یقین دلایئے گا کہ میں آپ دونوں کو بہت پیار دوں گی۔ اور خوب خدمت کروں گی۔''

اسٹیلا نے مسز مارٹن کے دونوں ہاتھ تھام کر گویا اپنے دعوے کی پختگی کا یقین

دلایا۔ مسز مارٹن ہنسنے لگیں۔

''ضرور بیٹی — میں ولیم کو تم سے شادی کرنے پر رضامند کروں گی۔ کیوں مسٹر ہنری؟ — اسٹیلا پیاری ہے نا؟''

''میں اتنی دیر سے یہی سوچ رہا ہوں کہ ہمارے ولیم کے لئے اسٹیلا نہایت موزں شریکِ سفر ثابت ہوگی'' —

اسٹیلا شرما گئی — پھر ان سے اجازت لے کر چلی گئی — اسٹیلا کے دل میں بھی ان دونوں بوڑھوں کے لئے احترام اور محبت کے جذبات تھے — اور ساری کدورت دور ہوگئی تھی — وہ اپنی پچھلی سوچ پر شرمندہ تھی — اور دل ہی دل میں ولیم سے معافی مانگنے کا فیصلہ کر چکی تھی —

اسٹیلا کے جانے کے بعد مسز مارٹن اور مسٹر ہنری دیر تک ولیم کی شادی کی باتیں کرتے رہے۔ انہیں اسٹیلا دل سے پسند آئی تھی۔ ''مسٹر ہنری ایک بات ہے، ولیم کو ہم نے کئی دفعہ سمجھایا مگر وہ شادی کے لئے رضامند نہیں ہوتا — جب تک ہم دونوں یہاں موجود رہیں گے۔ وہ شادی نہیں کرے گا'' —

''تمہارا مطلب ہے مسز مارٹن کہ ہمیں یہاں سے چلا جانا چاہئے؟''

''ہاں یہی مطلب ہے۔ وہ غریب ہماری خاطر اتنی قربانیاں دے رہا ہے تو ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ اس کے لئے ایثار کریں — اس کی محبت کا صلہ یہ تو نہیں ہے کہ وہ ہماری خاطر ساری عمر کنوارا رہے؟ — اور اپنی جوان امنگوں کا گلا گھونٹتا رہے؟'' —

''ہاں — ہم لوگ تو بُری بھلی زندگی گزار ہی چکے ہیں۔ اب تو صرف موت کا انتظار ہے۔ تو وہ کسی جگہ بیٹھ کر کیا جا سکتا ہے۔'' مسٹر ہنری نے سنجیدگی سے کہا —

''رائٹ مسٹر ہنری — ہر شہر میں ایسے 'اولڈ ہوم' ہیں اور آج میں محسوس کر رہی ہوں کہ یہ 'اولڈ ہوم' ہمارے جیسے بوڑھوں کے لئے بے حد ضروری ہیں'' —

''اور اس گھر کو اسٹیلا کی ضرورت ہے۔ ولیم کے پیارے۔ پیارے بچّوں کی

کلکاریوں کی ضرورت ہے"—

مسٹر ہنری بے حد جذباتی ہو رہے تھے— مسز مارٹن دھیرے دھیرے مسکرا رہی تھیں۔ اور ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے—

ولیم گھر آیا تو اسے گہری خاموشی کا احساس ہوا— واقعی گھر خالی تھا— ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی۔ بس وہی دونوں نہیں تھے— مسز مارٹن کی رائٹنگ ٹیبل پر ایک خط رکھا تھا—

پیارے ولیم— ہمیشہ خوش رہو!

والدین کے لئے بچّوں کی خوشی سے بڑھ کر عزیز کوئی شئے نہیں ہوتی— ہماری خوشی ہے کہ تم اسٹیلا سے شادی کرلو۔ وہ بہت پیاری لڑکی ہے۔ اور تم سے پیار بھی کرتی ہے— ہم دو بوڑھے زندگی سے بھلا یا بُرا اپنا حصّہ پا چکے ہیں۔ اب تمہاری باری ہے— خوشیاں تمہاری منتظر ہیں ولیم بڑھ کر انہیں سمیٹ لو— ہم جا رہے ہیں— جہاں بھی رہیں گے تمہارے لئے دعا کرتے رہیں گے۔

اسٹیلا کو ہمارا پیار دینا—

تمہاری ممّی

اور

ڈیڈی

☆☆

تلاش بہاراں

زمین اگر لاوارث ہو تو بیج ڈالنے والے کا کیا قصور؟—

خودرو پودوں کا جنم لاوارث زمین کی کوکھ سے ہی ہوتا ہے۔ میں بھی ایک خودرو پودا تھا— جسے پانی، کھاد اور نگہداشت کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ سو میں گاؤں کی گلیوں میں رُلتے رُلتے بڑا ہوا— پورا گاؤں میرا گھر تھا" لیکن نہ سر پر چھت اپنی تھی— نہ پاؤں کے نیچے زمین اپنی تھی — اور نہ ہی پروان چڑھانے والے ہاتھوں کا شفیق لمس میسّر تھا— حالانکہ میرے بچپن کو اس کی ضرورت تھی— اور میں ممتا بھری آغوش کی کھوج میں در، دَر بھٹکتا رہا روٹی کا ٹکڑا تو کتے کو بھی مل جاتا ہے— لیکن میں کتا نہیں انسان تھا— اور ساری مخلوق میں افضل اور اشرف بنا کر اس دنیا میں بھیجا گیا تھا—

بشری تقاضوں سے معمور دل و دماغ ہر پل ہر لمحہ مجھے احساس دلاتا تھا کہ اس زندگی پر اور دنیا کی تمام و کمال آسائشوں پر میرا بھی حق ہے۔ عورت کی محبت بھری آغوش سے محرومی— میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھی۔ عورت جو روپ بدل بدل کر مرد کی زندگی میں آتی ہے— اور ہر روپ میں اس پر پیار اور ممتا کی بارش کرتی ہے۔ مرد ہمیشہ بنجر دھرتی کی مانند پیاسا رہتا ہے۔ اور عورت بادل بن کر اپنے پیار کی پھوار سے اس کو شرابور کرتی ہے۔ اسے سیراب کرتی ہے۔ اور اس کی تشنگی مٹا دیتی ہے۔ وہ کبھی ماں بن کر اسے لوریاں سناتی ہے۔ اور کبھی امربیل کی مانند اس سے لپٹ کر اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے کہ عورت مرد کی تخلیق کا سرچشمہ بھی ہے اور اس کی تکمیل بھی۔

وہ مجھے پہلی بار مندر کی سیڑھیوں پر ملی تھی۔ اس وقت وہ لال کنارے کی سفید ساڑی پہنے تھی۔ اس کی دودھیا، شفاف مانگ میں سیندور کی لکیر ہنس رہی تھی — محرابی پیشانی کے درمیان سُرخ بندیا مسکرا رہی تھی — گوری کلائیوں میں دھانی کریلیاں اور سُنہری بانکیں سجی تھیں۔ اور سفید کبوتر جیسے پاؤں میں سُرخ آلتا لگا تھا۔ پوجا کی تھالی دونوں ہاتھوں میں سنبھالے — وہ پجارن کے بجائے دیوی لگ رہی تھی۔ جو آکاش کی بلندی سے زمین پر آ گئی تھی۔ پہلی ہی نظر میں وہ مجھے اچھی لگی۔ اسے قریب سے دیکھنے کی خواہش مجھے بے کل کر گئی۔ اور میں نے اپنے دل میں پہلی بار کچھ خوشگوار سی دھڑکنیں محسوس کیں — خون کی روانی اچانک بڑھ گئی۔ اور بدن میں انجانی کسمساہٹیں جاگ اُٹھیں — میرے بالائی ہونٹ پر اُگے سنہری روئیں پسینے میں بھیگ گئے۔ اسے چھونے، محسوس کرنے اور اس کی گود میں سر رکھ کر رونے کے لیے دل مچل گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی یا شاید یہ میرا وہم تھا۔ لیکن نہیں یہ وہم کیسے ہو سکتا تھا؟ اس کی شفیق مسکراہٹ ایک سچائی تھی۔ اور میں سر سے پاؤں تک عرقِ ندامت میں ڈوب گیا — پھر مجھ سے وہاں ٹھہرا نہیں گیا — اور میں تیز، تیز قدموں سے چلتا ہوا اس سے دُور نکل آیا — ایک بار پھر میں نے مُڑ کر دیکھا۔ وہ اب وہاں نہیں تھی۔ شاید مندر کے اندر جا چکی تھی۔ لیکن میری آنکھوں میں اس کا عکس قید ہو گیا تھا — میں بار، بار اس جگہ گیا — لیکن وہ دوبارہ نظر نہیں آئی — شاید میرے مَن کا میل میری آنکھوں میں ہوس بن کر اُتر آیا تھا۔ جس کو دیکھ کر وہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے دور چلی گئی تھی — اس کی یاد — اس کا انتظار — اب یہی میرا سہارا تھا — یہ سلسلہ نہ جانے کب تک چلتا کہ ایک بار بالکل اچانک — وہ پھر میرے سامنے تھی — اس بار اس کا روپ بدلا ہوا تھا۔ اس کی ادائیں محبوبانہ تھیں — لبوں پر تبسّم، آنکھوں میں لگاوٹ اور بدن کے نشیب و فراز میں دعوت تھی۔ اس کے پاؤں میں گھنگھرو بندھے تھے۔ اور وہ محفل میں دعوتِ عام کا منظر بنی اپنی مسکراہٹیں تقسیم کر رہی تھی — نقرئی ہنسی کی سوغات بانٹ رہی تھی — اور قاتل اداؤں کے جام پیش کر رہی تھی — اس کا حسن بجلیاں گرا رہا تھا۔ اور میں دامن جلنے سے پہلے ہی وہاں سے اُٹھ گیا — مجھے ڈر تھا کہ اگر کچھ دیر اور اس کے سامنے رہا تو ہوش و خرد کا دامن ہاتھ سے چھوٹ

جائے گا۔ میں وہاں سے دور — بہت دور بھاگ گیا — اُف میں نے کیا سوچا تھا — اور وہ کیا نکلی؟۔ یہ اس کے ماتھے کی بندیا اور مانگ کا سیندور کس نے نوچ ڈالا — اور آلتا کی لالی مٹا کر اس کے پاؤں میں گھنگھرو کس نے باندھ دیئے۔ اس کے ہاتھوں سے پوجا کی تھالی کس نے چھین لی؟ ان سوالوں کا جواب کون دیتا؟ مندر سے کوٹھے تک کا راستہ اتنا مختصر تو نہیں تھا — کہ وہ احتجاج بھی نہ کر سکے؟ — مجھے خود سے گھن آ گئی — اور میں نے اسے بھول جانے کا عہد کیا — لیکن بھول نہ سکا۔ اب تو جب بھی اس کا خیال آتا تو سارے پیشِ منظر — پسِ منظر میں چلے جاتے۔ بس دو پاؤں ذہن کے پردے پر تھرک اُٹھتے — اور میری چھاتی کو روند کر لہولہان کر دیتے۔ میں اذیت سے چیخ اٹھتا — عورت کا یہ روپ میرے لیے نیا بھی تھا — اور قابل نفرت بھی — اب میں اس کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھتا تھا — تب ہی ایک روز وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ سر سے پاؤں تک سفید گاؤن میں ملبوس اس کے بال سفید ریشمی اسکارف میں قید تھے۔ اور جالی کے سفید نقاب نے اس کا نصف چہرہ چھپا رکھا تھا۔ عصمت، طہارت اور پاکیزگی کا ایک مرقع میرے روبرو تھا — اس کی موی انگلیوں میں بلوریں شمعدان تھا — اور شمعدان میں ایک سفید موم بتی روشن تھی جس کی ضو اس کے چہرے کو منور کر رہی تھی۔ وہ آہستہ قدموں سے گرجا کے ہال میں داخل ہوئی — اور میں اپنی نفرت، غصہ اور عہد بھول کر اس کے ساتھ کھنچا چلا گیا۔ گرجا کا وسیع و عریض ہال لوگوں سے لبالب بھرا ہوا تھا — صف در صف کھڑے ہوئے لوگ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آ رہے تھے۔ سامنے بنے ہوئے اونچے ڈائس پر سفید چوغہ میں ملبوس فادر کھڑے تھے۔ ان کے سینے پر روپہلی صلیب چمک رہی تھی۔ جو دنیا والوں کو امن و آشتی کا پیغام دے رہی تھی۔ فادر کے ہاتھوں میں مقدس بائبل تھی۔ وہ نرم و شیریں آواز میں بائبل پڑھ رہے تھے۔ فادر کے عقب میں دیوار پر یسوع مسیح اور ماں مریم کی تصویریں آویزاں تھیں — میری نظریں ماں مریم کی تصویر پر مرکوز ہو گئیں — ان کی گود میں ننھا مسیح مسکرا رہا تھا — اور نور کے ہالے میں ماں کی ممتا بھری مقدس مسکراہٹ مجھے مسحور کر رہی تھی — اور میری متلاشی نگاہیں اس کو تلاش کر رہی تھیں جو ماں مریم کا عکس تھی — اور پھر میں نے اسے

دیکھ لیا۔ وہ پہلی صف میں کھڑی تھی — لبوں پر وہی ملکوتی مسکراہٹ اور چہرے کے گرد ویسا ہی نور کا ہالہ — گویا ماں مریم تصویر سے باہر نکل آئی ہو۔ لیکن میں یہاں الگ تھلگ کھڑا ہوا کیا کر رہا ہوں؟ مجھے تو اس کی آغوش میں ہونا چاہئے تھا۔ اس مقدّس آغوش میں جس کی تلاش میں برسوں سے در — در بھٹک رہا تھا — اور بڑی تگ و دو کے بعد اسے پانے میں کامیاب ہوا تھا۔ آج مجھے عورت کا ہر روپ سندر لگ رہا تھا — خواہ اس کے پاؤں میں گھنگھرو ہوں یا آلتا کی لالی — نفرت اور غصّے کا بحرِ بیکراں جو درد بن کر میری رگوں میں بہہ رہا تھا۔ اور آتش فشاں بن کر سینے میں دہک رہا تھا — یکا یک برفانی گلیشیر بن گیا۔ اور ایک خوش گوار سی ٹھنڈک میرے رگ و پے میں سرائت کر گئی — اب مجھے زندگی سے کوئی شکوہ نہیں تھا — خود رو پودے کو ممتا کی گھنی چھاؤں مل گئی تھی — اور میں ہر پل ہر لمحہ سرشار رہنے لگا تھا۔ لیکن یہ کیفیت بھی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ کیونکہ اس بار وہ مجھے عجب حال میں نظر آئی۔ اس کا حلیہ دیکھ کر میں کانپ اُٹھا۔ مجھے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا۔ مانگ کا سیندور پاؤں میں بندھے گھنگھرو — اور ہاتھوں میں دباشمعدان خواب بن گئے — وہ ایک حقیقت بن کر میرے سامنے موجود تھی — تقریباً نیم برہنہ اور نیم پاگل سی۔ اس کے بال میل سے چکٹ اور الجھے ہوئے تھے۔ کرتا جگہ جگہ سے مسکا ہوا تھا۔ تار تار اوڑھنی گلے میں جھول رہی تھی — خشک ہونٹوں پر خون کی پپڑیاں جمی تھیں۔ وہ چہرہ جو — کبھی گلاب کو شرماتا تھا، خراشوں سے داغ داغ تھا — اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے کسی قیامت کا پتہ دے رہے تھے — اس کے بدن کا ہر زخم پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ وہ وحشی درندوں کی بربریت کا شکار ہوئی ہے۔ دھول، کیچڑ اور آبلوں سے اٹے پاؤں، آلتا اور گھنگھروؤں سے بے نیاز تھے — اور اپنی طویل مسافت کی داستان سنا رہے تھے۔ ننگی کلائیوں پر انسانی ستم کی کہانی رقم تھی — ہری کریلیاں اور سنہری بانکیں ظلم کے صحرا میں کرچی کرچی ہو کر بکھر چکی تھیں۔ میں اس کی حالت دیکھ کر کانپ گیا۔ اور بے اختیار اس کے قریب چلا گیا اور اس کی ننگی کھردری بانہہ تھام لی۔ اس نے زخمی نظروں سے مجھے دیکھا — ان نظروں میں شک، خوف اور التجا کیا کچھ نہ تھا۔ میں خود کو مجرم سمجھنے پر مجبور ہو گیا دل چاہا کہ دوڑتا ہوا گرجا کے وسیع ہال میں جاؤں اور فادر کے

سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کروں کہ ابھی توبہ کا در بند نہیں ہوا ہوگا۔ یسوع مسیح اور ماں مریم کے سامنے دوزانو ہو کر اقرار کروں کہ اپنی ماں کی اوڑھنی تار تار کرنے والا وحشی درندہ میں ہی ہوں۔ مجھے سزا دو — سنگسار کرو — مار ڈالو — کہ میں اسی لائق ہوں — ہاں میں ماں کی ممتا کے قابل نہیں ہوں —

میں اسے سہارا دے کر گھر کے اندر لایا۔ اس کا منہ ہاتھ دھلایا — اس کا لباس تبدیل کیا۔ اس دوران وہ بالکل خاموش رہی۔ شاید اس کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ تب ہی تو اس نے میری کسی حرکت پر احتجاج نہیں کیا۔ یا پھر شرم وحیا اور پاکیزگی کا تصور ہی اس کے لیے بے معنی ہو گیا تھا۔ جب جب اس نے رحم کی بھیک مانگی ہوگی انجام میں نئے زخم ملے ہوں گے سو اس نے چپ رہ کر اپنی روح کے زخم چھپا ڈالے ہوں گے۔ جب روح زخمی ہو تو جسم کے گھاؤ زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔

میں نے اس کے بالوں میں کنگھا کرنے کے بعد اسے آئینے کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ دراصل میں اسے یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ اب بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ پاک و پاکیزہ معصوم اور مقدس، لیکن وہ ایک چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئی شاید وہ خود کو پہچاننے سے انکار کرنا چاہتی تھی۔ اپنی ذات اور اپنے وجود کے خلاف یہ اس کا پہلا احتجاج تھا اور یہ احتجاج اس کی زندگی کی علامت تھا۔ میں اسے بچوں کی طرح تھپکتا رہا — جب وہ رو رو کر تھک گئی تو چپ ہو گئی۔ اس کی زبان اب بھی خاموش تھی — لیکن آنکھیں بول رہی تھیں۔ تشکر ممتا اور پیار کے سارے رنگ اس کی آنکھوں میں اتر آئے تھے۔ اور لبوں پر ملکوتی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اس کے پُرسکون چہرے کے گرد نور کا ایک ہالہ تھا — میں بے اختیار اس کے سینے سے لگ کر رو دیا۔

کڑے کوس کا سفر طے کر کے آنے والی یہ عورت مجھے ہر حال میں ہر روپ میں قبول تھی۔ کہ عورت، مرد کی تخلیق کا سرچشمہ بھی ہے۔ اور مرد کی تکمیل بھی —

میں بھی آج مکمل ہو گیا تھا —

☆☆

شناسائی

اس بلڈنگ میں آئے اسے ایک ماہ سے کچھ اوپر ہوا تھا۔لیکن ابھی تک اس کی کسی سے جان پہچان نہیں ہوئی تھی — سیڑھیاں چڑھتے اترتے اکثر کوئی نہ کوئی نظر آجاتا۔اور وہ یہ سوچتا رہ جاتا کہ یہ مسٹر ایرانی ہیں — یا میٹھا بھائی — یا مسٹر نعیم صدیقی — یا — اور پھر ایک ایک کر کے وہ سارے نام ذہن میں در آتے جنہیں وہ بلڈنگ کے باہر لگے ہوئے بورڈ پر دسیوں بار پڑھ چکا تھا۔سوسائٹی والوں نے تو بلڈنگ کے مکینوں کے نام مع ان کے فلیٹ نمبر کے اجنبیوں کی سہولت کے لئے ہی لکھ کر لگائے ہوں گے۔لیکن اس کی الجھن میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔جب بھی کوئی صورت نظر آتی وہ اس پر اپنی پسند کا نام چسپاں کر کے خود ہی حظ اٹھاتا۔مثلاً گنجے تو ندیل پر اس نے میٹھا بھائی کا نام فٹ کر رکھا تھا — لیکن تھوڑے دنوں کے بعد اسے پتہ چلا کہ وہ تو مصرا جی ہیں۔مقطع داڑھی والے جن کو وہ نعیم صدیقی کہتا تھا — مسٹر اسرانی نکلے — اور وہ کافی دن تک اس شغل سے خوب محظوظ ہوا — لیکن کب تک — ؟ — آخر تھک کر بیٹھ گیا — پھر ایک دن اس نے دلچسپی کا ایک انوکھا طریقہ سوچا۔ میٹھا بھائی کے جسم پر تو ندیل مصرا جی کا چہرہ فٹ کر کے دیکھا۔منحنی سے حاتم بھائی کے جسم پر مسٹر اسرانی کی صورت بٹھائی اور مسٹر اسرانی کے جسم پر بوتل والا کی پھٹکار ذرہ شکل تھوپی۔ کچھ دن تک یہ شغل جاری رہا۔اب اس میں بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تو بس شکلیں دیکھنے پر اکتفا کرنے لگا — اگر یہ سارے فلیٹ آباد نہ ہوتے اور ہر گھر میں زندگی کے آثار نظر نہ آتے۔تو شاید وہ بھی صبر کر کے ان سارے پڑوسیوں کا خیال چھوڑ دیتا — جو زندہ رہ کر بھی

زندگی سے عاری معلوم ہوتے تھے — ایسا بھی نہیں تھا کہ اس نے ان نام نہاد پڑوسیوں سے متعارف ہونا نہ چاہا ہو۔ کئی بار ان میں سے کسی کو دیکھ کر اس نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائی کسی کو 'ہیلو' کہا — کسی سے پوچھا "شاید آپ نو نمبر فلیٹ میں رہتے ہیں؟" لیکن اس کی ہر بات کے جواب میں سارے چہروں پر خاموشی کا تالا لٹکتا نظر آیا۔ اکثر یہ بھی ہوا کہ وہ چھٹی والے دن گھر کی تنہائی سے گھبرا کر — گیلری میں مونڈھا ڈالے بیٹھا اخبار پڑھتا رہا۔ دو چار ہاتھوں نے اس سے اخبار لے کر دیکھا اور اپنی راہ چل دیئے۔ اس روز بھی دفتر میں تعطیل تھی — اس نے سگھڑ بیبیوں کی طرح گھر کی صفائی کی کپڑے دھوئے کھانا پکایا۔ اور سب کاموں سے نمٹ کر ذرا ستانے کے لئے ایک کتاب لے کر بیٹھ گیا — ابھی آدھا دن گزرا تھا وقت کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ طبیعت میں اکتاہٹ ہو تو لکھنے پڑھنے میں بھی دل نہیں لگتا — کتاب کے صفحوں کے صفحے الٹ ڈالے لیکن ایک لفظ نہ پڑھ سکا۔ اچانک قریبی فلیٹ سے رونے اور چیخنے کی آوازیں آنے لگیں وہ اٹھ کر دروازہ پر آیا۔ رونے کا شور نعیم صاحب کے گھر سے آ رہا تھا۔ اس نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا — تو ایک خاتون نے دروازہ کھولا —

"کیا بات ہے خیریت تو ہے؟" اس نے پوچھا —

وہ ببلو کے سر میں چوٹ آ گئی ہے۔ اور گھر میں اس قت کوئی مرد نہیں ہے۔

"خاتون نے بتایا —

"مجھے دیکھنے دیں" اور وہ ان کا جواب سنے بغیر اندر چلا گیا۔ ببلو کو گود میں لئے دوسری خاتون بیٹھی تھیں۔ اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ کچھ کہنے سننے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے پاس پڑا ہوا تولیہ لے کر بچّے کے زخم پر رکھ کر ہاتھ سے دبایا۔ اور اسے گود میں لے کر جلدی سے باہر آیا۔ پھر ٹیکسی میں اسے لے کر اسپتال گیا — ایمرجنسی میں بچّے کے زخم پر ٹانکے لگائے گئے۔ اور ضروری ٹریٹ منٹ کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے اسے فی الحال ایڈمٹ کر لیا تھا۔ اس نے بلڈنگ کے چوکیدار کو فون کر کے نعیم صاحب کو اطلاع دینے کی تاکید کی۔ شام سے پہلے نعیم صاحب — دونوں خواتین کے ہمراہ اسپتال آ گئے۔ اس نے ان

کے بغیر پوچھے ہی ببلو کا حال بتا کر تسلّی دی۔ پھر ان سے اجازت لے کر گھر چلا آیا۔ اسے خوشی تھی کہ وہ اپنے پڑوسی کے کام آیا۔ پھر جتنے دن ببلو اسپتال میں رہا— وہ پابندی سے اسے دیکھنے جاتا رہا— اور اس کے لئے پھل اور چاکلیٹ وغیرہ بھی لے جاتا رہا— نعیم صاحب سے بھی ببلو کے تعلق سے ایک آدھ بات ہو جاتی تھی— شناسائی کے لئے گو یہ حادثہ خوش گوار انہیں کہا جا سکتا تھا۔ تاہم وہ اپنے دل میں خوش تھا کہ کسی طرح سہی ایک پڑوسی سے کچھ جان پہچان تو ہوئی۔

ببلو کو اسپتال سے چھٹّی ہوگئی اور وہ گھر آ گیا اسے بھی یک گونہ اطمینان ہوا۔ اس دن زینہ چڑھتے ہوئے نعیم صاحب نظر آئے تو اس نے چاہا کہ انہیں روک کر ببلو کی خیریت پوچھ لے۔ لیکن نعیم صاحب اس کی طرف دیکھے بغیر سیڑھیاں اترتے چلے گئے۔ اور جان پہچان ہونے کی خوشی آنِ واحد میں کافور ہوگئی۔

شہر کی فضا کئی دن سے تناؤ پورن تھی— ایک اتفاقی حادثے کو فرقہ وارانہ رنگ دے کر اچھی بھلی فضا کو مسموم کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ آخر یہ کوششیں رنگ لائیں۔ اور فساد پھوٹ پڑا اس کا علاقہ بھی فساد کی زد سے محفوظ نہ رہا— پولیس کے اعلیٰ افسران نے فساد زدہ علاقوں میں کرفیوں لگا دیا— دو تین روز تک مسلسل کرفیو لگا رہا تو بیشتر گھروں میں ضروریات کی چیزوں کی کمی کی وجہ سے ہائے توبہ مچ گئی۔ اس کی بلڈنگ میں روزانہ دودھ انڈے اور ڈبل روٹی پہنچانے والے نہیں آئے۔ سبزی کے ٹھیلے بھی غائب ہوگئے۔ لوگ اپنے گھروں میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ اسے تو خیر پریس کی گاڑی لینے اور پہچانے آتی تھی۔ اور اسے کرفیو پاس بھی ملا تھا۔ اس نے دوڑ دھوپ کر کے دوسرے علاقوں سے سے دودھ کے پیکٹ، ڈبل روٹی و سبزی وغیرہ فراہم کی اور بلڈنگ کے فلیٹوں میں مطلوبہ سامان پہچایا — پھر تو کاموں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ مصرا جی بیمار تھے۔ ان کی دوائیں لانے کی ذمّے داری اس نے خود لے لی ناگر جی کی بہو کو دردِ زہ شروع ہوا تو وہ دفتر کی گاڑی میں اسے نرسنگ ہوم لے گیا— میٹھا بھائی کو کسی کام سے شہر کے باہر جانا تھا۔ اس نے انہیں اسٹیشن پہنچایا۔ بوڑھی کاکی کے پیروں میں گھٹیا کا درد بھی انہیں دنوں اٹھنا تھا۔ ان کے لئے مالش کا

تیل اور دوائیں بھی لاکر دیں۔ چوکیدار کے لئے نسوار کا انتظام بھی کیا۔ لگتا تھا کہ بلڈنگ والوں کی پریشانیاں۔ بیماری اور دکھ درد کرفیو لگنے کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے پانچویں دن کرفیو میں دو گھنٹے کی ڈھیل دی گئی۔ پھر دن کا کرفیو ختم ہوا۔ رفتہ رفتہ شہر کے حالات معمول پر آ گئے۔ اور زندگی کے معمولات پہلے کی طرح نارمل ہو گئے۔ ساتھ ہی پڑوسیوں کے رویئے میں بھی تبدیلی آ گئی — اب کسی کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ لوگ جو اپنی ہر ضرورت کے لئے اس کا منہ دیکھتے تھے۔ ایک بار پھر اجنبی بن گئے۔ وہ تو حیران بھی نہ ہو سکا کیونکہ وہ ان باتوں کا عادی تھا۔

کئی دن سے وہ بخار میں مبتلا تھا — دفتر سے چھٹی لے رکھی تھی — شروع میں تو دو تین بار خود ہی ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اور دوائیں پھل اور خورد و نوش کا سامان لے آیا۔ لیکن پچھلے دو دن سے اس کی طبیعت زیادہ خراب تھی کمزوری کا یہ حال تھا کہ بستر سے اٹھ کر چائے تک بنانا محال تھا۔ پھر تو اسے اپنا ہوش ہی نہ رہا — دودھ والا — اور اخبار والا اپنا فرض ادا کر چکے تھے۔ بلڈنگ کے ہر فلیٹ میں اس کی بیماری کی خبر پہنچ چکی تھی۔ لیکن کس کو فرصت تھی جو آ کر اس کا حال چال پوچھتا — یا دوا — دارو اور کھانے پینے کا خیال رکھتا — میٹھا بھائی کے پوتے کا نام کرن تھا — ان کے فلیٹ میں دن رات ڈھولک بج رہی تھی — ناگر جی ان دنوں بلڈنگ کی طرف سے ہونے والے دیوی جاگرن کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ بوتل والا کی دیسی شراب کی پیٹیاں پکڑی گئی تھیں وہ بھی اپنے حالوں سے پریشان تھے — نعیم صاحب، مصرا جی، یعنی بلڈنگ کے تقریباً سب لوگ بے حد مصروف تھے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی بیماری سے لاعلم ہوں۔ چلتے پھرتے۔ آتے جاتے ایک دوسرے سے اس کا حال، چال پوچھتے تھے — یا خود ہی اس کی بیماری کی اطلاع دوسروں کو دے کر اپنا فرض نبھاتے تھے۔ وہ کس حال میں ہے اس کی کسی کو فکر نہیں تھی۔ خدا جانے یہ بے ہوشی کتنی طویل تھی — اس نے آنکھیں کھولیں تو ایک اجنبی چہرہ اس کے سامنے تھا۔ جھریوں بھرے چہرے پر شفیق مسکراہٹ بچھی ہوئی تھیں — اور دھنسی ہوئی آنکھوں میں شناسائی کی چمک تھی۔

''کیسی طبیعت ہے بابو—؟''

اور پھر اس کا جواب سنے بغیر اس نے بہت آہستہ سے بے حد پیار سے اس کا سر اٹھایا۔ اور اپنے سہارے اسے بٹھا دیا—

''لو یہ دودھ پی لو۔'' اس نے نیم گرم دودھ کا کپ اس کے منہ سے لگا دیا—

''ڈاکٹر ابھی تمہیں دیکھ کر گیا ہے۔ سوئی لگا دی ہے کہہ رہا تھا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ڈٹ کر کھاؤ پیو گے تو کمزوری دور ہو جائے گی۔ پورے دو دن بے ہوش رہے ہو۔ وہ تو اچھا ہوا کہ دودھ والے بھیّا نے مجھے بتا دیا۔ اور میں ڈاکٹر کو لے آیا''—

''بابا— تم—؟''

اسے شرمندگی ہوئی کہ وہ اس مہربان بوڑھے کو نہیں پہچان سکا یقیناً اس کے ہوش و حواس جواب دے گئے ہیں۔ ورنہ شناسائی کا تعلق اتنا کمزور نہیں ہوتا۔

''بابو میں خدا بخش ہوں۔ بلڈنگ کے سامنے والی فٹ پاتھ پر بیٹھتا ہوں۔ کرفیو کے دنوں میں تم نے مجھے کئی بار ڈبل روٹی اور دودھ کا پیکٹ دیا تھا— کچھ یاد آیا—؟—

مہربان اجنبی نے یاد دلایا—

''خدا بخش—'' اس نے ذہن پر زور دیا۔ اور اس کی نظروں کے سامنے وہ بوڑھا بھکاری آ گیا۔ جس کو ترس کھا کر کرفیو کے دنوں میں کچھ کھانے پینے کو دیا تھا۔ اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں ایسی ہی چمک تھی۔

اسے محسوس ہوا کہ پوری دنیا میں ایک بس وہی اس کا شناسا ہے۔ اجنبی چہروں کی بھیڑ میں وہ ایک چہرہ۔ اپنا اپنا سا— مانوس سا۔ شناسائی کی چمک لئے ہوئے وہ آنکھیں بڑی ہوتی گئیں— پھیلتی گئیں— اور پھر پوری کائنات ان آنکھوں میں سما گئی۔

اس نے دھیرے سے آنکھیں موند لیں۔ آسودگی کی ٹھنڈی لہر اس کے رگ و پے میں پھیل گئی— یہ اطمینان کیا کم تھا کہ اب وہ تنہا نہیں ہے—

☆☆

ہمیں جینے دو

اسپتال کے پچھواڑے بنے ہوئے بڑے سے حوض میں کوڑے کرکٹ کا انبار لگا تھا۔ٹوٹی ہوئی بوتلوں، خون آلود پٹّیوں اور کٹے ہوئے پلاسٹر کے خولوں کے ڈھیر میں ننھے — منّے آدھے ادھورے جسم بھی پڑے تھے — یہ بے جان گوشت کے لوتھڑے — دنیا والوں کی بے رَحمی اور سفّا کی کی داستان سنا رہے تھے۔ پھولے ہوئے پپوٹوں تلے بند آنکھوں نے دنیا کا نظارہ کرنے سے پہلے ہی اپنی جوت کھودی تھی — پنکھڑی جیسے لبوں پر ابھی زندگی کی اوّلین مسکراہٹ بھی نہیں کھیلی تھی کہ انہیں موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا تھا — اوران کی پہلی چیخ کو باہر آنے سے پہلے ہی دبا دیا گیا تھا۔ ننھے ننھے ہاتھ پاؤں، اکڑی ہوئی گردن، مسخ چہرے، نامکمل پیکر خدا کی مخلوق ہونے کا دعوہ کیسے کرتے؟ وہ تو کوڑے کے ڈھیر میں تمام ناکارہ اور نا قابلِ استعمال چیزوں کے بیچ میں پھینک دیئے گئے تھے۔اوراپنے ہونے کا غم منا رہے تھے۔

ایک ننھے سے ہاتھ نے اپنے قریب پڑے ہوئے جسم کو چھو کر محسوس کیا۔

''تم کب یہاں آئے؟'' اس نے سوال کیا —

''آج ہی آیا ہوں'' دوسرے جسم نے جواب دیا —

''میں تو کئی دن سے یہاں ہوں — اب تو میرا جسم بھی بدبو دینے لگا ہے'' —

''تم کیسے یہاں آ گئے — لو پہلے میں ہی بتائے دیتا ہوں کہ میں کیسے آ گیا۔ یوں تو میرے — بلکہ ہم سب کے پیدا ہونے میں ہماری خواہشوں کا دخل نہیں ہوتا — لیکن پھر

بھی ایک طرح کی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ دنیا میں آنے کی مسرّت — ایک اُلوہی لذّت، ایک نیا تجربہ لیکن میرے باپ کو میری ضرورت نہیں تھی۔ اس پر تو دولت کمانے کی دھن سوار تھی۔ اونچا اسٹیٹس — اور پوزیشن حاصل کرنے کا لالچ تھا — جو اسے میری ماں ہی دلا سکتی تھی اور بچّوں والی عورت اسے یہ سب نہیں دے سکتی تھی۔ اس لئے اس نے دھوکے سے میری ماں کا ابارشن کرا دیا اب وہ بڑی آسانی سے امپورٹ، اکسپورٹ کا لائسنس حاصل کر سکتا ہے اور راتوں رات اپنا بینک بیلنس بڑھا سکتا ہے۔ میری ماں کو جب اس راکھشس کے ظلم کا پتہ چلا ہوگا تو اس نے رو۔ رو کر اپنا برا حال کر لیا ہوگا — میں آج بھی اس کے محبت بھرے ہاتھوں کا لمس محسوس کر رہا ہوں۔ وہ جب کام کاج سے فرصت پا کر سونے کے لئے لیٹتی تھی تو بڑے پیار سے آہستہ آہستہ پیٹ پر ہاتھ پھیر کر مجھے محسوس کرتی تھی۔ میں اس کا اتنا پیار پا کر نہال ہو جاتا تھا — میں بھی گھوم، گھوم کر اسے اپنے ہونے کا یقین دلاتا تھا — ہم ماں بیٹے اس کھیل سے خوب لطف اٹھاتے تھے — لیکن اس وحشی اور ظالم انسان نے میری ماں کی خوشیوں کا گلا گھونٹ دیا" —

بچّہ سسکنے لگا تو اس کے قریب پڑا ہوا ٹیڑھا میڑھا جسم اس کے نزدیک سرک آیا، اور ہمدردی سے بولا — "

"مت رو بھائی! تم باپ کی بے رحمی کا رونا رو رہے ہو — میں اپنی ماں کے ہاتھوں قتل ہوا ہوں — کیا پہلے بھی کبھی ایسا سُنا تھا کہ ایک ماں نے اپنے بچّے کو اپنے ہی ہاتھوں سے قتل کر دیا ہو —؟ مگر میری ماں نے یہ کارنامہ کر دکھایا — سوچو، وہ کیسی ڈائن ہوگی — اسے تو ماں کہنا ہی اس پاک رشتے پر کلنک لگانا ہے"

"کوئی پریم وریم کا چکّر تو نہیں تھا، اور اس چکّر میں تم بن بُلائے ہی قبل از وقت تو نہیں آ گئے تھے —؟"

"نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں تھی — میرے ماں باپ کا بیاہ تو اتنی دھوم دھام سے ہوا تھا کہ کئی مہینے تک شہر میں اس کا چرچا رہا تھا — دونوں ہی خاندانی لکھ پتی تھے — پورے چھ مہینے تک تو بیاہتا جوڑے کا منی مون چلتا رہا۔ آدھی دنیا گھوم آئے دونوں — لیکن

اس ہنی مون کا سارا مزہ کرکرا ہوگیا— جب گھر آتے ہی ماں کو متلی اور چکّر نے پریشان کردیا۔ وہ ماڈرن عورت بہت جز بز ہوئی۔ اس کو دنیا میں ہر چیز سے زیادہ خود سے پیار تھا— اس کو ہر دم اپنی 'فیگر' کا خیال رہتا تھا— ہفتے میں صرف ایک بار کھانا کھاتی تھی۔ ورنہ جوس دہی— اور پھلوں پر گزارا کرتی تھی— ہیلتھ کلب اور بیوٹی پارلر میں اس کا وقت زیادہ گزرتا تھا۔ وہ ایک لمبے عرصے تک خوبصورت اور جوان رہنا چاہتی تھی— جبکہ آنے والا بچّہ — یعنی میں اس کی جوانی اور خوبصورتی کا دشمن تھا۔ روز ماں باپ میں جھگڑا ہوتا تھا— کیونکہ باپ کو بچّہ چاہئے تھا۔ لیکن وہ نہیں مانی۔ پہلے تو اس نے ڈھیر ساری دوائیں کھائیں— جب اس سے بھی کچھ نہ بنا تو آپریشن کرالیا۔ اور اب میں اس کی مہربانی سے اس کوڑے کے ڈھیر پر پڑا ہوں— "— اور وہ کسی ہیلتھ کلب یا بیوٹی پالر میں ٹھاٹ سے بیٹھی اپنی خوبصورتی اور جوانی قائم رکھنے کے گُر آزما رہی ہوگی"۔

بچّے نے ٹھنڈی سانس بھری اور چُپ ہوگیا— "کیا ناجائز بچّے دن بلائے ہی اس دنیا میں آتے ہیں؟" ایک ننھی سی آواز نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی— پلاسٹر کے ٹکڑوں کے درمیان سے ایک جسم جھانک رہا تھا۔ بلکہ اسے انسانی جسم کہنا ہی ایک مذاق تھا۔ وہ تو بس نرم نرم گوشت کا ایک لوتھڑا تھا۔ ہاتھ اور پاؤں کے مقام پر اکھوے سے پھوٹتے لگتے تھے— اور سر نام کی چیز کا پتہ ہی نہیں تھا— وہاں پر گوشت کی ایک چھوٹی سی گانٹھ سی تھی— اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ بے چارے کو ماں کی کوکھ میں رہنے کا زیادہ موقع ہی نہیں ملا— سب نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا تو اس نے اپنی بپتا سنائی—

"ایک مرد نے ایک بھولی بھالی لڑکی سے شادی کا وعدہ کیا۔ اور پھر اس کی خوبصورتی، لوٹ کر چلا گیا۔ صدیوں پرانی کہانی ایک بار پھر دہرائی گئی۔ گناہ کا کیڑا لڑکی کے جسم میں پلنے لگا۔ لڑکی کے ماں باپ کو کچھ سُن گُن ملی تو انہوں نے اس کی شادی دوسری جگہ ٹھہرادی— اب بے چاری اپنے شوہر کے لئے ایک ناجائز بچّہ کا تحفہ کیسے لے جاتی؟ ایک ڈاکٹرنی کو موٹی سی رقم دے کر مجھے— یعنی اس گناہ کے 'کیڑے' کو لڑکی کے جسم سے نکال کر یہاں پھینک دیا گیا— میرا کیا قصور تھا جو مجھے یہ سزا دی گئی"—

گوشت کا لوتھڑا بے آواز رو دیا—

"غم نہ کرو بھائی— اس سنسار میں سب کچھ ممکن ہے— مجھے دیکھو— میں تو جائز اولاد تھی— لیکن مجھے اس لئے دنیا میں آنے سے روکا گیا کہ میں لڑکی تھی اور میرے ماتا پتا کو لڑکے کی آرزو تھی۔ اس لئے انہوں نے ایک بھاری رقم خرچ کر کے یہ معلوم کیا کہ آنے والا بچّہ لڑکی ہے یا لڑکا؟— اور جب ڈاکٹروں نے ماں کا چیک اپ کر کے تصدیق کر دی کہ ان کے شکم میں پلنے والا بچّہ لڑکی ہے— تو پھر انہوں نے یہ بھی پرواہ نہیں کی کہ میں ان کی پہلی اولاد ہوں۔ جھٹ آپریشن کرا دیا— جب سے جنس کا پتہ لگانے والی مشین آئی ہے۔ حاملہ عورتوں کی لمبی لائن لگی رہتی ہے۔ سب کو اپنے ہونے والے بچّے کی جنس کی فکر ہے۔ سب کو لڑکا چاہئے— کسی کو لڑکی کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے تو لڑکی کو صرف بوجھ ہی سمجھا جاتا تھا— لیکن اب تو اسے کینسر سے زیادہ خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ جیسے کینسر کا پتہ چلتے ہی اس کا آپریشن کرا کے جسم سے الگ کر دیا جاتا ہے اسی طرح بچّے کی جنس کا پتہ لگتے ہی 'لڑکی' کو ماں کے جسم سے کاٹ کر نکال لیا جاتا ہے۔ میری طرح سیکڑوں لڑکیاں پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم کی جا رہی ہیں۔ کبھی کسی نے یہ بھی سوچا ہے کہ جب اس سنسار میں ہر طرف لڑکے ہی لڑکے ہوں گے تو انسانی نسل کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ پھر کیا ہوگا؟"

"میں تمہاری کہانی سنتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ لڑکیوں کو پال پوس کے جوان کر کے ماتا پتا دان جہیز دے کر بیاہ دیتے ہیں— اور پھر انہیں زیادہ جہیز کے لئے اذیتیں دی جاتی ہیں— اور جب مطالبات پورے نہیں ہوتے— تو انہیں جلا کر مار ڈالا جاتا ہے۔ اس سے تو اچھا ہی ہے کہ لڑکیوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم کر دیا جائے۔ کم از کم ماں باپ کو جوان اولاد کا دُکھ تو نہیں سہنا پڑے گا"۔

ایک پیاری سی بچّی نے گہرے دُکھ سے کہا— گھنگھریالے بالوں والی یہ بچّی اتنی مکمّل تھی کہ اگر اسے چند ہفتے اور ماں کے شکم میں رہنے دیا جاتا تو وہ بے حد خوبصورت اور تندرست بچّی ہوتی— اسے دیکھ کر لگتا کہ اس کی ماں بھی بہت سُندر ہوگی۔ جب ہی تو وہ بھی ایسی کومل اور سُندر ہے۔ سب بچّوں کو اس سے ہمدردی تھی۔ لیکن وہ تو ایک ہی ناؤ میں

سوار تھے — دوسروں کے لئے کر بھی کیا سکتے تھے — سوا ہمدردی اور غم گساری کے —

تم پر کیا بپتا پڑی پیاری بچّی ؟'' کسی نے پوچھا —

''میری ماں جہیز کم لائی تھی — نہیں — نہیں جہیز میں تو اسے ڈھیر سارا سامان ملا تھا — نقد رقم بھی تلک کے سمئے دی گئی تھی — لیکن بیاہ کے سمئے جہیز کے لالچی اپنی بات پر اڑ گئے — کہ لڑکے کو موٹر سائکل چاہئے — میرے نانا جی نے بڑی مشکلوں سے بیاہ کا انتظام کیا تھا — بے چارے گلے۔ گلے قرض میں ڈوب گئے تھے۔ اس وقت تو لوگوں کے دباؤ میں آکر انہوں نے موٹر سائکل دینے کا وعدہ کر لیا — لیکن وہ اس وعدے کو پورا نہ کر سکے — ماں کو آئے دن جہیز کی کمی کا طعنہ دیا جاتا — اور موٹر سائیکل نہ ملنے پر مارا پیٹا جاتا — وہ چپ چاپ سسرال والوں کے ظلم سہتی رہتی — لیکن غریب اور مجبور باپ سے ، ر بات چھپاتی — پھر ایک روز گھر والوں نے مسکوٹ کر کے میری ماں کو چارپائی سے باندھ دیا — نند نے مٹّی کے تیل کا کنستر اٹھا کر ماں کو تیل سے نہلا دیا — سسر نے ماچس دکھا دی۔ اس سمئے میرا بزدل باپ گھر پر نہیں تھا — اسے پہلے ہی بہانے سے چلتا کر دیا گیا تھا — پھر وہ سب ہی گھر کو تالا لگا کر چلے گئے — میری ماں بے چاری نہ اُٹھ کر بھاگ سکتی تھی — نہ چیخ سکتی تھی — کیونکہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ پڑوسیوں نے گھر سے دھواں اٹھتے دیکھ کر پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس کے آنے تک میری ماں مر چکی تھی۔ اور ظالم اور خونی سسرال والے اسے خودکشی کا کیس بنانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ پولیس کو کھلا پلا کر انہوں نے سب معاملہ حسب منشاء درست کرا لیا تھا۔ میرے نانا بے چارے شک وشبہ کا اظہار نہ کر سکے — کیونکہ میری صابر ماں نے کبھی ان سے اپنے اوپر ہونے والے ظلم وستم اور زیادتیوں کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا تھا — نتیجے میں ظالم اور قاتل صاف بچ گئے۔

میری ماں کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو آپریشن کر کے مجھے نکال لیا گیا — چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ ایک اور لڑکی جل کر مرنے سے بچ گئی۔ میں زندہ رہتی تو میں بھی جہیز کی بھینٹ چڑھ جاتی — اور ماں باپ پر جہیز کا بوجھ پڑتا سو الگ۔ اس لئے جو ہوا شاید ٹھیک ہی ہوا —

اس پیاری سی بچّی کی کہانی سُن کر سارے ادھورے اور مکمل جسم کانپ اٹھے۔
اتنے میں شیشیوں کے ڈھیر سے ایک ننھی سی کھوپڑی نے جھانکا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑی—
اگلے ہی پل اس کا قہقہہ کوڑے والی گاڑی کی گھڑ گھڑاہٹ میں دب گیا۔

رحمان خاں نے گاڑی روکی اور اتر کر بے دلی سے ایک طرف کھڑا ہو کر بیڑی پینے لگا۔ بدلو جمعدار نے مزدوروں کو للکارا— ''جلدی جلدی کام ختم کرو۔ ابھی کئی اسپتالوں کا کام باقی ہے۔ ٹھیکے دار کو کام چاہئے کام''—

مزدوروں کے پھاوڑے چلنے لگے۔ کورا کرکٹ گاڑی میں بھرا جانے لگا—
خیراتی نے اپنے ساتھی سے کہا—

''بھیّا میوہ لال ایک بات پر دھیان دیا ہے؟''—

''کون سی بات بھائی،''—

''کوڑے میں روج بے روج بچّے بڑھ رہے ہیں''—

''ہاں بھیّا— مانو اسپتال میں سارے ڈاگدر بس یہی کام کرتے ہیں'' میوہ لال نے دکھ سے کہا۔ اور ایک چھوٹے سے جسم کو ہاتھوں میں سنبھال کر کوڑے کی گاڑی میں ایک طرف رکھ دیا۔

ذرا سی دیر میں کوڑے کا حوض صاف ہو گیا۔ اور گاڑی سارا کوڑا کرکٹ سمیٹ کر آگے بڑھ گئی—

☆☆

فرشتہ

یہ اس کی ملازمت کا پہلا دن تھا— جی ایم شاہ، انتہائی نیک اور شریف انسان تھے— ویسے بھی ان کی عمر اب شرافت کی حدوں میں آتی تھی یعنی وہ بچپن سے تجاوز کر چکے تھے— سر کے بال درمیان سے اُڑ گئے تھے۔ جسم خاصا فربہ تھا— چھوٹی چھوٹی آنکھیں عینک کے شیشوں کے عقب سے شفقت اور مہربانی کی پھواریں برساتی رہتی— لہجہ انتہائی نرم و شیریں تھا—

انہیں دیکھ کر نمیتا کو اپنے پاپا یاد آجاتے تھے وہ بھی ایسے ہی مہربان اور شفیق تھے۔ ایسی ہی مہربان آنکھیں— اور ایسا ہی نرم لہجہ — لیکن موت کے بیرحم ہاتھوں نے انہیں ہمیشہ کے لئے اس سے چھین لیا— اور ان کی چتا کے ساتھ ہی اس کی مسرتیں بھی جل کر خاکستر ہوگئیں۔

بدنصیبی یہ تھی کہ وہ اپنے والدین کی پہلی اولاد تھی— اور بدنصیبی اس لئے کہ پہلی اولاد اگر لڑکی ہو تو ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر دامنگیر رہتی ہے— لیکن اس کے بابا بے حد روشن خیال تھے— انہوں نے اس کی تعلیم کو مقدم سمجھا کئی رشتے آئے لیکن انہوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیے کہ نمیتا ابھی پڑھ رہی ہے۔ ممی ان کی اس بات پر بہت ناراض ہوتیں— لیکن پاپا نے انہیں یہ کہہ کر سمجھا دیا کہ لڑکی تعلیم یافتہ اور برسرِ روزگار ہو تو زیادہ بہتر رشتے ملتے ہیں۔ پھر ماں باپ کو بھی— اطمینان رہتا ہے کہ ان کی بیٹی کسی کی دست نگر نہیں ہے ممی نے تو ساری عمر ان کی بات مانی تھی— یہ بات بھی مان لی— اور وہ

ٹھاٹ سے پڑھتی رہی—

اس کا بی اے کا رزلٹ نکلا تو پاپا نے اس کی اعلیٰ تعلیم کے منصوبے بنائے۔ اس کی کامیابی کی خوشی میں پارٹی دی۔ اور اس پارٹی میں نیتا پہلی بار کپل سے متعارف ہوئی۔ کپل اس کے پاپا کے دوست کا رشتے دار تھا— پہلی ہی ملاقات میں اس نے نیتا کو پسند کر لیا— اور اس کا اظہار بھی کر دیا— لیکن اس سے پہلے کہ کپل رشتے کی بات کرتا ایک حادثہ میں پاپا کی موت ہو گئی— اور وہ شفیق اور محبت کرنے والی ہستی— ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی—

ماں زمین پر بیٹھی رو— رو کر بین کر رہی تھی—

''ہائے بھگوان اب کیا ہوگا—''؟

''ہمارا بیڑا کیسے پار لگے گا؟''—

— اور نیتا سوچ رہی تھی کہ اسے اپنے پریوار کے لیے کچھ کرنا ہوگا— بھائی چھوٹے ہیں۔ ممی بھی زیادہ لکھی پڑھی نہیں ہیں— سب کچھ اس کے اوپر ہے۔ یہ پریوار اب اس کی ذمّے داری ہے—

— اور کپل''— اس کی آنکھوں کے پیغام؟— اس کا پیار—؟ انہیں بھولنا ہوگا—''—

کپل تعزیت کرنے آیا تو وہ اس کے سامنے بیٹھی خاموشی سے اپنے ناخن کی پالش کھرچتی رہی—

''تم نے کیا سوچا نمّی؟''—

کپل اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھے پوچھ رہا تھا—

''کپل— میں اس وقت صرف اپنے گھر والوں کے لیے سوچ رہی ہوں— اپنے لیے نہیں''—

''میرے لیے بھی نہیں؟''

''دیکھو کپل! حالات اچانک ایسے موڑ پر لے آئے ہیں کہ میں کسی کے لیے کچھ سوچنا نہیں چاہتی میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے— کپل—؟''—

''تم ٹھیک کہتی ہو نمی''—

''تم میری راہ مت دیکھنا کپل—اور بیاہ کر لینا''

''وہ تو بعد کی بات ہے۔نمی—ابھی تو میں کچھ روز کے لیے باہر جا رہا ہوں—میری واپسی تک اگر تمہارا فیصلہ بدل جائے—تو میں—''

—اور کپل چلا گیا—وہ اپنی بی اے کی ڈگری لیے نوکری تلاش کرتی رہی—نہ کوئی اضافی ڈپلوما تھا—نہ ہی تجربہ—ہر انٹرویو میں سیکڑوں لڑکیاں آتیں—اس کی طرح ضرورت مند۔حالات کی ماری—مجبور اور بے بس—تب اسے پتہ چلا کہ تنہا وہی ضرورت مند نہیں ہے—

پھر وہ ٹائپ اور شارٹ ہینڈ بھی سیکھنے لگی—کم از کم چھ ماہ میں وہ اس کی مہارت حاصل کر سکتی تھی—

حسبِ معمول ایک دن وہ انگریزی روز نامہ میں ضرورت کے اشتہار دیکھ رہی تھی—ایک پرائیوٹ کمپنی کے لئے پرسنل اسسٹنٹ کا اشتہار دیکھ کر اس نے بھی—درخواست بھیج دی—انٹرویو ہوا—اس نے نڈر ہو کر جواب دیئے یہ تو طے تھا کہ جگہ اسے نہیں ملے گی—پھر خواہ مخواہ خوفزدہ ہونے سے کیا فائدہ؟ لیکن اس بار وہ سلیکٹ کر لی گئی—اور اس نے کام شروع کر دیا—ویسے تو وہ جی۔ایم شاہ کی پرسنل اسٹنٹ تھی۔لیکن جب مسٹر شاہ نہ آتے تو اسے مسٹر کھرانہ سے احکامات لینا ہوتے—اور مسٹر کھرانہ اسے ایک آنکھ نہ بھاتے—

مسٹر کھرانہ—مسٹر شاہ کی ضِد تھے—پھولا—پھولا چہرہ—باہر کو اُبلی ہوئی لال—لال آنکھیں—سوجے ہوئے پپوٹے—کثرتِ سگریٹ نوشی سے ہونٹ سیاہ۔اور اس نے سنا تھا کہ وہ پیتے بھی ہیں۔سچ تو یہ تھا کہ اسے ان کے کیبن میں جاتے ہوئے بھی خوف آتا تھا۔وہ کہتے ''بیٹھئے''—لیکن وہ کھڑی رہتی وہ اتنی عجلت میں ان کے کمرے سے باہر نکلتی جیسے اندیشہ ہو کہ ابھی مسٹر کھرانہ اٹھ کر اس کو پکڑ لیں گے۔ذرا ان کی کرسی ہلتی—اور وہ بدک جاتی۔پتہ نہیں مسٹر کھرانہ نے اس کی یہ حرکتیں نوٹ کی تھیں یا نہیں''۔

ایک آدھ بار یہ بھی ہوا کہ وہ بس کے انتظار میں کھڑی ہوتی اور مسٹر کھرانہ اس کے نزدیک آکر کار روک دیتے پھر بڑے اخلاق سے کہتے—

''میں آپ کو ڈراپ کردوں مس نیتا؟—''

''اوہ نو سر— میری بس آتی ہوگی''—

—اور مسٹر کھرانہ اپنی مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ دفع ہو جاتے— تو وہ اطمینان کی سانس لیتی— اس نے اکثر نوٹ کیا تھا کہ مسٹر کھرانہ دیر تک آفس میں بیٹھے رہتے ہیں شاید اس کے انتظار میں وہ ایسا کرتے تھے— جب وہ بس اسٹاپ پر سڑ رہی ہوتی تھی تو وہ اُدبدا کر باہر آجاتے— کہ شاید وہ ان کی نئی ماروتی کار میں بیٹھنے کی لالچ میں لفٹ لے لے— لیکن نیتا نے کبھی ہاں نہیں کی— وہ تو آفس میں بھی بے حد ریزرو رہتی تھی— ویسے مسٹر شاہ نے بھی اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ بس اپنے کام سے کام رکھے— اور کسی کو فری ہونے کا موقع نہ دے۔ شروع میں تو آفس کے کئی لوگوں نے اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ مسٹر مجمدار روز لباس بدل کر آنے لگے— ہیڈ کلرک نے اپنے چشمے کا دس سال پرانا فریم بدل ڈالا— دفتر کے بابوؤں میں سوٹ اور ٹائیوں کا مقابلہ شروع ہو گیا تھا— سینٹ اور آفٹر شیو لوشن کے ساتھ کریموں کا سارا اسٹاک پہلے ہفتے میں خرچ کر ڈالا گیا۔ اسے چائے اور کافی آفر کی گئی— فلم کے ٹکٹ خریدے گئے— لیکن اس کے سرد رویئے نے سب کے ارمانوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ کچھ دن کے بعد سب اسی بے ڈھنگے پن سے آنے لگے—

پورے آفس میں وہ بس مسٹر شاہ سے کھل کر بات کرتی تھی۔ عمر میں بڑے ہونے کے باوجود وہ اس سے بڑی عزت سے پیش آتے تھے—

'نیتا جی! وہ فائل کمپلیٹ ہو گئی—؟—

''نیتا جی! بس باقی کا کام کل دیکھئے گا— تھک گئیں تو بیمار پڑ جائیں گی''—

اگر کہیں باہر نہ جاتے تو لنچ کے ٹائم اسے بھی بلا لیتے— اور وہ بھی تکلف نہیں کرتی تھی— ایک بار وہ بیمار ہوئی اور بھائی چھٹی کی درخواست لے کر گیا تو وہ اس کے ساتھ ہی گھر آگئے۔ اپنے فیملی ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا— اور جب اس نے ڈاکٹر کی فیس اور

دواؤں کے پیسے دینا چاہے تو اداس ہو گئے—

''آپ ہمیں غیر سمجھتی ہیں نیتا جی!؟''—

''نہیں سر— مجھے معاف کر دیجئے''—

اسے محسوس ہوا کہ اس نے انجانے میں انہیں گہرا دُکھ پہنچایا ہے— یقیناً ان کے خلوص کی کوئی قیمت نہیں تھی— ان کی مہربانی اور شفقت میں اس نے اپنے پاپا کی شفقت پائی تھی۔ ایک بار اس کے منہ سے باتوں باتوں میں نکل گیا کہ اگلے روز اس کی برتھ ڈے ہے۔ تو دوسرے دن وہ کیک اور تحائف سے لدے گھر آ گئے۔ اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا برتھ ڈے سیلیبریٹ کرنے کا— لیکن مسٹر شاہ نہیں مانے— پھر گھر والوں نے بھی پارٹی کا اہتمام کر ڈالا اکثر پاپا بھی اسی طرح سرپرائز دیا کرتے تھے۔ جس روز مسٹر شاہ آفس نہ آتے تو اسے دن میں دو تین بار مسٹر کھرانہ کے روم میں جانا پڑتا تھا— وہ سخت متوحش رہتی۔ اسے ان کی اُبلی ہوئی آنکھوں سے بے حد خوف آتا تھا— اگر اسے ان کے سامنے دیر تک رُکنا پڑتا— تو وہ دل ہی دل میں جلد رہائی ملنے کی دعائیں مانگا کرتی۔ کئی دفعہ اس کا جی چاہا کہ وہ مسٹر شاہ سے مسٹر کھرانہ کی شکایت کر دے— لیکن کیا کہتی—؟— انہوں نے تو اس سے ایک بار بھی کوئی ناشائستہ لفظ نہیں کہا تھا— لیکن وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ یہ جو اوپر سے بے حد مہذّب اور شریف بننے کی ایکٹنگ کرتا ہے۔ دراصل سخت کمینہ اور بدمعاش ہے۔ اور اب تک نہ جانے کتنی لڑکیوں سے فلرٹ کر چکا ہوگا— نہ جانے کس کس کی عزّت—'' اور اسے تو یہ سوچ کر ہی جھرجھری آجاتی تھی— اکثر وہ مسٹر شاہ کا موازنہ مسٹر کھرانہ سے کرتی تو خود پر نفرین کرنے لگتی کہ بھلا ان کا کیا مقابلہ—؟ ایک سرتاپہ شرافت دوسرا— سرتاپہ غلاظت— اور اس روز تو وہ مسٹر کھرانہ سے اور بھی چڑ گئی— جب انہوں نے ایک فائل اس کے سامنے رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا— ''مِس آپ اپنے کام میں لاپرواہ ہوتی جا رہی ہیں اسے ایک ہفتے سے پینڈنگ میں ڈال رکھا ہے کل اسے ضرور پورا کر دیجئے''—

''ہُنہہ— کیسے رعب جھاڑتا ہے— ابھی اس کے ساتھ لنچ کرنے لگوں— گاڑی میں لفٹ لینے لگوں— تو کبھی پلٹ کر نہ پوچھے گا کہ تم نے کیا کام کیا—؟''

اب تک تو وہ محض اس کی شکایت کرنے کے بارے میں سوچ کر رہ جاتی تھی—
اب اس نے تہیہ کرلیا کہ جس روز بھی موقع ملا— بچّو کی شکایت ضرور کروں گی—
مارچ کا مہینہ تھا۔ اور کام کا بوجھ زیادہ تھا— اکثر مسٹر شاہ آفس ٹائم کے بعد بھی رکتے تھے— اس لئے اسے بھی رکنا پڑتا تھا— واپسی میں وہ اسے کمپنی کی گاڑی سے گھر پہنچوا دیتے تھے— جس روز سے مسٹر شاہ نے رکنا شروع کیا تھا۔ کھرانہ بھی خاصی دیر تک آفس میں بیٹھا رہتا تھا— اسے سخت الجھن ہوتی تھی— آج بھی لنچ ٹائم میں مسٹر شاہ نے اس سے رکنے کے لئے کہا تھا— وہ اپنے کیبن میں بیٹھی ہوئی کام کرتے کرتے نظر اٹھا کر مسٹر کھرانہ کے آفس پر بھی نظر ڈال لیتی تھی۔ پھر اس نے کھرانہ کو باہر جاتے دیکھا تو سکھ کی سانس لی— اسی وقت مسٹر شاہ نے 'انٹر کوم' پر اسے مخاطب کیا—

''نمیتا— ذرا چندرا انٹر پرائیز ز اور سوہن اینڈ کمپنی کی فائلیں لے کر آؤ''—

''یس سر ابھی لاتی ہوں''—

اس نے مستعدی سے کہا— اور فائلیں لے کر ان کے آفس میں چلی گئی۔ مسٹر شاہ آفس ٹیبل کے بجائے صوفہ پر نیم دراز تھے— چھوٹی میز پر ایک گلاس اور بوتل رکھی تھی— اس نے توجہ دیئے بغیر فائلیں تپائی پر رکھ دیں—

''سر! یہ فائلیں ہیں''—

''اوہ! اچھا۔ اچھا۔ آؤ بیٹھو بھئی۔ بڑی تھکن محسوس ہو رہی ہے—''—

نمیتا صوفہ کے دوسرے سرے پر ٹِک گئی— ان کی مہربانیوں کے باوجود وہ اس بات کا لحاظ رکھتی تھی کہ وہ اس کے باس ہیں— لیکن مسٹر شاہ نے اس کا ہاتھ تھام کر قریب کرلیا—

''تم تو بے حد تکلف کرتی ہو نمیتا۔ آرام سے بیٹھو''—

''جی سر— میں بہت آرام سے بیٹھی ہوں''—

وہ ذرا جھجکی— پھر بڑے اعتماد سے پرے کھسک کر بیٹھ گئی— مسٹر شاہ نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا— دو تین گھونٹ پینے کے بعد وہ فائلیں دیکھنے لگے— اور

ساتھ ہی قلم سے ایک آدھ جگہ نشان بھی لگاتے گئے—

''نمیتا— تم بہت محنت سے کام کرتی ہو— اگلے ماہ سے تمہاری تنخواہ میں اضافہ کردوں گا''—

''تھینک یو سو مچ''—

''تم چاہو تو پانچ سو روپے اس کے علاوہ بھی مل سکتے ہیں— لیکن اس کے لیے تم کو مجھ سے ایک معاہدہ کرنا ہوگا—''

''کیسا معاہدہ سر''؟—

''ایک گھنٹہ آفس کے بعد میرے ساتھ رہنا ہوگا''—

''وہ تو میں اب بھی رہتی ہوں۔ کام زیادہ ہو تو کسی معاہدے کی ضرورت نہیں ہے سر''—

''لیکن یہ معاہدہ خاص میرے لیے ہوگا نمیتا—''

مسٹر شاہ نے اس کی کمر میں بازو ڈال کر اسے اپنے قریب کھینچ لیا— نمیتا نے پہلی بار ان کی مہربان اور شفیق آنکھوں میں وحشت اور جنون کو رقص کرتے دیکھا— تو وہ ان کی گرفت سے نکلنے کے لیے تڑپی— لیکن تڑپ کر رہ گئی اب اسے ان کی نیت کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا— اس نے سخت لہجہ میں کہا—

''سر مجھے چھوڑ دیجئے''—

''نمی جان! ایک بار جو میری گرفت میں آجائے اسے چھوڑنا میرا اصول نہیں ہے۔ تم کو پیسوں کی ضرورت ہے۔ اور مجھے تمہاری''—

ان کے منہ سے شراب کے بھپکے نکل رہے تھے— اُف اس نے ان کے متعلق کیا سوچا تھا— اور وہ کیا نکلے؟— غصّے سے اس کا بُرا حال ہوگیا—

''آپ مجھے چھوڑ دیجئے— ورنہ میں شور مچادوں گی''

''کوئی نہیں ہے— ضد نہ کرو نمی میں تمہیں مالا مال کردوں گا—'' اور پتہ نہیں کس امید میں وہ چیخ پڑی—

''کھرانہ صاحب مجھے بچایئے— کھرانہ صاحب—''—

''کھرانہ کو میں جانے کے لیے کہہ چکا ہوں''

——اور اسی وقت دروازہ کھلا— مسٹر کھرانہ اندر آ گئے اچانک انہیں دیکھ کر مسٹر شاہ کی گرفت کمزور ہوئی—اور وہ تڑپ کر نکلی اور دوڑ کر مسٹر کھرانہ سے لپٹ گئی۔اس کی ہچکیاں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں— مسٹر کھرانہ اسے سہارا دے کر باہر لائے—اپنی گاڑی میں بٹھایا—اور گاڑی اسٹارٹ کر دی—وہ روتی رہی لیکن مسٹر کھرانہ خاموشی سے گاڑی چلاتے رہے—بس انہوں نے اس سے گھر کا پتہ پوچھا تھا—جب گاڑی اس کے مکان کے سامنے رکی تو مارے شرم کے اس کی نظریں اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں—اس نے آہستہ سے کہا— ''مسٹر کھرانہ میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہ بھولوں گی''—

''احسان—''نہیں— نہیں—یہ تو میرا فرض تھا؟''—

''فرض؟''—

''ہاں یہ فرض ہی تو تھا— جو مجھے دوبارہ آفس میں لے گیا— آپ موجود تھیں اور مسٹر شاہ نے 'انٹر کوم' پر مجھے جانے کے لئے کہہ دیا تھا— میں باہر آیا تو مجھے خیال آیا کہ آپ تنہا ہیں۔اور شاہ ٹھیک آدمی نہیں ہے۔بس میں واپس آ گیا۔اور تب ہی آپ نے مجھے پکارا—''—

''کبھی کبھی انسان کیسا دھوکا کھا جاتا ہے— مسٹر کھرانہ — میں تو مسٹر شاہ کو فرشتہ سمجھتی تھی—''—

''—اور مجھے راکھشس ؟—

مسٹر کھرانہ خود ہی ہنس پڑے۔نیتا سے تو ہنسا بھی نہیں گیا۔وہ پھر رونے لگی—

''دیکھو اب رونے دھونے میں میرا انعام مت گول کر جانا''—

اس نے ان کی آنکھوں میں پہلی بار دیکھا— کیسی معصومیت تھی ان آنکھوں میں—اس نے بڑے اعتماد سے کہا—

''آپ حکم دیجئے''

''واقعی — سچ مچ — دل سے کہہ رہی ہو''؟ —

''جی ہاں — کیا میرے اوپر بھروسہ نہیں ہے؟''

''پورا بھروسہ ہے۔ اگلے ہفتے رکشا بندھن ہے۔ بس ایک پیاری سی راکھی باندھ دینا — '' —

''اوہ — ضرور — آج پتہ چلا کہ ممّی کو میرے پیدا ہونے سے کیوں شکایت تھی — بڑا بھائی ہوتا تو وہ خود ہی سارے پریوار کو سنبھالتا — '' —

''ٹھیک کہتی تھیں ممّی — اب تم اپنی ساری ذمّے داری اس کو سونپ دو'' —

''کس کو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا —

''اس کو جو تمہارا خواستگار ہے'' —

''کیا آپ کپل کو جانتے ہیں؟'' — وہ گھبرا کر کہہ گئی —

مسٹر کھرانہ ہنس پڑے — اور تب وہ سمجھی کہ کھرانہ نے تو اندھیرے میں تیر مارا تھا جو نشانے پر بیٹھا — اسے بڑی شرم آئی — اور وہ جلدی سے اُتر کر گھر کے اندر چلی گئی — مارے شرم کے وہ ان سے اندر آنے کے لیے بھی نہ کہہ سکی۔ کھرانہ گاڑی اسٹارٹ کر کے ہوا ہو گئے۔ ان کی اُبلی ہوئی سرخ آنکھوں کے ڈور سے اس وقت کچھ اور زیادہ سُرخ ہو رہے تھے — اور آنکھوں کے کٹورے لبالب بھرے ہوئے تھے — مگر ہونٹوں پر فرشتوں جیسی معصوم مسکراہٹ تھی۔

☆☆

قدآور بونے

سیٹھ نرمل کھتری کی چوک صرّافہ میں زیورات کی دوکان تھی — لاکھوں کا کاروبار تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں اپنی دولت کا خود بھی اندازہ نہ تھا — ان کے بزرگ لین دین کا کاروبار کرتے تھے — سُود کے پیسے میں اوپر والے نے اتنی برکت دی کہ حویلی کھڑی کرلی — حویلی بھی ایسی جس میں کئی آہنی سیف اور خفیہ خانوں والی الماریاں، گردی رکھے گئے زیورات سے اٹا اَٹ بھری ہوئی تھیں۔ اور دادا پردادا کے وقتوں کی یہ حویلی بھی کسی مضبوط قلعہ سے کم نہیں تھی۔ حویلی بہت شاندار تھی۔ اس کا چھ برجیوں والا پھاٹک اتنا اونچا تھا کہ ہاتھی مع ہودے کے گزر جائے۔ برجیوں پر چڑھے ہوئے پیتل کے پتّر دھوپ میں سونے کی طرح جھل جھل کرتے تھے — اور برقی روشنی میں دور سے لشکارہ مارتے تھے — سیٹھ صاحب کو اپنی آبائی حویلی پر بہت ناز تھا — آس پاس تو کیا دور دور تک ان کی حویلی کی ٹکّر کا کوئی دوسرا مکان نہیں تھا — لیکن ان کے بچّوں کو اس حویلی سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا — وہ نئی روشنی اور نئے زمانے کے بچّے تھے — جن کی نظر میں کار کوٹھی اور اونچے اسٹیٹس کی زیادہ اہمیت تھی — جس رفتار سے آبادی میں اضافہ ہو رہا تھا — اسی تیزی سے گلیاں اور سڑکیں سکڑتی جا رہی تھیں — مکان اونچے اور دل تنگ ہوتے جا رہے تھے — حویلی کی ساری شان و شوکت اِرد گرد کی بُلند عمارتوں کے پیچھے چھپ گئی تھی — اور گلی اتنی پتلی ہو گئی تھی کہ حویلی کے پھاٹک تک کار جانے میں بھی خاصا وقت لگ جاتا تھا۔ سیٹھ صاحب کو تو اب بھی کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ اپنی حویلی سے نکلتے اور گلیوں، گلیوں ہوتے ہوئے۔ کیچڑ پانی

سے بچتے ہوئے رام، رام کہتے مزے سے اپنی دوکان پر پہنچ جاتے جسے انہوں نے 'شوروم' کا نام دے دیا تھا۔ لیکن ان کے بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھ رہے تھے — اور ان تنگ اور گندی گلیوں سے گزرتے ہوئے انہیں سخت کوفت ہوتی تھی۔ جس کو دیکھو بان کی کھٹیا ڈالے بیچ گلی میں پڑا مزے سے خراٹے لے رہا ہے پھر وہیں گلی کے نل پر سب لوگ نہاتے دھوتے بھی تھے — ہر وقت کیچڑ پانی اُبلتا رہتا تھا۔ صبح و شام چولہوں کا دھواں کثیف بادل کی طرح سروں پر چھایا رہتا۔ وہ تو اپنے دوستوں کو حویلی میں بلاتے ہوئے بھی شرماتے تھے۔ کہاں صاف ستھرے علاقوں میں بنے ہوئے بنگلے اور کوٹھیاں۔ روشن اور کشادہ سڑکیں اور کہاں اندھی گلی کے آخری سرے پر بنی ہوئی یہ پرانی حویلی۔ اوپر سے گندگی اتنی کہ ہر سانس کے ساتھ منوں جراثیم پھیپھڑوں میں سما جائیں۔ بچّوں نے دن رات سیٹھ صاحب کا پیچھا لے لیا۔ کہ کسی اچھے اور صاف ستھرے علاقے میں نئی کوٹھی بنوائیں — انہیں اس سے مطلب نہیں تھا کہ زمین سونے کے بھاؤ بک رہی ہے — یا بالو چاندی سے زیادہ مہنگی ہے —

شہر کے فیشن ایبل علاقے میں تو زمین پر ہاتھ رکھنا مشکل تھا۔ قیمتیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ ڈھائی تین سو مربع فٹ کے حساب سے زمین کی قیمت کا تخمینہ لگاتے ہوئے سیٹھ صاحب کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا — اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ البتہ شہر سے ذرا باہر زمین کا بھاؤ کچھ نرم تھا — حالانکہ اس ویرانے کو دیکھتے ہوئے وہ بھی زیادہ تھا۔ لیکن پراپرٹی ڈیلر نے اطمینان دلایا تھا کہ سال دو برس میں آبادی مزید بڑھے گی۔ تو یہاں جنگل میں منگل کا مزہ ملے گا۔ اس کی بات کچھ غلط بھی نہیں تھی۔ اس ویرانے میں بھی اکا دکا کوٹھیاں اور عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ سیٹھ صاحب کو یہ جگہ پسند آ گئی — انہیں اگر کچھ شکایت تھی تو بس یہی کہ سڑک کے دوسری طرف کھلے میدان میں کچی جھونپڑیوں کا ایک پورا شہر آباد تھا — یہ تو آسمان سے ٹپکے اور کھجور میں اٹکے والی بات تھی۔ جن گندے لوگوں اور گندگی سے بھاگ کر وہ یہاں آ رہے تھے — وہ اب قدموں تلے نہ سہی۔ نظروں کے سامنے موجود تھی ہر طرف کوڑے کے ڈھیر پھٹے پرانے۔ میلے کچیلے۔ چیتھڑوں کی بساندھ،

جانوروں کے موت کی کھر اند بجبجاتی ہوئی نالیاں — اور، کل بل کرتے کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ بچے — اور خارش زدہ کتے — فرّاٹے سے گالیاں بکتی ہوئی نیم عریاں عورتیں — تاڑی ٹھرّا پی کر بیوی بچوں کی ٹھکائی کرتے ہوئے مرد — اور یہ سارا ماحول ایسا تھا کہ سیٹھ صاحب کو اُبکائی آ گئی — پراپرٹی ڈیلر بھی ایک ہی کائیاں تھا — اس نے فوراً کاروباری داؤں آزمایا — اور کہنے لگا — ''سیٹھ صاحب آپ اس بستی پر نہ جائیں — یہ آج نہیں تو کل خالی ہو جائے گی۔ ایل ڈی اے نے زمین، ایکوائیر' کر لی ہے۔ بہت جلد یہاں پر نئے طرز کی کالونی بن جائے گی — اور کالونی کے ساتھ ہی پارک — شاپنگ سینٹر — اسپتال اور بینک وغیرہ بھی کھل جائیں گے۔ سارا پلان تیار ہے۔ بس کچھ ہی دنوں کی بات ہے''

بات سمجھ میں آنے والی تھی — اس لئے سیٹھ صاحب مان گئے — اور زمین خرید کر نقشہ وغیرہ پاس کرا لیا۔ جب تک ان کی کوٹھی بن کر تیار ہوئی آس پاس کی عمارتیں آباد ہو چکی تھیں — اور ان کے مکین سب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذّب لوگ تھے۔ اور سب کا تعلق اونچے طبقے سے تھا — ان کے گیٹ پر چوکیدار اور گیٹ کے اندر اعلیٰ نسل کے کتے پلے ہوئے تھے۔ گود کے بچے تک گٹ پٹ کرتے تھے۔ ان کی آیائیں بھی'' بابا۔ بے بی گم اور گو کی حد تک انگریزی داں تھیں — ان کی ماروتی کاریں تک انگلش میں 'زوں۔ زوں' کرتی گزرتی تھیں۔ یعنی سب بڑے لوگ تھے۔ دوسرے لفظوں میں خالص صاحب تھے —

سیٹھ صاحب سے زیادہ ان کی سیٹھانی جی یہاں آ کر خوش تھیں۔ اور ایک ہی زقند میں وہ سیٹھانی سے مسز کھتری بن گئی تھیں۔ بچے بھی ساتھ والوں سے کھل کر انگریزی میں بات چیت کرتے تھے — تاکہ گلیوں کی بُو باس والی زندگی کو جلد سے جلد بھول جائیں۔ انہیں تو اب یہ سوچ کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ اب تک متوسط اور نچلے طبقے کے لوگوں کے بیچ کیسے رہتے تھے — اور بالکل — 'نان سینس' ٹائپ کی زندگی جیتے تھے — سیٹھ صاحب کو اگر یہاں کوئی فکر تھی تو بس سامنے والی بستی کی تھی جو کینسر کے بھیانک پھوڑے کی طرح ان

کی نظروں کے سامنے زمین کی چھاتی پر بدستور پھیل رہی تھی۔ وہ کئی بار پڑوس میں رہنے والے ڈاکٹروں۔ افسروں، اور تاجروں سے اس مسئلے پر بات چیت کر چکے تھے — ایل ڈی اے والے اب تک سو رہے تھے — ایک جان پہچان والے افسر سے مل کر انہوں نے اس کیس کی فائل نکلوائی۔ لیکن ہوا یہ کہ مطلوبہ فائل بابوؤں کے ہاتھوں میں گُلی ڈنڈا کھیلتی رہی — اور اصلی معاملہ جہاں کا تہاں رہا۔ فی الحال اس بستی کے خاتمے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ حالانکہ کوٹھی والوں کو بستی والوں سے آرام ہی آرام تھا — اندرونِ شہر نوکروں کا جتنا کال تھا — یہاں — تھوک کے حساب سے کام کرنے والے مل جاتے تھے۔ بستی کی عورتیں کوٹھیوں میں جھاڑو پوچا کرتی تھیں۔ کپڑے دھوتیں برتن صاف کرتیں — اور مرد بھی جی جان سے صاحب لوگوں کی خدمت میں لگے رہتے تھے — لیکن وہی مثل ہے کہ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں — اور سو بات کی ایک بات تو یہ تھی کہ نچلے طبقے کے لوگوں سے نفرت کرنا ان کا حق تھا۔ سو وہ بھی حق پر تھے — اور جی بھر کے ان سے نفرت کرتے تھے — کسی صاحب کی کوٹھی میں چھوٹی موٹی چوری ہو جاتی تو شک ان غریبوں پر ہی جاتا۔ آئے دن تھانے کے سپاہی ڈنڈے بجاتے اور گالیاں بکتے بستی میں پہنچ جاتے — کبھی کسی آیا — بیرہ، خانساماں یا مالی سے پوچھ گچھ نہ ہوتی — اور بستی کی وہ بھولی بھالی عورتیں جو ڈاکٹرنی کی چُغلی سیٹھانی سے۔ اور سیٹھانی کی چُغلی ماسٹرنی سے کر کے اپنی وفاداری کا ثبوت دیتی تھیں۔ سب سے پہلے پکڑی جاتی تھیں۔ رہے مرد تو وہ بے چارے بستی سے بھاگ کر اپنی جان بچاتے تھے۔ اگر نہ بھاگتے تو حوالات کی ہوا کھاتے —

سیٹھ صاحب کئی دن سے چوک صرّافہ نہیں گئے تھے۔ شوروم بند پڑا تھا — شہر کے کئی حلقوں میں کرفیو لگا ہوا تھا — یہی حال سرکاری افسروں، ڈاکٹروں اور تاجروں کا تھا۔ سارے بچے گھروں میں بندر ات دن اُدھم مچاتے — اور کرفیو کو دعائیں دیتے جس کی وجہ سے اسکول اور کالج سب بند تھے۔ فرقہ وارانہ فساد کی وجہ سے زندگی مفلوج ہو گئی تھی — بات کوئی خاص نہیں تھی — بس ایک پٹاخہ فساد کا سبب بن گیا تھا — ایک فرقے کا جلوس نکل رہا تھا — دوسرے فرقے کے بچے نے ترنگ میں آ کر پٹاخہ چھڑا دیا۔ اور دیکھتے ہی

دیکھتے اینٹیں۔ پتھر اور بوتلیں چلنے لگیں اور بات گولیوں سے بموں تک پہنچ گئی۔ پٹاخہ تو محض ایک بہانہ تھا۔ نفرت کا لاوا تو مہینوں سے اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ جسے باہر نکلنے کے لئے ایسے ہی کسی بہانے کی تلاش تھی۔ ایک بچّے کی معصوم شرارت نے شر پسندوں کو موقع فراہم کر دیا— اور فساد نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا— اب حال یہ تھا کہ دوست— دوست پر شک کر رہا تھا— پڑوسی— پڑوسی سے خار کھانے لگا تھا— بھائی چارہ، پیار اور اعتماد یہ سارے جذبے خاک و خون میں مل گئے تھے— آئے دن کسی نہ کسی محلّے میں خون کی ہولی کھیلی جاتی۔ آتش زنی— اور لُوٹ مار کی وارداتیں روز مرّہ کی بات ہو گئی تھیں— سب لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے— ایسے میں ان لوگوں کی بن آئی تھی جن کا کام فساد کی آڑ میں لوٹ مار کرنا تھا— رات کے اندھیرے میں یہ لوگ گھات لگا کر مالدار لوگوں کے گھروں پر اچانک دھاوا بول دیتے۔ آتش زنی فائرنگ اور نعروں کے ساتھ لوٹ مار کا بازار گرم ہو جاتا— دوسرے دن اخبار میں ایک نئی سُرخی لگ جاتی۔ ہر فرقہ دوسرے فرقے کو موردِ الزام ٹھہراتا۔ اور اس تیسرے فرقے کا سراغ کسی کو نہ ملتا جو قومی یکجہتی کا بے مثل نمونہ تھا— جس میں انور کے ساتھ ہربنس اور گرمیت سنگھ بھی تھا— جیکب اور لال بھائی بھی تھا۔ اور جن کا مذہب ہی پیسہ تھا— صرف پیسہ— اور جن کی کمائی کا ذریعہ آئے دن ہونے والے فساد تھے— کوٹھی والوں کو سب سے زیادہ خطرہ ان بستی والوں ہی سے تھا—

سارے زمانے کے چوراچکّے اس بستی میں جمع تھے۔ وہ لوگ ایک دوسرے کو ان سے خبردار بھی کرتے رہتے تھے— اور دل ہی دل میں ان سے ڈرتے بھی تھے کہ نہ جانے کب ان کی نیت بدل جائے— اور وہ رات کے اندھیرے میں ان پر حملہ کر دیں۔

ان کا کیا بھروسہ تھا؟— پولیس تو ویسے بھی ان دنوں شہر کے گنجان علاقوں میں مصروف تھی۔ گنتی کی چند کوٹھیوں سے زیادہ انہیں پُر پیچ گلیوں اور گھنی آبادی والے محلّوں کی فکر تھی— جہاں آن کی آن میں پچاسوں گھر فساد کی لپیٹ میں آجاتے تھے— پھر یہ بھی تھا کہ بڑے لوگوں کے پاس— لائسنسی ہتھیار تھے— سو وہ اپنی حفاظت آپ کر سکتے تھے—

اوران بڑے لوگوں کا یہ حال تھا کہ اپنی کوٹھیوں کے اندر خوف سے دُبکے ہوئے تھے۔فون کی لائینیں بیکار ہو چکی تھیں— کئی دن سے بجلی بھی فیل تھی— گورکھا چوکیدار اپنی جانیں لے کر بھاگ گئے تھے—لوہے کے بڑے بڑے گیٹ مقفل تھے—اوران کے الیشین اور بُلڈ اگ ایسے حالات میں مالکوں کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے بلوائیوں کے پاس تو تخریب کاری کے ایسے ایسے ساز و سامان موجود تھے جو لمحوں میں عمارتوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتے تھے۔اور فولاد کو پگھلا کر پانی کر دیتے تھے۔سکون کی تلاش میں شہر سے دور رہنے والے یہ صاحب لوگ، اس وقت کو کوس رہے تھے۔جب انہوں نے یہاں گھر بنایا تھا— خوف و ہراس انہیں پل پل مار رہا تھا—

اس رات بلوائیوں کا ایک جتھا ان کوٹھیوں کی طرف ابھی آنکلا۔یہاں سے انہیں ڈھیروں مال ملنے کی امید تھی۔یہ بڑے لوگ کالا دھن اپنے باتھ رومز— اور بیڈ رومز کے خفیہ ٹھکانوں میں چھپانے کے لئے کافی 'نیک نام تھے— ڈھیر ساری دولت ہاتھ آنے کی خوشی میں ان بلوائیوں نے اس بستی کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔جہاں کیڑوں مکوڑوں سے زیادہ حقیر مخلوق آباد تھی۔جس وقت حملہ ہوا کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہنے والے۔مغرور— تند مزاج اپنی دولت اور عہدے کے نشے میں چور رہنے والے صاحب سیٹھ اور رئیس بند کمروں میں سکوے سہمے— تھر تھر— کانپ رہے تھے—ان کی میم صاحبیں—اور بابا لوگ کونوں کھدروں میں پناہ گزین تھے— اور باہر— گندی بستی کی حقیر مخلوق— اپنی جان پر کھیل کر بلوائیوں سے برسرِ پیکار تھی— اچانک— سینکڑوں ننگے بھوکے لوگوں کا سیلاب اُمڈا تو بلوائی بھاگ کھڑے ہوئے۔بستی والوں نے انہیں میلوں تک کھدیڑ دیا— اور پھر یہ سارے مُفلس، قلاش اور نیم عریاں لوگ کوٹھیوں اور بنگلوں کے چاروں طرف پھیل گئے— بستی کا چودھری غلام رسول سب کو ہدایت دے رہا تھا کہ پہرے پر کتنے لوگ رہیں گے۔اور گنگو دادا جسے سرکاری افسر صاحب نے چوری کے الزام میں حوالات کی ہوا کھلوائی تھی— بستی کے لڑکوں کو للکار رہا تھا۔

"کوئی سالا اینگھے آجادے تو مار مار کے اُو کے بھُس بھر دینا"

صبح ایک ایک کر کے کوٹھیوں کے دروازے اور کھڑکیاں کھلتی گئیں — زرد چہروں والے مرد اور عورتیں باہر نکلیں — سب کی آنکھوں میں ممنونیت — اور احسان مندی کے آنسو تھے — آج صاحب لوگوں کو یہ حقیر لوگ بہت اونچے — بہت عظیم نظر آ رہے تھے — اور ان کے مقابلے میں اپنے قد بہت چھوٹے معلوم ہو رہے تھے —

☆☆

بچ

بچ! معلوم ہوتا تھا کہ یہ لفظ جمی ہی کے لئے بنا ہے۔ شروع شروع میں تو سب نے دبی زبان میں اسے بچ کہا۔ رفتہ رفتہ سب لوگ کھلّم کھلا کہنے لگے۔ اور پھر تو یہ بات جمی کو بھی پتہ چل گئی کہ سب لوگ اسے گندے گھناؤنے اور غلیظ نام سے پکارتے ہیں۔ بگڑنے یا روٹھنے کے بجائے وہ ہنس پڑی۔ اس کی کھِلکھِلاہٹ بے ساختہ تھی—

"ہا— بے چارے"

اس نے گالیاں دینے والوں سے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا— اور اپنے تراشیدہ بالوں کو ہاتھ سے برابر کر کے لاپرواہی سے سگریٹ کے کش لینے لگی۔

"ایسی لڑکی جو حد سے زیادہ آزاد خیال ہو"—

"جس کے بے گنتی و بے حساب بوائے فرینڈز ہوں"

"جس کی ہر شام کلب میں گزرتی ہو"—

"سگریٹ اور شراب جس کی زندگی ہو"—

"جو مردوں سے شرمانے اور دور رہنے کے بجائے ان سے حد سے زیادہ فری ہو۔ اور ان کے کاندھے سے کاندھا بھڑا کر بیٹھتی ہو۔ ان کے ساتھ مل کر قہقہے لگاتی ہو"—

"بیویوں کی موجودگی میں ان کے شوہر سے فلرٹ کرتی ہو" ایسی زنا ٹے دار لڑکی کو بچ نہ کہیں گے تو اور کیا کہیں گے؟"

پہلے دن وہ البرٹ کے ساتھ کلب آئی تھی۔ کولھوں پر منڈھی ہوئی جینز — اور

چپکی ہوئی شرٹ پہنے وہ بالکل 'ہوش' لگ رہی تھی — سب کے درمیان بیٹھی ہوئی وہ بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔ ہنس رہی تھی۔ اور چھوٹے — چھوٹے قہقہے لگا رہی تھی — اور وہسکی کے گھونٹ اور سگریٹ کے کش ایک تواتر سے لے رہی تھی —

بیگم سلمان، بیگم جواد، مسز چھابا — رینو بیر، روز لین اور مسز کرمانی وغیرہ اس کی اداؤں کو دیکھ کر کھول رہی تھیں۔ وہ کتنے عرصے سے اس کلب کی ممبر تھیں۔ ڈھیروں سُرخی پوڈر تھوپے — مسکارا لگائے۔ سینٹ کی شیشیاں انڈیلے۔ قیمتی ساڑیوں میں لپٹی — اور جگمگاتے ہوئے زیورات سے سجی، لمبی لمبی کاروں میں کلب آتی تھیں اور ہر موقع پر جی کھول کر چندہ دیتی تھیں —— ابھی تک کسی مرد کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھیں اور ان کے سامنے ایک بالکل 'ہونق' سی لڑکی جس کو اپنے سر، پیر تک کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ جسے قاعدے کے لباس سے چڑ تھی — ڈھنگ سے بال سنوارنے اور میک اَپ کرنے سے اِلرجی ہوتی تھی۔ یوں پلک جھپکتے۔ کلب کے اسمارٹ اور ہینڈسم اور ہیرو ٹائپ کے مردوں میں مقبول ہو گئی تھی — اور انہیں یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑا تھا کہ یا تو وہ محض جھک مارتی رہی ہیں — یا جمی ہی کم بخت ایک نمبر کی حرافہ ہے۔ ورنہ یہ الٹی گنگا کیوں بہتی؟ —

اس میں مردوں کا زیادہ قصور نہیں تھا — اب ایسی بچھ بچھ جانے والی لڑکی سے کون بے وقوف فائدہ نہ اٹھانا چاہے گا — ؟''

جمی اس وقت ریاض کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی —

'بچ' — بیگم جواد نے انہیں دیکھ کر نفرت سے ہونٹ سکوڑے — اس 'مردود' ریاض پر انہوں نے تحفوں کی بارش کر دی تھی کناڈا سے بھیجے ہوئے مسٹر جواد کے قیمتی سینٹ، ہیئر اسپرے، کیمرہ، ٹائی پن، اور اَلَم غلَم ڈھیروں سامان انہوں نے اس چھوکرے کی نذر کر دیا تھا — کیسا ان کے آگے پیچھے گھومتا تھا — اور اب دیکھو تو ایسا کترا کر نکل جاتا ہے۔ جیسے چھو گیا تو اسے کوڑھ ہی تو لگ جائے گا —

جمی تھک کر ایک میز پر بیٹھ گئی — ریاض نے اپنے لائیٹر سے اس کے ہونٹوں

میں دبا ہوا سگریٹ سُلگایا— لائیٹر کے شعلے میں جمی کا چہرہ کچھ اور روشن روشن اور دمکتا ہوا نظر آ رہا تھا— ایسا پرکشش کہ بیشتر لوگوں کی نظریں اس پر مرکوز ہو گئیں— وہ ان سب سے لاپرواہ سگریٹ کے کش لے رہی تھی—

"کہیے مس جمی— تھکن اتارنے کا انتظام کیا جائے—؟"—

انل نے اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا—

"اوہ— شیور"—

جمی نے مسکرا کر کہا— انل نے وہسکی کا آڈر دیا— اور اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا— ریاض بھی ان کی باتوں میں حصہ لے رہا تھا۔ وہسکی کے جام چڑھا کر وہ بالکل تازہ دم تھی۔ اگلے راؤنڈ میں وہ انل کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی شاید وہسکی کا احسان اتار رہی تھی— کلب سے واپسی میں مسز ترسیم نے اسے ڈراپ کرنے کی پیش کش کی جسے اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا— اور ان کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ کر ہوا ہو گئی۔

جمی— یعنی جمال آرا— ایک پرائیویٹ فرم میں کام کرتی تھی— معقول تنخواہ— بڑھیا سا فلیٹ، آزادی اور خود مختاری کی زندگی— ان سب نے اسے اونچی سوسائٹی میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا— یہ اور بات ہے کہ وہ جنسِ مخالف میں جتنی مقبول تھی— اتنی ہی صنفِ نازک میں بدنام تھی۔ ان کا بس چلتا تو وہ اس کی بوٹیاں کاٹ کر کتوں کو کھلا دیتیں۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ اپنے نیک خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں خود ان کے شوہر مانع تھے۔ وہ ہر شام کلب آتی۔ اور آدھی رات تک ان کے سینوں پر مونگ دلتی رہتی— پھر کسی نہ کسی کے ساتھ چل دیتی— عام طور سے سب کا خیال یہی تھا کہ کار کا ساتھی ہی اس کی رات کا بھی ساتھی بنتا ہوگا— لیکن یہ صرف خیال ہی تھا— ابھی تک کسی نے اس بات کی تصدیق نہیں کی تھی— سارے مرد ایک نمبر کے گھنے تھے— کیا مجال جو ایک لفظ جمی کے خلاف پھوٹتے ہوں— سب اپنے اپنے دل کا حال چھپا ڈالتے تھے— صنف نازک تو بغیر کہے ہی ہر بات سمجھ لیتی تھی—

جمی جس فرم میں کام کرتی تھی— اس کی اسٹینو مسز اگبرٹ چند روز بیمار رہ کر

مرگئیں — مسٹر اگبرٹ پہلے ہی مر چکے تھے — اور اپنے اکلوتے بیٹے مونٹی کا وہی ایک سہارا تھیں — اور ماں باپ دونوں کے فرائض پورے کرتی تھیں۔ ان کی موت کے بعد مونٹی بالکل اکیلا رہ گیا۔ جس وقت شیشوں والی گاڑی (Hearse) میں ایک خوب صورت سے تابوت میں رکھکر مسز اگربٹ کا جنازہ گھر سے رخصت ہوا — مونٹی آیا کی انگلی تھامے سہما سہما کھڑا تھا — ایک ایک کر کے سارے لوگ چلے گئے۔ بس جمی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے یہ دلدوز منظر دیکھ رہی تھی — اور جب برداشت نہ ہوا تو اس نے مونٹی کو لپٹا لیا —

"بیٹے — میں تمہارے پاس رہوں گی — ہمیشہ ہمیشہ کے لئے — تم میرے بیٹے ہو — میرے لال ہو" —

جمی — مونٹی کو پیار کرتی رہی — روتی رہی — تڑپتی رہی — اس رات وہ وہیں رہی — دوسرے دن وہ مونٹی اور آیا کو اپنے فلیٹ لے آئی — اب مونٹی اس کی ذمّے داری بن چکا تھا۔ مونٹی کا سارا کام وہ اپنے ہاتھ سے کرتی تھی۔ اسے آیا کے ساتھ اسکول بھیج کر تب آفس جاتی تھی۔ شام کو کلب جاتی تو سب کے اصرار کے باوجود نہ رکتی۔ جلد ہی گھر واپس آجاتی تھی — اس کے دوست تو مونٹی کے نام سے جلنے لگے تھے — یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ اچھی بھلی شام کا ستیاناس کرلیا جائے — وہ بھی پرائے بچّے کے لئے — عورتیں اس کی باتوں سے اور زیادہ نالاں تھیں۔

"ارے ایک نمبر کی چھنال ہے یہ جمی — مسز جواد نے فتویٰ دے ڈالا —

"یہ تو محض اگبرٹ کا مال تال ہضم کرنے کے لئے سارا ڈرامہ کھیل رہی ہے۔ دیکھ لینا چند روز کے بعد لونڈے کو دھتا بتائے گی"

"اونہہ — بچ" — آج تک خود تو لنڈوری گھومتی ہے۔ تیرے میرے مردوں سے عشق لڑاتی ہے۔ یہ خاک پرایا بچّہ پالے گی؟"

سریتا سانیال نے دل کی بھڑاس نکالی۔ اور پھر یہ ہوا کہ آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے پورے مسٹر ذوالفقار علی عرف ذلفی کو خدا جانے جمی کی کون سی ادا بھا گئی کہ وہ ایک دم اس سے شادی پر آمادہ ہو گئے۔ کلب کی حسین، خوبرد، اسمارٹ اور فیشن ایبل صاحبزادیوں کی

امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ سب کی سب اس کروڑ پتی شاہزادے کی آس لگائے بیٹھی تھیں اور اب تک نہ جانے کتنے ڈنر اور لنچ ان کے اعزاز میں دے چکی تھیں لیکن ہوا یہ کہ کم بخت جمی نے انہیں سمو چاہی ہتھیا لیا اور وہ اس کو شریکِ زندگی بنانے کے لئے مچل گئے۔

ان کی شادی میں روڑا ثابت ہوا مونٹی — ذلفی نے لاکھ لاکھ جمی کو سمجھایا — کہ وہ اسے کسی اچھے ہل اسٹیشن کے فرسٹ کلاس اسکول میں داخل کرا دیں گے — ہر مہینے وہ اسے جا کر دیکھ آیا کرے گی — اس کے کُل اخراجات وہ بخوشی برداشت کریں گے۔ لیکن جمی کی ایک ہی ضِد تھی کہ وہ مونٹی کو ایک پل کے لئے جدا نہیں کرے گی۔ خواہ یہ شادی ہو یا نہ ہو۔

کئی ہفتوں کی کشمکش کے بعد ذلفی نے ہتھیار ڈال دیئے "جمال آرا — تم جیتیں — ہم ہارے — تمہاری ہر شرط منظور ہے —"

— اور دونوں کی شادی ہوگئی اور کلب کی وہ حسینائیں جو اس کشاکش سے پھر پُر امید ہوگئی تھیں — ایک بار پھر شکست کھا گئیں —

اس رات کلب میں جمی اور ذلفی کی طرف سے دوستوں کو شاندار پارٹی دی گئی تھی۔ جمی سرخ چوڑے باڈر کی بنارسی ساڑی میں لپٹی — عام دنوں سے زیادہ — بلکہ کہیں زیادہ حسین اور باوقار لگ رہی تھی۔ ذلفی اس کا بازو تھامے — دوستوں کے درمیان گھوم رہے تھے — انہیں اس طرح دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ شاید ذلفی کو اب بھی یہ خوف تھا کہ اگر ایک پل کے لئے بھی جمی کا ہاتھ چھوڑا — تو وہ سدا کے لئے چھوٹ جائے گی — صنفِ نازک حسبِ دستور اور حسبِ معمول جل جل کر کباب ہو رہی تھی — اور ان کے شوہر اور محبوب آج بھی اس کے آگے اسی طرح بچھے جا رہے تھے۔ جیسے کہ شادی سے قبل بچھتے تھے۔

کلاک نے گیارہ بجائے تو جمی چونک پڑی۔ زلفی کے کان میں آہستہ سے سرگوشی کرتے ہوئے بولی —

"گھر چلئے ذلفی — مونٹی اکیلا ہوگا —"

"اوہ — آیا تو ہے جم" —

ذلفی ابھی جانا نہیں چاہتے تھے —

"لیکن وہ میرے بغیر سوئے گا نہیں ذلفی — پلیز بس اب چلئے" —

"اچھا — اچھا" —

ذلفی کھڑے ہو گئے۔ اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر دوستوں سے معذرت کرتے ہوئے کار کی سمت بڑھ گئے۔ پارٹی پورے شباب پر تھی —

"بچ" —

کسی نے آہستہ سے کہا — ان کی کار زَن سے نکلی چلی گئی — اور جیسے کلب کی رونقیں بھی ختم ہو گئیں —

بچ کے جاتے ہی —

☆☆☆

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

HUME JEENE DO

by

Masroor Jahan

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-5073-724-8

₹ 300.00